UNIVERSAL
LIBRARY
OU_222804
UNIVERSAL
LIBRARY

OSMANIA UNIVERSITY LIBRARY

Call No. ٨٩١٥٤٣٠٥ Accession No. ١١١٠١

Author

Title (٢) آزاد سوون - جواہر لعل نہرو

This book should be returned on or before the date last marked below.

پیشکش

اردو کے صرف چند ہی اخبارات کو اپنی جوبلی دیکھنا نصیب ہوئی ہے۔ صوبہ متحدہ کا سب سے پرانا اردو اخبار مغرز اودھ اخبار ہے جو اسوقت ستر سال کی ہے۔ اسکے بعد ہمصر آگرہ اخبار کا نمبر ہے جو ساٹھ سال سے شائع ہو رہا ہے۔ ہمارے مکرم دوست ایس ابن علی صاحب انیر اعظم ترین سال سے جاری ہے۔ ہندوستانی ۱۸۵۷ء میں قائم ہوا تھا اور اسوقت اسکی پینتالیسویں جلد نکل رہی ہے۔ پنجاب میں مغز ام وپیسہ اخبار اردو کے سب سے پرانے اخبارات ہیں ہمصر زمیندار کی پچیس سالہ جوبلی اسی سال ہوئی ہے۔ ان کے علاوہ بہت کم اردو اخبا پیس سال کی عمر تک پہونچے ہیں۔ ادبی رسالوں میں شاید ناپیز زمانہ کے سوا اور کوئی ماہانہ رسالہ ایسا نہیں ہے جو پچیس سال سے سلسلہ ائع ہو رہا ہے۔ ہزار ہزار شکر اُس مسبب الاسباب کا ہے کہ جنوری ۱۹۲۳ء میں زمانہ کے زندگی کے اوّل پچیس سال بخیر و خوبی ختم ہو فروری سنہ حال سے اسکا چھبیسواں سال شروع ہوا ہے جس کی خوشی میں یہ خاص نمبر جوبلی نمبر کے نام سے خاص اہتمام سے شائع ہا ہے۔ اس نمبر میں کوشش کیگئی ہے کہ ہمارے قدردانوں کے سامنے کارکنان رسالہ کے ذہنی معیار کا ایک خاکہ پیش ہو جائے سکی ترتیب و اشاعت میں یہ خیال مد نظر رکھا گیا ہے کہ آیندہ شائقین ادب اس نمبر کو اردو کی موجودہ توسیع و ترقی کا ایک سمجھ سکیں۔

اس نمبر کا آغاز فخر شعرائے حال مولانا صفی کے دعائیہ قطعہ فخر ہندوستان سر دیبندر ناتھ ٹگور۔ محب ملک مسٹر اینڈریو امور وزیر تعلیم صوبہ متحدہ۔ قابل ناظم تعلیمات صوبہ کے پیام محبت سے ہوا ہے۔ ہم ان عالی مرتبہ محسنوں کے محبت آمیز خیالات و جذ کو اس نمبر میں نمبر وار شائع کر رہے ہیں ہمکو بھروسہ ہے کہ اس خوشی کے موقعہ پر ہمارے قدر شناسوں کا یہ اظہار مسرت ہمارے لئے ہ طرح سے باعث فخر ہوگا۔ ہم کو امید ہے کہ ہمارے تمام محترم معاصرین و معزز ناظرین زمانہ بھی اس خوشی میں شریک ہو کر ہمکو شکر گذاری کا موقع عطا فرمائینگے۔ مخدومی سر عبدالقادر صاحب نے ایک مفصل مضمون میں زمانہ کے ادبی کوششوں کی قدردانی فرمائی ہے زمانہ کو جو تھوڑی بہت کامیابی نصیب ہوئی ہے اس پر آپکو خاص طور پر خوش ہونے کا موقع ہے اسلئے کہ جن بزرگ ہستیوں کے حوصلہ افزائیوں کے بدولت اڈیٹر زمانہ کے علمی زندگی کا آغاز ہوا ہے اُن میں سر عبدالقادر اور مسٹر سچدانند سنہا کا نام خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ ہمارے محترم جناب وسیم خیرآبادی نے رسالہ کیلئے جو مدحیہ قطعہ عطا فرمایا ہے۔ ہمارے مکرم خواجہ حسن نظامی صاحب نے جس خلوص و محبت سے زمانہ کے جوبلی پر کارکنان رسالہ کو مبارکباد دی ہے اور زمانہ کے قدیم ترین خریدار و قدرشنا مخدومی منشی رام دیال صاحب بکسینہ وزیر مال جاورہ نے ناظرین رسالہ کی طرف سے ہماری جو قدر افزائی فرمائی ہے ان سب کا

یہ ادا کرنا ہمارے امکان سے باہر ہے

اس نمبر میں کل ۴۵ مضامین اور ۵۶ تصویریں ہدیۂ ناظرین کی گئی ہیں زمانہ حال کے مشہور مصنف مولانا عبدالرزاق صاحب کانپوری نے حروف ابجد کی تاریخ پر ایک عالمانہ مضمون تحریر فرمایا ہے۔ مولانا شبلی مرحوم بھی اس موضوع پر قلم اُٹھانا چاہتے تھے لیکن زندگی نے وفا نہ کی اور اپنے ارادے کی تکمیل نہ کرسکے شکر ہے کہ اب مولانا عبدالرزاق جیسے نامور فاضل نے علم الکتابت کی تاریخ بہت تحقیق و شرح و بسط کیساتھ قلمبند فرمائی ہے۔ اس مضمون کی مزید توضیح کیلئے اس نمبر میں مصادر حروف تہجی کی ایک خاص پلیٹ بنوا کر ہدیۂ ناظرین کیگئی ہے جس سے اس علمی تحقیقات کی قدر و قیمت میں ایک دلچسپ اضافہ ہوگیا ہے۔

اس نمبر کا تیسرا مضمون ہمارے مشہور مضمون نگار ٹھاکر جے۔ آر۔ رائے صاحب نے "اسلامی ہند کے تمدنی فتوحات" پر لکھا ہے اور یہ مضمون بھی باتصویر شائع کیا جارہا ہے۔ تصاویر و مضمون دونوں سے قدیم باشندگان ہند کی اولوالعزمی اور تمدنی فتوحات کا پورا ثبوت ملتا ہے یہ مضمون تازہ ترین ارکیالاجیکل تحقیقات پر مبنی ہونے کے وجہ سے خاص طور پر دلچسپ ہے۔

پچیس سال ہوئے کافی غور و فکر کے بعد یہ طے کیا گیا تھا کہ زمانہ محض شاعری و انشا پردازی کے ہاتھ گرو نہ رکھا جائے بلکہ اردو زبان کی توسیع و ترقی کے ساتھ ساتھ اصلاح خیالات درستی مذاق۔ توسیع معاملات اور ترقی اتحاد کی بھی کوشش کیجائے اسی دستور العمل پر اب تک عمل درآمد رہا ہے۔ چنانچہ اس نمبر کے تین خاص خاص مضامین ایسے ہیں جن سے بعض اہم تمدنی مسائل پر روشنی پڑتی ہے۔ مشہور مذہبی لیڈر لالہ روشن لال صاحب بیرسٹر صدر آریہ سماج پنجاب نے تمام مختلف مذاہب ملک کے اصولی اتحاد و یگانگت پر ایک قابل غور مضمون تحریر فرمایا ہے جسمیں نہایت خوبی سے یہ ثابت کیا گیا ہے کہ سب مذاہب توحید کے قائل ہیں اور سبھی اخلاص و محبت باہمی کی تاکید کرتے ہیں۔ ہمارے صوبہ کے مشہور ادیب اور زمانہ کے قدیم عنایت فرما پنڈت متوہر لال صاحب زتشی نے اصلاح تمدن اور قومی ترقی کے اہم مسئلہ پر مؤثر اور دلنشین پیرایہ میں اظہار خیالات فرمایا ہے۔ مضمون کے ساتھ پچھلی صدی کے چار نامور مصلحان ملک راجہ موہن رائے۔ پنڈت ایشور چندر ودیا ساگر سوامی دیانند اور جسٹس رانا ڈے کے فوٹو بھی ہدیۂ ناظرین کئے گئے ہیں۔

ہمارے قدیم عزیز دوست پنڈت کشن پرشاد صاحب کول رکن انجمن خادمان ہند بھی زمانہ کے اولین مضمون نگاروں میں ہیں۔ "آزادی نسواں" پر آپ کا قابل غور مضمون غور سے پڑھنے اور ذہن نشین کرنے کے لائق ہے۔ ممکن ہے کہ آپ کی بعض رائیوں سے ہمارے بعض قدامت پرست احباب کو اتفاق نہ ہو لیکن کول صاحب نے جن واقعات کا ذکر کیا ہے [illegible] آتے رہتے ہیں ہندوستانی عورتوں کی حالت واقعی اصلاح طلب ہے۔ اور آپ نے

ناظرین زمانہ اس مسئلہ پر توجہ دلاکر ایک اہم فرض ادا کیا ہے۔

اسکے بعد دو مضامین سیاسیات کے متعلق ہیں جنھیں ہمارے دو قابل مضمون نگاروں نے خاص محنت سے لکھا ہے بابو امانت پرشاد صاحب نگم نے ٹرکی کی حیرت انگیز ترقی کی دلچسپ و سبق آموز تاریخ لکھی ہے۔ پروفیسر سریرام صاحب شرما نے "برطانوی نوآبادیات" کی سیاسی حیثیت پر ایک مفصل و مدلل مضمون تحریر فرمایا ہے اس مضمون سے اہل ملک کے سیاسی مباحث پر ایک خاص روشنی پڑتی ہے۔

ان کے بعد چار مشہور اہل قلم نے علمی نقطۂ خیال سے چار مختلف اصناف ادب سے باعتبار فن بحث کی ہے۔ زمانہ کے قدیم مضمون نگار اور مشہور مصنف سید حامد حسن صاحب قادری نے "مطالعہ شاعری" پر ایک عالمانہ مضمون لکھا ہے۔ دنیائے افسانہ کے نامور مصنف سید عبدالقادر صاحب سروری نے "ادبیات اردو اور ظرافت نگاری" پر ایک دلکش اور جامع مضمون لکھا ہے۔ مکرمی سید مقبول حسن صاحب وصل بلگرامی اڈیٹر مرقع لکھنؤ نے "اردو زبان اور افسانہ نگاری" پر ایک محققانہ مضمون قلمبند فرمایا ہے۔ ان فاضل مصنفین نے اپنے قابل بدیہ مضامین میں معلومات اور فن تنقید دونوں کا لب لباب درج کر دیا ہے ہمنے ان مضامین کو بھی باتصویر شائع کرنے کی کوشش کی ہے چنانچہ مشہور شعرا اور افسانہ نگاروں اردو کی عکسی تصویریں اسی سلسلے میں نذر ناظرین کیگئی ہیں۔

خالص ادبی دلچسپی اور علمی تحقیقات کے بھی کئی قابل قدر مضامین اس نمبر میں درج رسالہ کئے گئے ہیں "اردو ادب پر واقعات کربلا کا کیا اثر پڑا" اس بحث پر منشی ممتاز حسین صاحب جونپوری نے نہایت عرقریزی کیساتھ ایک بصیرت افروز مضمون لکھا ہے۔ ہمارے مکرم سید محمد حفیظ صاحب نے اردو کی چند دیوانی شعرا پر جو بیگم شمرو کے عہد حکومت میں گذرے ہیں ایک محققانہ مضمون سپرد قلم کیا ہے۔ ہمکو افسوس ہے کہ اس مضمون کے بعض ضروری حاشیے اور فٹ نوٹ سہواً درج نہیں ہوسکے۔ ابتدائی صفحات بھی جو بیگم شمرو کے متعلق تھے اسمیں شامل ہونے سے رہ گئے اگر کسی آیندہ پرچہ میں ہدیۂ ناظرین ہوگئے اس مضمون کا جو حصہ شائع ہوا ہے اس کا عنوان ہمارے دوست نے "بیگم شمرو کی ادبی کوششیں" لکھا تھا لیکن مضمون موجودہ عنوان سے شائع کیا گیا ہے۔

الہ آباد یونیورسٹی کے نامور پروفیسر پنڈت امرناتھ جھا نے اردو کے چار شعرا پر ایک دلکش مضمون لکھا ہے جسکے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک انگریزی ادیب کی نگاہ میں زمانۂ حال کی اردو شاعری کی کیا قدر و قیمت ہے۔ پروفیسر جھا ایک بلند خیال نقاد سخن ہیں۔ اور مختلف زبانوں کے علم ادب سے ذوق رکھتے ہیں۔ لہذا ان کی رائے خاص طور پر قابل وقعت ہے جھا صاحب کے مضمون کے ساتھ بھی چار نامور شعرا اکبر۔ شاد۔ اقبال و صفی کی تصویریں دیگئی ہیں۔ ہمکو افسوس ہے کہ جناب شاد عظیم آبادی کے آخری زمانہ کا فوٹو ہمکو باوجود کوشش وقت پر نہ مل سکا۔

جسکی وجہ سے ہم اس نمبر میں ایک پرانی تصویر سے بلاک بنواکر شائع کر رہے ہیں اب مرحوم کی آخری تصویر بھی دستیاب ہوگئی ہے جو انشاء اللہ زمانہ کے کسی آیندہ نمبر میں زیب رسالہ ہوگی۔

ناظرین کے تفنن طبع کیلئے دو ظریفانہ مضامین ایک طبزاد ڈرامادو بے نظیر مختصر افسانے بھی اس نمبر میں شائع ہوئے ہیں۔ مشہور ادیب اردو مکرمی خواجہ عبدالرؤف صاحب عشرت لکھنوی نے اپنے بے نظیر پیرایہ میں شاہ نصیر الدین حیدر کے مشہور مصاحب گھنٹا بیگ نامی کے دلچسپ حالات زندگی قلمبند فرمائے ہیں گو یہ حالات تاریخی واقعات ہیں لیکن دلچسپی دلچسپ ناول سے بھی زیادہ دلکش ہیں۔ مسٹر رام سرن نگم ڈپٹی کلکٹر نے "چوٹی کا بیان" کا جو ظریفانہ خاکہ کھینچا ہے اسے پڑھکر ناظرین محظوظ ہونگے۔ مسٹر سری نرائن نگم (پسر اکبر اڈیٹر زمانہ) کا مختصر طبزاد ڈراما "غرور کی شکست" ایک نوجوان مصنف کی مشق اول کے حیثیت سے قدر دانی کا مستحق ہے۔ پچیس برس پہلے اڈیٹر زمانہ کے اہل خاندان اس علمی مشغلہ کیوجہ سے اُس سے شکستہ خاطر تھے اب جب رسالہ کی جوبلی منائی جارہی ہے تو دو خاص عزیزوں نے اسکے لیے مضامین لکھے ہیں۔ ذاتی حیثیت سے اڈیٹر کے لیے یہ خوشی کی بات ہے امید کہ ناظرین زمانہ کے لیے بھی باعث مسرت ہوگی۔

ہمارے مخلص دوست و مکرم منشی پریم چند و جناب سدرشن اردو افسانہ نگاری کے آسمان کے آفتاب و ماہتاب ہیں دونوں کی ذات گرامی پر زمانہ کو فخر و مباہات کا وقعہ ہے منشی پریم چند کی ادبی زندگی کا آغاز اسی پرچہ کا کا زمانہ سے سدرشن صاحب ہمارے پرانے مضمون نگار ہیں۔ ہم مشکور ہیں کہ ان دونوں صاحبوں نے ہماری درخواست پر دو خاص افسانے لکھے ہیں

افسانہ منتر پریم چند جی کا ایک بہترین افسانہ ہے جس پر انہوں نے کامیابی کے ساتھ آپ نے اس مختصر افسانے میں متضاد انسانی جذبات کا چربہ اُتارا ہے اس سے آپکے کمال فن کا ایک اور تازہ ثبوت ملتا ہے۔ اس قصہ کے متعلق تین رنگ کی ایک خاص تصویر بھی ہدیۂ ناظرین کیگئی ہے جسمیں جا بجا دست مصور نے فطرت انسانی کے ترجمان منشی پریم چند کے دلی جذبات کا عکس صفحۂ کاغذ پر اتار کر پیش کر دیا ہے۔ جناب سدرشن نے اپنے بے نظیر افسانہ میں "ماں باپ کی فطری محبت کے نازک فرق کو جس خوبی و خوش اسلوبی کے ساتھ واضح کیا ہے اسکی داد نہیں دیجا سکتی ہے دونوں بیمثال افسانہ نگاروں نے اپنے فکر رسا اور زور قلم کے بہترین نمونے پیش کئے ہیں اور دونوں کو قابل رشک کامیابی حاصل ہوئی ہے۔

نظم میں شعرائے باکمال نے اپنے شہ پارے ناظرین زمانہ کے تفنن طبع کے لیے پیش کئے ہیں۔ اس بزم ادب میں اُستادانِ سخن نے اپنے اپنے کمال فن کے جوہر دکھائے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ مجلس مشاعرہ گرم سخن ہے "فصاحت آنکھیں بچھا رہی ہے۔ بلاغت قدموں پر لوٹی جاتی ہے" نامی گرامی عالم و فاضل مشہور و معروف سخنور سنجیدہ و متین ترجمان حقیقت زندہ دل و شوخ طبع ممبئی غرض اس بزم سخن میں جلوہ افروز ہیں اور قدیم و جدید دونوں قسم کا

کلام سننے میں آرہا ہے۔ جناب صفی نے "تتلی" پر ایسی منظر نظم کہی ہے کہ اس عنوان پر ایسی نفیس و سلیس شاعری شاید ہی کبھی سننے میں آئی ہو۔ حضرت ریاض کی تازہ ترین غزل

تیسرے فاقے ہمیں دانۂ انگور ملے ہم یہ سمجھے کہ بھرے ساغر بلّور ملے

بار بار پڑھئے گا اور طبیعت سیر نہ ہوگی۔ سچ ہے ریاض جیسے جیسے بوڑھے ہوتے جاتے ہیں ان کی شاعری جوان ہوتی جاتی ہے۔ علامہ تہر دہلوی زمانہ کے قدیم محسن ہیں آپکے فلسفانہ شعار پڑھکر دلمیں وجد طاری ہوتا ہے حضرت جگر مرادآبادی کا "آئینۂ حقیقت" واقعی اسم با مسمّیٰ ہے۔ غزل کا میدان جیسا تنگ ہے ظاہر ہے لیکن غزلیات جگر اپنے بلندی مطالب کے لیے مشہور ہیں۔ جناب محشر لکھنوی نے "شاعری اور تنہائی" کے عنوان سے ایک پُرزور نظم کہی ہے جس سے آپکے قادرالکلامی کا پورا ثبوت ملتا ہے۔ واقعی حضرت محشر جیسے اُستاد فن کیلئے ایسی اصناف سخن یکساں ہیں حضرت عزیز لکھنوی کی غزل میں بھی وہ تمام خصوصیات موجود ہیں جو سخن فہم حضرات کے نگاہ میں کلام معجز نظام میں ہمیشہ پائی جاتی ہیں۔ سند فصاحت کی وجہ سے آپ حسب دلخواہ ناظرین زمانہ کے تفنن طبع کا سامان مہیا کرسکے اور جو خاص نظم آپ نے جوبلی نمبر کے لیے مرحمت فرمائی ہے وہ بوجہ تاخیر اس نمبر میں ہدیہ ناظرین نہ ہوسکی اب آئندہ کسی پرچے میں شائع ہوگی۔ مولانا حسرت موہانی کی تازہ ترین غزل بھی خاص طور پر دلکش ہے۔ آپ کی زبان اور بندش الفاظ کی کیا تعریف کیجائے۔ ایک عرصۂ دراز کی خاموشی کے بعد آپ نے یہ غزل کہی ہے۔

جناب نورالحسن صاحب نیّر مصنف نورالغات نے "چمن ہند" کے عنوان سے ملک کے موجودہ حالت پر ایک دلگداز نظم لکھی ہے جسکو پڑھکر دلپر چوٹ سی لگتی ہے کاش ہم قومی اتفاق کے برکتوں سے بھی بہرہ اندوز ہوتے۔ "پیام صلح" کے نام سے ہمارے قابل دوست مسٹر بشیر احمد صاحب اڈیٹر ہمایوں نے ایک دل آویز نظم لکھی ہے۔ جسمیں عزیزان وطن کو اتفاق و یگانگت کی دعوت عام دیگئی ہے۔

شاعر نہ صرف ترجمان حقیقت بلکہ رہنمائے قوم بھی ہوتا اور اپنے چشم حقیقت نگر سے آنے والے واقعات کے دلکش نظارے دیکھا کرتا ہے جو عام نظروں سے چھپے ہوئے ہوتے ہیں۔ چنانچہ حضرت جوش ملیح آبادی نے "ایشیا کی آئندہ بیداری" کا مسرّت انگیز مژدہ سنایا ہے۔ آپ اس دلکش نظم کو بار بار پڑھئے تب بھی آپ کا دل اسے ایکمرتبہ پھر پڑھنے کو چاہے گا۔ محمّی مرزا جعفر علیخاں صاحب نے نہایت پُرلطف پیرایہ میں "شاعر کا نصب العین" بیان کیا ہے۔ آپکی نظم دیکھکر اس مشہور ضرب المثل کہ "تصنیف را مصنف نیکو کند بیان" کی حقیقت آئینہ ہوجاتی ہے "ستی" کے متعلق شاعر کہہ گیا ہے۔

نسبت نہ دوستی کو پرانے کے تئیں
یہ آگ میں جل مرتی ہے مروے کے لیے وہ گرد بھی شمع کے پھرتا بھی نہیں

لیکن اگر اس معیار نسوانی کی روحانی عظمت پورے طور سے ذہن نشین کرنا ہو تو ہمارے دوست حضرت جگر بریلوی کی قابل داد نظم ملاحظہ فرمائیے۔

شادی بیاہ اور دیگر خوشی کے موقعوں پر اکثر سر شام ہی سے ہرے لال رنگ کے جو غبارے اڑائے جاتے ہیں انکی بہار کس نے نہیں دیکھی ہوگی "طاؤس" کے حسن دلکش کا کون معترف نہ ہوگا۔ لیکن جناب روان کا غبارہ اور حضرت تسکین سورتی کا طاؤس آپ ہی اپنا نظیر ہے۔ دونوں باکمال شعراء کو ان نظموں پر جس قدر ناز ہو بجا ہے۔ ہم نے ان نظموں کو بارہا پڑھا۔ لیکن طبیعت سیر نہ ہوئی۔ اردو شاعری میں فرسودہ تشبیہوں اور پامال استعاروں کے بہتات کی عام شکایت ہے۔ مگر ان نظموں کو پڑھکر یہ تسلیم کرنا ہوگا کہ اب یہ شکایت پرانی ہو چکی ہے۔

"خوشی" پر ہمارے دوست اڈیٹر صاحب ادبستان کی نظم پڑھکر آنکھوں کے سامنے انسان کی روحانی عظمت کا پُر رعب نظارہ پیش ہو جاتا ہے۔ "آرزو" پر پروفیسر ضامن علی صاحب نے ایک دل آویز نظم لکھی ہے۔ حضرت حفیظ جالندھری مدیر مخزن نے "پریت کی ریت" پر ایک دل آویز گیت لکھا ہے جسمیں شاعری کیساتھ موسیقی کا بھی پورا لطف موجود ہے۔ اردو زبان میں برج بھاشا کے الفاظ کیسے بھلے معلوم ہوتے ہیں اسکا اندازہ اس دلکش گیت سے بخوبی ہو سکتا ہے حضرت یاس کی "رباعیات" اس یگانۂ روزگار شاعر کے قادر الکلامی کا تازہ ترین ثبوت ہے۔ ہمارے نوجوان دوست پنڈت آنند نرائن صاحب ملا نے "شاعر" پر ایک نہایت جامع پُر مغز اور اچھوتی نظم لکھی ہے۔ اکثر شعرا نے اس موضوع پر بناز و رطبیعت دکھایا ہے لیکن جو تخیل اس پُر بہار نظم میں پیش کی گئی وہ سب سے نرالی ہے بات یہ ہے کہ ملا صاحب نے اس نظم میں تقلید کی دائرے سے ہٹکر خود اپنی زور طبیعت سے کام لیا ہے جس سے ہمکو ان کی ذات سے بڑی بڑی امیدیں پیدا ہو گئی ہیں عم اللہ کرے زور قلم اور زیادہ۔

مکرمی برق اور مجتبیٰ محروم کی نظمیں بھی خوب ہیں دونوں صاحب ہمارے پرانے رفیق۔ زمانہ کے قدیم محسن اور اردو کے مشہور باکمال شاعر ہیں۔ جناب اصغر گونڈوی۔ حضرت وحشی۔ جناب افسر۔ حضرت ناشاد کی مرصع غزلیات اپنی اپنی جگہ پر نہایت پُر لطف و قابل داد ہیں "فلسفہ خیام" پر ہمارے مکرم مولوی عبدالودود صاحب درد بریلوی کی دل آویز نظم ہمارے تصویر سرورق کے متعلق ہے جس کامیابی سے آپ نے شاعر اور مصور دونوں کے جذبات کو اس نظم میں قلمبند کر لیا ہے اُسکی بیساختہ داد دینے کو جی چاہتا ہے۔ نظموں کے علاوہ اس نمبر کی تصاویر بھی علمی دلچسپی کے خیال سے انتخاب کی گئی ہیں۔ رنگین تصاویر کا انتخاب بھی اسی لحاظ سے ہوا ہے۔ عمر خیام کے ایک مشہور رباعی کی ایک دلکش رنگین تصویر ہدیۂ ناظرین کیگئی ہے۔ اسکی تشریح حضرت درد بریلوی کی نظم نے کر دی ہے۔ دوسری رنگین تصویر منشی پریم چند کے قصہ کے متعلق ہے۔ اس کے علاوہ بہت سے مشہور مصنفین اردو و نامور مضمون نگاران زمانہ کی تصاویر بھی ہدیۂ ناظرین کی گئی ہیں گو بعض احباب نے اسبارے میں بالکل مایوس کیا۔ زنتشی صاحب۔ برق صاحب۔ کول صاحب۔ نیر صاحب۔ عبدالماجد صاحب حضرت اصغر گونڈوی۔ حضرت جگر مرادآبادی وغیرہ وغیرہ کی ہم علانیہ شکایت کرتے ہیں کہ انھوں نے ہمکو اپنی تصویریں عنایت نہیں فرمائیں اس نمبر کی بعض تصویریں اہم تاریخی دلچسپی لیے ہوئے ہیں اور پہلی مرتبہ شائع ہو رہی ہیں۔ مومن کی تصویر کیلئے ہم انجمن ترقی اردو

اورنگ آباد کے موقر رسالہ اردو کے مرہون منت ہیں۔ انجمن کے نامور سکریٹری ہمارے دوست مولوی عبدالحق صاحب خود ایک زبردست ادیب اور خادمان اردو کے سچے قدردان ہیں۔ سودا کا فوٹو جو پہلی بار شائع ہو رہا ہے اس نمبر کا ایک خاص نادر و نایاب ادبی تحفہ ہے جسکے لیے ناظرین زمانہ کو ہمارے دوست سید محمد حفیظ صاحب کا احسانمند ہونا چاہیئے۔ غالب سرشار و آزاد کے کارنامے تو سبھی کو معلوم ہیں ان کی تصویریں بھی رونق افروز بزم زمانہ ہیں۔ داغ۔ امیر۔ ایر۔ حالی۔ نذیر احمد۔ ذکاء اللہ۔ شرر۔ سرشار۔ نظر۔ سرور۔ ریاض۔ صفی۔ اکبر۔ شاد۔ اقبال۔ محشر۔ وصل۔ جگر (بریلوی) پریم چند۔ سدرشن سر عبدالقادر۔ چکبست۔ روان۔ جوش۔ اثر۔ ناشاد۔ ملا۔ حفیظ۔ مخمور۔ سحر بھی ہمارے قلمی محسنین ہیں ان میں سے دو ایک صاحبوں سے ناظرین روشناس ہونگے لیکن یہ مجموعی حیثیت سے ان مشہور اہل قلم کی تصاویر اسی نمبر میں شائع کیجا رہی ہیں۔ سرسید۔ شبلی۔ مہر۔ شعلہ۔ شوق۔ تعشق۔ عرج وغیرہ کی تصویریں حال ہی میں ہدیۂ ناظرین ہو چکی ہیں اسلیے اس نمبر میں انکی تصویریں شامل نہیں کی گئیں۔ انیس۔ مجروح وغیرہ بعض دیگر استادان سخن کے فوٹو بھی ملگئے ہیں اور آیندہ شائع ہونگے۔ آیندہ نمبروں میں ہم اپنے دیگر معزز و ممتاز مضمون نگاروں کی عکسی تصاویر بھی ہدیۂ ناظرین کرینگے۔ ہمارا ارادہ ہے کہ اس جشن جوبلی کے یادگار میں رفتہ رفتہ سب مضمون نگاران زمانہ کی تصاویر شائع کردیں۔ چنانچہ جناب کیفی۔ حضرت شمیم۔ مولانا حسرت وغیرہ کے بلاک بن رہے ہیں۔ ہمکو افسوس ہے کہ انکی تصویریں زرا دیر سے ملیں ورنہ وہ بھی بخوشی درج رسالہ کردی جاتیں بعض تصاویر بڑی مشکل سے دستیاب ہوئی ہیں۔ نظر صاحب کی تصویر کی ہمکو ایک عرصہ سے تلاش تھی۔ شکر ہے کہ جناب عزیز و حضرت منور لکھنوی کی کوشش بلیغ سے بالآخر ہماری یہ مشکل آسان ہوگئی۔ جناب ریاض کی جو تصویر دیگئی ہے وہ انکے تازہ ترین فوٹو سے لیگئی ہے۔ منشی راج بہادر صاحب بانی رسالہ کا فوٹو ہم اس سے پہلے شائع کرنا چاہتے تھے لیکن انکی کسر نفسی نے ان کی زندگی بھر انکی اجازت نہ دی۔ منشی صاحب کو نہ صرف زمانہ کی بنیاد قائم کرنے کا فخر حاصل ہے بلکہ اول تین سال انھوں نے اس رسالہ کے تمام مالی نقصانات خود ہی برداشت کیے۔ رسالہ کے عملے کا گروپ کسی نمود و نمائش کی غرض سے شائع نہیں کیا گیا ہے اس سے درحقیقت صرف اڈیٹر زمانہ کا ذاتی اظہار شکر گذاری مقصود ہے اس مرقع میں وہ صاحبان ایسے بھی شامل ہیں جو ہمارے ماکت نہیں بلکہ رفیق کار ہیں منشی احمد علی عرصہ تک دفتر زمانہ میں رہنے کے بعد اب احمد المطابع کے مالک ہیں خواجہ عبدالماجد منیجر انتظامی پریس زمانہ کے لکھائی چھپائی میں ہمیشہ خاص دلچسپی لیتے ہیں جوبلی نمبر کے محاسن ظاہری بھی بہت کچھ انکی توجہ کے رہین منت ہیں۔ پنڈت شیونرائن صاحب منیجر ترقی پریس و نیز پروپرائٹر صاحب جاب پریس بھی ہمارے شکریہ کے مستحق ہیں جاب پریس نے حال ہی میں نہایت اعلے پیمانہ پر بلاک سازی کا کارخانہ کھولا ہے۔ یوں بھی جس طرح عمدہ لیتھو چھپائی کیلئے انتظامی پریس اسیطرح ٹائپ کے کام کیلئے ہمارا مقامی جاب پریس بہت مشہور ہے۔ جوبلی نمبر کی تیاری میں اسکے اولوالعزم مالک مسٹر کھنا اور قابل منیجر مسٹر بھٹاچاریہ نے غیر معمولی دلچسپی لی ہے۔ اسکی کتابت انتظامی پریس و زمانہ پریس کے کاتبوں نے ملکر کی ہے۔ اور اس سلسلے میں منشی نورالدین منشی سلطان احمد خان اور منشی محبوب حسن کا نام خصوصیت سے قابل ذکر ہے۔

ایڈیٹر

آپ بھی خوش ہونگے!

جب آپ دیکھیں گے کہ لال املی کے کپڑے کیسے خوبصورت، کتنے مضبوط، پائدار اور اُسکے ساتھ ہی کس قدر سستے ہیں۔ دس بیس سال کا ذکر نہیں پورے پچاس سال کے عرصہ سے یہ کپڑے ہندوستان کے کونے کونے میں فروخت ہو رہے ہیں اور تجربہ نے اس امر کی تصدیق کردی ہے کہ لال املی کے کپڑے سو فیصدی خالص اُون سے تیار کئے جاتے ہیں اور ہندوستانی آب و ہوا کے عین مطابق ہیں۔

LALIMLI
PURE WOOL

ہمیشہ لال املی کے کپڑے خریدیئے!

لوئیاں کمبل سرج ٹویڈ فلالین گلوبند سویٹر پل اوور موزے ٹوپیاں سب کچھ خالص اُون کا	اپنے شہر کی لال املی ایجنسی میں جاکر نمونے دیکھئے۔ اگر وہاں ایجنسی نہ ہو تو ہمیں لکھئے

کانپور وولن ملز کمپنی
پوسٹ بکس نمبر ۵ کانپور

فہرست مضامین

نمبر شمار	نام مضمون نثر	نام مضمون نگار	صفحہ
۱	قطعہ دعائیہ	مولانا صفی لکھنوی	۱
۲	پیام محبت	سر ربندر ناتھ ٹگور	
		مسٹر سی۔ ایف اینڈریوز	
		آنریبل رائے راجیشور بلی صاحب آر۔ بی ای وزیر تعلیم صوبہ متحدہ	
		لالہ لاجپت رائے۔ ایم۔ ایل۔ اے۔	۲
		آنریبل لالہ سیتا رام صدر لیجسلیٹو کونسل صوبہ متحدہ	
		مسٹر اے ایم میکنزی۔ بی ایس سی۔ ڈائرکٹر سررشتہ تعلیم صوبہ متحدہ	
۳	زمانہ اور ترقی اردو	خان بہادر سر شیخ عبدالقادر بی۔ اے ایم ایل سی بیرسٹر ایٹ لا	۵
۴	زمانہ	از جناب وسیم خیرآبادی	
۵	علم الکتابت یا تاریخ ابجد	مولانا محمد عبدالرزاق مصنف البراہمہ	۹
۶	اسلاف ہند کے تمدنی کارنامے	ٹھاکر جے۔ آر۔ رائے جرنلسٹ	۳۲
۷	اتحاد مذاہب	لالہ روشن لعل بیرسٹر ایٹ لا۔ لاہور	۴۱
۸	اصلاح قومی	پنڈت منوہر لال زتشی ایم۔ اے۔ آئی۔ ای۔ ایس	۴۸
۹	آزادی نسواں	پنڈت کشن پرشاد کول بی۔ اے۔ رکن انجمن خدام ہند	۵۳
۱۰	ٹرکی	بابو انت پرشاد نگم بی۔ اے۔ ایل۔ ایل۔ بی	۶۱
۱۱	برطانوی نوآبادیات	پروفیسر سری رام ایم۔ اے۔ ایم آر۔ ایس	۷۱
۱۲	مطالعۂ شاعری	سید حامد حسین قادری لکچرار سینٹ جانس کالج آگرہ	۷۷
۱۳	علم تاریخ	سید فضل الرحمان بی۔ اے۔ ایل ایل۔ بی	۸۴
۱۴	اردو ادب اور ظرافت نگاری	مولوی محمد عبدالقادر سروری ایم۔ اے۔ ایل ایل۔ بی	۸۸
۱۵	افسانہ نگاری اور اردو زبان	سید مقبول حسین وصل بلگرامی مدیر "مرقع" لکھنؤ	۹۶
۱۶	مشرقی ادب پر واقعہ کربلا کا اثر	سید ممتاز حسین جونپوری	۱۰۳
۱۷	چند یورپین شعرائے اردو	سید محمد حفیظ بی۔ اے لکچرار الہ آباد یونیورسٹی	۱۰۸

نمبر سلسلہ وار	نام مضمون	نام مضمون نگار	صفحہ
۱۸	اردو کے چار شاعر	پنڈت امرناتھ جھا ایم۔ اے۔ پروفیسر انگریزی الہ آباد یونیورسٹی	۱۱۲
۱۹	گھنٹا بیگ	خواجہ عبدالرؤف عشرت لکھنوی	۱۱۸
۲۰	منتر (قصہ)	منشی "پریم چند" بی اے	۱۲۳
۲۱	باپ (قصہ)	جناب سدرشن	۱۳۴
۲۲	غرور کی شکست (ڈراما)	مسٹر سری نواین نگم ایم۔ اے۔ ایل۔ ایل۔ بی	۱۴۸
۲۳	چھوٹی لالین	مسٹر رام سرن نگم ایم۔ ایس۔ سی۔ پی۔ سی۔ ایس	۱۵۵
۲۴	اردو ہندی اور رسالہ زمانہ	خواجہ حسن نظامی دہلوی	۱۶۰
۲۵	زمانہ کی سلور جوبلی	منشی رام دیال سکسینہ فائنشل سکرٹیری دربار جادرہ	۱۶۲
	حصۂ نظم		
۲۶	خمخانۂ ریاض	حضرت ریاض خیرآبادی	۱۶۴
۲۷	کلام عزیز	مرزا محمد ہادی عزیز لکھنوی	۱۶۶
۲۸	تمثلی	مولانا صفی لکھنوی	۱۶۷
۲۹	جذبات مہر	منشی سورج نرائن مہر دہلوی	۱۶۹
۳۰	آئینۂ حقیقت	حضرت جگر مرادآبادی	۱۷۰
۳۱	شاعر اور تنہائی	حضرت مخمور لکھنوی	۱۷۱
۳۲	کلام حسرت	حضرت حسرت موہانی	۱۷۳
۳۳	صدائے بیداری	حضرت جوشش ملیح آبادی	۱۷۴
۳۴	غبارہ	چودھری جگت موہن لال رواں ایم اے۔ ایل ایل۔ بی	۱۷۵
۳۵	شفق	منشی مہاراج بہادر برق دہلوی۔ بی اے۔	۱۷۶
۳۶	شاعر کا نصب العین	خانصاحب مرزا جعفر علیخاں اثر لکھنوی۔ بی اے پی سی ایس	۱۷۸
۳۷	پیام صلح	میاں بشیر احمد صاحب بی اے، ایڈیٹر ہمایوں	۱۸۰
۳۸	چمن ہند	منشی نورالحسن صاحب نیر بی۔ اے۔ ایل۔ ایل بی مولف نورالغات	۱۸۱
۳۹	کلام اصغر	حضرت اصغر گونڈوی	۱۸۲
۴۰	طاؤس	حضرت تسکین قریشی سورتی	۱۸۳

	نام مضمون	نام مضمون نگار	صفحہ
۴۱	شاعر	پنڈت آنند نرائن ملا ایم۔ اے۔ ایل۔ ایل۔ بی،	۱۸۴
۴۲	ستی	منشی شیام موہن لال جگر بریلوی بی۔ اے	۱۸۷
۴۳	پریت کی ریت	ابوالاثر مولانا حفیظ جالندھری مدیر مخزن لاہور	۱۸۸
۴۴	کلام افسر	مسٹر حامد اللہ صاحب افسر میرٹھی بی۔ اے	۱۹۰
۴۵	خاک ہند	منشی نلوک چند محروم بی۔ اے	۱۹۱
۴۶	جذبات ناشاد	پرنسپل مسٹر رام پرشاد کھوسلہ ناشاد۔ ایم۔ اے۔ آئی۔ ای۔ ایس	۱۹۲
۴۷	رباعیات	مرزا یاس یگانہ لکھنوی	۱۹۳
۴۸	خوشی	جناب رشید احمد صدیقی ایڈیٹر ادبستان بمبئی	۱۹۴
۴۹	کلام وحشی	بابو کرشن سہائے ہنکاری وحشی	۱۹۴
۵۰	فلسفۂ خیام	سید عبدالودود صاحب وکیل بریلوی	۱۹۵
۵۱	آرزو	سید ضامن علی ایم۔ اے۔ صدر اردو ڈپارٹمنٹ الہ آباد یونیورسٹی	۹۶
۵۲	زمانہ کی جوبلی	منشی اقبال ورما ساحر سہگانی	۱۹۷
۵۳	یاد رفتگان	ایڈیٹر	۱۹۸
۵۴	پیشکش	ایڈیٹر	(۱-۵)

تصاویر

۱	تصویر سرورق، فلسفۂ خیام (رنگین)	۱۰	شمس العلما مولوی محمد حسین آزاد
۲	تصویر متعلق قصۂ منتر (رنگین)	۱۱	انگرورت کے مندر کا عالم منظر
۳	آنریبل رائے راجیشور بلی صاحب ایم۔ اے۔ بی۔ ای وزیر تعلیم صوبہ متحدہ	۱۲	انگرورت کے مندر کی چار دیواری
۴	خان بہادر سر شیخ عبدالقادر بی۔ اے ایم۔ ایل۔ سی بیرسٹر ایٹ لا	۱۳	انگرورت کے مندر کا مینار
۵	مصادر حروف تہجی (متعلق مضمون علم الکتابت)	۱۴	راجہ رام موہن رائے
۶	مولانا محمد عبدالرزاق مصنف البرامکہ	۱۵	سوامی دیانند سرسوتی
۷	شمس العلما ڈاکٹر نذیر احمد	۱۶	ایشور چند ودیا ساگر
۸	شمس العلما مولانا ذکاء اللہ	۱۷	مہادیو گوبند رانا ڈے
۹	شمس العلما مولانا حالی	۱۸	مرزا محمد رفیع سودا

۱۹ مرزا غالب
۲۰ حکیم مومن خان مومن دہلوی
۲۱ حضرت داغ دہلوی
۲۲ حضرت امیر مینائی
۲۳ پنڈت رتن ناتھ سرشار
۲۴ مولانا عبدالحلیم شرر
۲۵ منشی پریم چند
۲۶ جناب سدرشن
۲۷ جناب اکبر الہ آبادی
۲۸ حضرت شاد عظیم آبادی
۲۹ ڈاکٹر سر اقبال
۳۰ مولانا صفی لکھنوی
۳۱ حضرت ریاض خیرآبادی۔ جناب عزیز لکھنوی
جناب وصل مدیر صنم
۳۲ منشی دیگا سہائے سرور مرحوم
۳۳ منشی نوبت رائے نظر لکھنوی
۳۴ پنڈت بشن نرائن در مرحوم
۳۵ پنڈت راج نرائن چکبست مرحوم
۳۶ منشی بشیر حسن جوش ملیح آبادی
۳۷ چودھری جگت موہن لال رواں

۳۸ خانصاحب مرزا جعفر علیخان اثر بی۔ اے
۳۹ پرنسپل رام پرشاد کھوسلہ ناشاد ایم۔ اے
۴۰ ابوالاثر مولانا حفیظ جالندھری مدیر "مخزن"
۴۱ منشی تلوک چند محروم بی۔ اے
۴۲ حضرت تسکین سورنوی
۴۳ منشی شیام موہن لال جگر بی۔ اے
۴۴ جناب مختر لکھنوی
۴۵ منشی اقبال ورما سحر ہنگامی
۴۶ مسٹر آنند نرائن ملا ایم۔ اے۔ ایل۔ ایل بی
۴۷ پنڈت امرناتھ جھا۔ ایم۔ اے
۴۸ مسٹر رام بابو سکسینہ ایم۔ اے۔ ایل ایل بی
۴۹ ٹھاکر جے۔ آر۔ رائے۔
۵۰ بابو امت پرشاد نگم بی۔ اے ایل۔ ایل بی
۵۱ منشی راج بہادر صاحب مرحوم دیوان صدر رامپور بانی رسالہ زمانہ
۵۲ خواجہ حسن نظامی دہلوی
۵۳ منشی رام دیال سکسینہ فنانشیل سکریٹری ریاست رامپور
۵۴ مسٹر سری نرائن نگم ایم۔ اے ایل ایل بی
۵۵ ایڈیٹر زمانہ
۵۶ کارکنان رسالہ زمانہ

گلے کی سوزش
کھانسی۔ زکام
اور حلق کی شکایات
بہت جلد
پیپس
سے
اچھی ہوجاتی ہین

گلا پھیپھڑون کا راستہ ہے۔ اس لیے جب کبھی اس مین آپکو سوزش خراش یا بھاری پن کی تکلیف محسوس ہو تو آپ یقینی طور پر فوراً ہی امراض متعدی کو نیست و نابود کردینے والی ٹکیان کھا لیجئے۔

پیپس کی خوشگوار گھل جانیوالی ٹیلیون سے عجیب و غریب صحت بخش اور جراثیم کش دھوان نکلتا ہے جو سانس کے ذریعہ آپ کے گلا اور سانس لینے والی نلیون کے ذریعہ سیدھا پھیپھڑون تک پہونچ جاتا ہے۔ اس فوری براہ راست طریقہ سے پیپس کی ٹکیان گلے کے جلن اور خراش وغیرہ سب کو بہت جلد آرام پہونچاتی ہین اور حلق کے اندرونی نلی اور دیگر اندرونی حصون کے سوزش وغیرہ کو بالکل آرام کردیتے ہین۔ جہان معمولی عرقیات پہونچ ہی نہین سکتے ہین۔

پیپس سے درد بہت جلد دفع ہوجاتا ہے۔ خشک تکلیف دہ کھانسی بھی اچھی ہوجاتی ہے۔ اس سے خطرناک بیمارون کے جراثیم بھی بہت جلد نیست و نابود ہوجاتے ہین اور حلق کی سنگین بیماریان نہین ہونے پاتین ہین۔ کہوہ وغیرہ کی تکلیف اور گلے کی دیگر اہم شکایتون سے حفاظت رہتی ہے۔ اور سانس لینے والی تمام نلیان امراض متعدی سے بچی رہتی ہین۔

لارنگیٹس۔ ٹانسلائیٹس۔ برانکائیٹس۔ برانکل زکام۔ دمہ۔ سخت کھانسی۔ نزلہ زکام اور ٹھنڈ وغیرہ کیلئے پیپس کی ٹکیان نہایت بیش بہا دوا ہین۔ اگر آپ انکو لگاتار استعمال کرین تو پھر آپ خطرناک زکام اور سردی کے بخار وغیرہ سے محفوظ رہین گے۔

امراض متعدی کو نیست و نابود کرنیوالی ٹکیان

پیپس سب انگریزی دوافروشون اور دواسازون کے یہان ایک روپیہ فی شیشی کے حساب سے مل سکتی ہے۔

ایجنٹ:۔ مسرس اسمتھ اسٹین اسٹریٹ اینڈ کمپنی لمیٹیڈ۔ انٹالی۔ کلکتہ

پیپس Peps

زکام کو معمولی نہ سمجھو!

جب سردی لگ کر چھینک آویں۔ ناک بہنے لگے۔ فوراً غذا کو کم کر کے گرم پانی پیو اور امرت دھارا ناک میں لگاؤ۔ زیادہ دور ہو تو گل بنفشہ ۹ ماشہ۔ گاؤزبان ۹ ماشہ۔ گل نیلوفر ۹ ماشہ۔ بھی ۹ ماشہ منقہ، عدد کا جوشاندہ کر کے امرت دھارا ۴ بوند داخل کر کے دو بار دن میں پیو۔ تین دن میں آرام ہوگا کسی گرم خشک دوائی سے زبردستی بند نہ کرو!

اگر تین دن کے بعد رہے

تو ظرکلی ایک گولی صبح و شام چند دن کھانے سے آرام ہوگا یہ دوائی ہر قسم زکام و نزلہ کے واسطے اکسیر ہے۔ ان دنوں میں منگوا کر رکھو۔ زکام سے جو لوگ غافل ہوئے تو اس سے کھانسی اور اس کے بعد دمہ تک نوبت پہنچتی ہے اور کبھی ساتھ بخار ظاہر ہو کر تپ دق تک نوبت پہنچتی ہے وگرنہ سالہا سال کھانسی دمہ ہی کھن کی طرح کسی نہ رہتے ہیں۔

اگر کھانسی ہو جاوے تو مندرجہ ذیل ادویات میں سے کوئی استعمال کرنی چاہیئے

گولی کھانسی نئی کھانسی کیواسطے جبکہ کھانسی یا دمہ کو بیج و بن سے کھودتی ہے آہستہ آہستہ ہوتا ہے مگر مستقل اور عالت جسم کے ساتھ ساتھ بڑھتی ہے تپ دق کی کھانسی کو بھی مفید ہے ایک صحت یافتہ مریض نے لکھا کہ آپ نسخہ کرتے ہیں جو زیادہ اشتہار میں دوائی کا نہیں دیتے بچوں سے لیکر بوڑھوں تک کو دی جاتی ہے ہر موسم اور ہر مزاج کے موافق آجاتی ہے قیمت ۲ عدد نصف ۱۱

گولی کھانسی رشتی نئی کھانسی کیواسطے جبکہ یہ تر ہو۔ قیمت ۱ بابت ۲ پیسہ (۴ عدد) ۱ نمونہ ۴ سر

اکسیر دمہ یہ معتدل دوائی ہے۔ یا قسمی خشک دونوں قسم کی دمہ کیواسطے بے نظیر دوا ہے قیمت ۱۰ عدد ۱ نمونہ ۴ سر

کف کیتورس نزلہ و زکام جو نیا ہو یا کھانسی ملغمی کیواسطے بے نظیر دوا ہے قیمت ۱۰ عدد ۱ نمونہ ۴ سر

صدفری پرانی کھانسی ہر قسم کو ہے۔ اگر کچھ غذائی مادہ بھی ساتھ رہتی ہو۔ نوزہ بھی دمہ ہو جاتی ہے قیمت ۱۲ گولی دو روپے (۴ عدد)

میتو کھانسی نئی پرانی و مفید ہے خاصکر جبکہ بھوک کم لگتی ہو جسم کمزور رہتا ہو دماغ موجود ہو قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے (۴ عدد)

اگر دمہ ہو جاوے تو مندرجہ ذیل ادویات استعمال کریں

جیاگنگا یہ دوائی بھی دمہ پرانی کھانسی کیواسطے ہے خاصکر جبکہ قبض بھی ساتھ ہو۔ ۴۰ سال کی عمر کے بعد تو اکسیر ہے گولیاں گولا چیرن ارد چی پرنگر بھی۔ درد مقعد درد شکم

راحت یہ بھی دوائی بتا رہوئی ہے اکثر سات دن کے اندر آرام آجاتا ہے۔ خوراک ایک بتی صبح و غیرہ کو نافع ہیں قیمت ۲۰ گولی دو روپے نمونہ ۴ سر

مرہم دمہ خشک و تر نئے یا پرانے نیز کھانسی کو مفید ہے۔ قیمت ۳۰ گولی دو روپے (۴ عدد) و شام قیمت فی شیشی دو روپے ۴ عدد

نوٹ: امرت دھارا ہر مرض کے لئے اکسیر ہے۔ وہ ان ادویات کے ساتھ ساتھ بعد از غذا جاری رکھی جاوے تو دمہ کو مدد دیتی ہے اور کھانسی وغیرہ سب کو مفید ہے۔ قیمت فی شیشی ۴ عدد۔ نصف ایکزو ۱۰ عدد۔ نمونہ ۴ سر

خط و کتابت و تار کا پتہ:۔ "امرت دھارا ۵۸" لاہور

اگر آپکو

علم ادب سے ذوق۔ سیاست سے دلچسپی تاریخ سے شوق مصوّری سے اُنسیت اعلےٰ پیمانہ کی جستجو۔ جدید ترین مطبوعات کی خواہش تاریخی اور کمیاب تصاویر کے علاوہ مصوری کے لاجواب نمونوں کو اپنے پاس رکھنے کی آرزو ہے

تو رسالہ "شمع" کو ضرور ملاحظہ فرمائیے

جسمیں یورپ وامریکہ کے بہترین لٹریچر کا ترجمہ اخلاقی تمدنی وسیاسی مضامین۔ اعلےٰ پیمانہ کے افسانے اور ہندوستان کے بہترین شعرا کا کلام ہر ماہ شایع ہوتا ہے:۔

جنوری ۲۸ء سے سلطنت مغلیہ اور شاہان اودھ کی نہایت قیمتی اور بے مثل تصاویر شایع ہو رہی ہین:۔

قیمت سالانہ ۶ر ششماہی ۳ر نمونہ ۱۰ر

۱۹۲۷ء کی مکمل جلد صرف للہ ر کا منی آڈر روانہ کرکے طلب فرمائیے

پتہ:۔ منیجر رسالہ "شمع" حسن منزل شاہ گنج اگرہ

ممیرا ورپے موتیون کا سفید سرمہ

مصنفہ جناب نامی گرامی ڈاکٹر آر کرائیٹ صاحب بہادر سی۔ آر۔ ایس فیلو آف کیمسٹری لنڈن۔ جسکی نسبت لندن کلکتہ پنجاب آگرہ میڈیکل کالج کے سند یافتہ ڈاکٹرون نوابون اور راجاؤن معزز حکیم صاحبان ڈپٹی کلکٹرون معزز یورپین انگریزون وغیرہ نے بعد تجربہ یہ لکھا ہے

ممیرا ورپے موتیون کا سرمہ

آنکھون کی بیماریون و ترقی بینائی کیواسطے مفید ہے اور سب سے بہتر زود اثر دوا ہے۔ ملک روس وافریقہ وغیرہ کے معزز ڈاکٹرون وہندوستان کے امور ڈاکٹرون حکیمون نے آنکھون کی بیماریون مین اور دوا کو چھوڑکر اس دوا کو استعمال کیا ہے۔

ہمارے سرمہ کا امتحان اور اسمین کامیابی

(۱) نگاہ اپ کرہا سرمہ لگانے سے دو ہفتہ مین روشنی بڑھ جائے گی اور جلد نقص دور ہونگے (۲) عینک کی ضرورت نہین رہتی (۳) دھندلا پڑھلکا آنسو بہنا۔ سرخی۔ کھجلی۔ سوزش۔ آنکھون کے سامنے اندھرا۔ پلکون کی اندرونی سرخی گوہانی دور ہوتی ہے (۴) کمزور نگاہ سے تاگا سوئی مین بہت جلد چھوڑ لیجئے (۵) پرباں۔ سُبل۔ جالا۔ بھولی۔ ابتدائی موتیا بند۔ ناخونہ۔ آنکھون کے سامنے دُودھ اسا آنا بند ہوجاتا ہے۔ لکھنے پڑھنے سے آنکھ کا تکان۔ درد وہبت جلد صاف کرتا ہے اور جملہ امراض چشم سے محفوظ رکھتا ہے۔ قیمت فی تولہ تین روپیہ محصول ڈاک ۵

ملنے کا پتہ:۔ منیجر نگم کمپنی نیا چوک کان پور

معدہ مین ریاح کی شکایت سے

فوری صحت

جب غذا کھانے کے بعد ہی درد وحبس ریاح وغیرہ کی تکلیف پیدا ہوجائے تو یہ اسبات کی پختہ علامت ہے کہ آپ کے معدے مین شوریت یا کھاری مادہ زیادہ پیدا ہوگیا ہے اس سے آپ فوراً ہی نجات حاصل کر لیجئے کیونکہ یہ بہت خطرناک ہوتا ہے

آپکے پیٹ مین خواہ کتنا ہی کھار یا گرانی کیون نہ ہو آپ دوسرے وقت کا کھانا نہایت شوق سے کھا سکتے ہین اور نہ اسکے بعد کسی قسم کے خطرہ کا کوئی اندیشہ باقی رہے گا - اگر آپکے پاس "بسورید میگنیشیا" ہو تو آپ اسے کسی قسم کی تکلیف یا شکایت شروع ہونے سے پہلے تھوڑی سی کھالین آپ اسکی آزمایش کر کے دیکھئے جو مزاج چاہے کھائیے اور اسکے بعد تھوڑی سی بسورید میگنیشیا استعمال کر لیجئے اس سے ہر قسم کے پیٹ کے درد کی شکایت فوراً رفع ہوجائے گی - اور پانچ ہی منٹ کے عرصہ مین بدہضمی کا بدترین حملہ دفع ہوجائے گا ہر شخص کو آج ہی بازار کے کسی دوکاندار یا دوا فروش سے بسورید میگنیشیا کا ایک پیکٹ (خواہ سفوف کی شکل مین یا گولیون کی صورت مین) خریدنا چاہئے - پھر معدہ کی تمام شکایات جادو کی طرح غائب ہوجائینگی -

تھوک فروشان

جی - اتھرٹن اینڈ کمپنی نمبر ۸ کلایو اسٹریٹ کلکتہ

جاب پریس کانپور

کے

ہاف ٹون بلاک زبان حال سے کارخانہ

کے اعلےٰ

ضاعی کی

تعریف کرتے ہین آپکو ہمارے کام کا نمونہ دیکھنا ہو تو

رسالہ زمانہ کانپور

جوبلی نمبر

ملاحظہ فرمائیے

اسکے بیشتر بلاک ہمارے بنائے ہوئے ہین

ہمارے یہاں اردو ہندی انگریزی چھپائی کا کام بہترین ہوتا ہے

رنگین سادہ تصاویر بھی نہایت احتیاط اور عمدگی سے چھپتی ہیں

کسی کام نہایت احتیاط سے حسب وعدہ ہر وقت ہوتا ہے نرخ مناسب ہے

اپنے آرڈر بھیجئے

مستہتر: منیجر جاب پریس بھنڈی بازار کانپور

جوبلی نمبر

زمانہ

جلد ۵۰ فروری سنہ ۱۹۲۰ء نمبر ۲

قطعۂ دعائیہ

(لسان القوم حضرت صفی لکھنوی)

"زمانہ" جسے جانتا ہے زمانہ — کہ حسنِ ادب کا ہے آئینہ خانہ
نکلتا ہے اب جوبلی نمبر اس کا — ترا شکر اے کارسازِ یگانہ
ہے پچیسویں سال اک جشنِ عشرت — بنے کلک سے موجزن شادیانہ
غنیمت ہے دورِ فلک میں غنیمت — جو ہاتھ آئے بہرِ مسرت بہانہ
یہ صوبے کا ہے مایۂ ناز پرچہ — ترانہ ہر اک اس کا دلکش ترانہ
مبارک اسے روز افزوں ترقی — کہ اردو ادب کا ہے نادر خزانہ
نگم ہیں مدیرِ سخن سنج اس کے — روشِ ابتدا سے وہی مصلحانہ
الٰہی رہے عطر بیزِ معانی — یہ زلفِ پریشانِ اردو کا شانہ
اک اعجاز اس کی دل آویز نظمیں — اک افسوں ہے اسکا پر معنی فسانہ
مسلمان ہندو۔ بہی خواہ دونوں — ابھی تک معاون ہیں شانہ بشانہ

صفی صدق دل سے دعا ہے یہ میری
زمانہ رہے قدر دانِ "زمانہ"

صفی لکھنوی

پیامِ محبّت

(۱)

سر رابندر ناتھ ٹیگور

زمانہ کے جوبلی نمبر کی اشاعت اور اس پچیس سالہ جشن جوبلی کے موقعہ پر میں نہایت مسرت کے ساتھ ایڈیٹر زمانہ کی خدمت میں مبارکباد کا پیام دے رہا ہوں۔ اس قابل قدر ادبی رسالہ کے ذریعہ جو کارِ خیر ہو رہا ہے اُس کی کامیابی کے لئے میں تہ دل سے دست بدعا ہوں۔"

Rabindranath Tagore ۱۶۔ فروری ۱۹۲۸ء

۲

مسٹر سی۔ ایف اینڈریوز

"مجھے یہ معلوم کرکے حد درجہ خوشی ہوئی ہے کہ پچیس سال تک مستقل مزاجی اور ثابت قدمی کے ساتھ ادب اُردو کی بہترین خدمت انجام دینے کے بعد بالآخر رسالہ زمانہ اپنا جوبلی نمبر شائع کر رہا ہے میں دست بدعا ہوں کہ اس نیک کام کے ساتھ تائید غیبی شامل حال رہے۔ میں اس کے مالک۔ مدیر اور تمام کارکنوں کو مبارکباد دیتا ہوں۔ اور ان کی کامیابی کا مستدعی ہوں۔ میری دعا ہے کہ رسالہ "زمانہ" آئندہ بھی اسی استقلال کے ساتھ اپنی مفید ادبی خدمات کا سلسلہ جاری رکھے اور اُسے دوسری جوبلی دیکھنا نصیب ہو۔"

C. F. Andrews.

(۳)

آنریبل رائے راجیشور بلی صاحب او۔ بی۔ ای وزیر تعلیم گورنمنٹ صوبہ متحدہ

"میں ایڈیٹر صاحب زمانہ کو اُس نمایاں کامیابی پر مبارکباد دیتا ہوں جو انھیں اُردو اخبار نویسی کی دنیا میں مقبول عام رسالہ زمانہ کی بدولت حاصل ہوئی ہے۔ گذشتہ پچیس سال سے زمانہ برابر ہر ماہ اردو لٹریچر کے دلدادگان کے لئے ایک نادر ادبی ضیافت مہیا کر رہا ہے اس اثنا میں اس نے جدید خیالات کی ترجمانی کی ہے اور زندگی کے اعلیٰ معیار پیش کئے ہیں۔ زمانہ کے قلمی معاونین میں ہندوستان کے ہندو مسلمان دونوں جماعتوں کے مشہور و معروف انشا پرداز شامل ہیں۔ اس کے نوع بہ نوع مضامین اور بلند پایہ نظم و نثر نے اس کے لئے اُردو اخبارات و رسائل کی صف میں ایک مستقل اور نمایاں جگہ حاصل کر لی ہے۔ اس نے عہد حاضرہ کی اسپرٹ کو اپنے میں جذب کر لیا ہے اور فرقہ وارانہ جذبات سے بالاتر ہو کر اردو زبان کی ادبی ترقی کے لئے ایسی اہم اور قابل قدر خدمات انجام دی ہیں جن پر ہر ایک نامور اخبار نویس بجا طور پر فخر کر سکتا ہے۔ میری دعا ہے کہ زمانہ کی عمر دراز ہو، وہ عوام ملک کی بیش از بیش خدمت کر سکے اور صحیح اور حق بجانب اخبار نویسی کی جو شہرت اسکے نیکنام ایڈیٹر کو حاصل ہو چکی ہے اس میں برابر اضافہ ہوتا رہے۔"

Rajeshwar Bali

(۴)

لالہ لاجپت رائے صاحب

"... میں ایک مدت تک "زمانہ" کو شوق سے پڑھتا رہا ہوں بلکہ گاہ گاہ اس کے لئے مضامین بھی لکھے ہیں... میں نے ہمیشہ زمانہ کی تحریروں سے حظ اُٹھایا ہے اور اس کے مذاق کو پسند کیا ہے ... اب بھی ملک کو سنجیدہ ادبیات کی بہت ضرورت ہے جو جزاً اس ماہوار رسالہ سے بوجہ احسن پوری ہو رہی ہے"

لاجپت رائے

دہلی۔ فروری ۱۹۲۸ء

(۵)

از آنریبل رائے بہادر لالہ سیتا رام صاحب صدر لیجسلیٹو کونسل صوبہ متحدہ

"میں اکثر رسالہ زمانہ کے خاص خاص مضامین وقتاً فوقتاً پڑھتا اور اُن سے مستفید و محظوظ ہوتا رہا ہوں۔ میرے خیال میں "زمانہ" اردو کے ماہوار رسالوں میں اپنی شان کا نرالا ہے اور چونکہ پرانا ہے اسلئے زیادہ قابل قدر ہے۔ زمانہ نے زمانہ کے بہت کچھ نشیب و فراز دیکھے ہیں شکر ہے کہ وہ زندہ ہے اور استقلال و سلامت روی سے ملک کی ادبی خدمت انجام دے رہا ہے۔ ایشور "زمانہ" کو زمانہ کے ساتھ سرسبز رکھے اور زیادہ سے زیادہ ترقی دکھلائے میں اس کے جشن جوبلی کے موقعہ پر اس کو مبارکباد پیش کرتا ہوں"

(۶)

جناب مسٹر اے ایچ میکنزی بی ایس سی۔ ڈائرکٹر سررشتہ تعلیم صوبہ متحدہ

"میں رسالہ "زمانہ" کی پچیسویں سالگرہ کے موقع پر آپ کو مبارکباد دیتا ہوں۔ اُردو ادب کی تاریخ کے لئے گذشتہ ربع صدی کا زمانہ ایک نئی جدوجہد کا زمانہ گذرا ہے۔ کسی اردو رسالہ کے لئے اس مدت مدید تک ملک کی مسلسل ادبی خدمات انجام دیتے رہنا کوئی معمولی کارگزاری نہیں ہے۔ رسالہ زمانہ نے اپنی ادبی خوبیوں اور وسیع النظری کی بدولت ایک خاص شہرت حاصل کرلی ہے اور مجھے پوری امید ہے کہ گذشتہ کی طرح آئندہ بھی وہ اردو ادب کی توسیع و ترقی میں نمایاں حصہ لیتا رہیگا"

الہ آباد
۱۳ فروری ۲۰ء

زمانہ اور ترقیِ اُردو

از خان بہادر سر شیخ عبدالقادر صاحب۔ بی۔ اے۔ ایم۔ ایل۔ سی بیرسٹر ایٹ لا۔

رسالۂ زمانہ کا جشن جوبلی، ادب اُردو کی ترقی کا جشن ہے۔ پچیس ۲۵ سال ہوئے یہ رسالہ کانپور سے شائع ہوا۔ اور آج اُس کے پچیس سال کے کارناموں کی خوشی منائی جارہی ہے۔ اس عرصے میں کئی رسالے نکلے اور کئی بند ہوئے طرح طرح کے مصائب اہل قلم پر آئے۔ بہت سے صحایئف مالی مشکلات سے دب کر رہ گئے۔ مگر آفریں ہے منشی دیانرائن صاحب نگم کی ہمتِ مردانہ پر کہ اُن کے عزم و استقلال میں فرق نہ آیا۔ اور انھوں نے تنہا اپنی کوشش سے ایک صدی کے چوتھے حصے تک نہ صرف اپنے لگائے ہوئے پودے کو زندہ رکھا، بلکہ اُس کی ایسی جانفشانی سے آبیاری کی کہ اس کے سب ہواخواہوں نے اسے بڑھتے اور پھلتے پھولتے دیکھا۔ یہ رسالہ بہت سی اور خوبیوں کے علاوہ ایک امتیاز خاص رکھتا ہے کہ جس انداز سے نکلا تھا اُسی انداز پر چل رہا ہے۔ اور اس کی صورت اور سیرت دونوں اپنی وضع اصلی پر قائم ہیں۔ کئی باتوں میں ترقی ہوئی، بہ حیثیت مجموعی کسی پہلو سے تنزل نہیں ہوا۔ مغربی ممالک میں تو کئی رسالے اور اخبار ایسے ہیں جو ایک صدی سے زیادہ کی قدامت پر ناز کر سکتے ہیں، مگر ہندوستان میں ابھی یہ بات بہت کم اخباروں یا رسالوں کو نصیب ہے۔ کہ عرصۂ دراز تک چلیں اور اپنا خاص انداز نباہ سکیں۔ اس لئے زمانہ ہر پہلو سے مبارکباد کا مستحق ہے، اور میں ادبِ اردو کے خادم کی حیثیت سے زمانہ کی خدمات کا اعتراف کرنا اپنا فرض سمجھتا ہوں۔ اُردو نثر کا آغاز صحیح معنوں میں اُنیسویں صدی عیسوی کے وسط سے ہے۔ گویا جب زمانہ نے جنم لیا تو ادبِ اُردو کے حصۂ نثر کی عمر پچاس برس تھی۔ گو اُس وقت اُردو نثر کی اکثر اعلیٰ تصانیف وجود میں آچکی تھیں اور یہ تسلیم کیا جاتا تھا کہ اردو کی ادبیات کا ذخیرہ ہندوستان کی دیگر مروجہ زبانوں کے مقابلے میں کسی سے کم نہیں مگر اردو کی حالت کچھ متزلزل سی تھی۔ وہ زبان جو ہندوؤں اور مسلمانوں کے میل جول کا نتیجہ اور اُن کے ملاپ کی بہترین یادگار تھی، محض اس لئے معتوب ہو رہی تھی کہ اس کے حروف فارسی کے حروف ہیں، یا مسلمان اس سے زیادہ رغبت رکھتے ہیں۔ لکھے پڑھے ہندو جو مدت سے اس زبان کو شمالی ہند کی مشترکہ مادری زبان سمجھتے تھے اور خوشی سے اس کی نظم و نثر پر طبع آزمائی کرتے تھے اس سے بیزار ہو رہے تھے۔ ہندی بھاشا اور خاصکر

ہندی حروف کے رواج کی تحریک زور سے جاری تھی اور اس کا نتیجہ یہ تھا کہ وہ ہندو اہل قلم جو اردو میں اچھی مہارت رکھتے تھے، اور جو اردو کے ذریعے سے اپنے خیالات بہت خوبی سے ظاہر کر سکتے تھے، اس زبان اور اس کے ادب سے کام لیتے ہوئے جھجکتے تھے۔ اُس زمانہ میں مجھے یہ خیال آیا کہ اگر ملک میں ایسے ادبی رسالے ہوں جن میں ہندو مسلمان دونو مضامین لکھیں، اور جھگڑے کی چیزوں سے بچکر اپنی زبان کی مشترکہ ادبیات کی خدمت کریں تو اُن سے ملک کو بہت کچھ فائدہ پہونچ سکتا ہے۔ چنانچہ میں نے رسالہ "مخزن" لاہور سے جاری کیا، اور یارانِ نکتہ داں کو صلائے عام دی کہ اس کے لئے مضامین لکھیں۔ جن مشہور انشا پردازوں کے نام ہندو اصحاب میں سے مجھے معلوم تھے اُن سے خاص طور پر درخواست کی کہ وہ میرا ہاتھ بٹائیں، اور میں اُن احباب کا ممنون ہوں کہ انھوں نے اس اہم ملکی اور قومی مقصد کی تکمیل میں مجھے امید سے بڑھکر مدد دی۔ مگر جو چند گوہر نایاب اس بے غرضانہ سعی میں مجھے حاصل ہوئے اُن میں "زمانہ" خصوصیت سے قابلِ ذکر ہے، اور میں اگر یہ کہوں کہ وہ اس سعی کا پہلا ثمر تھا تو بیجا نہ ہوگا۔ اور اب اس کی پختگی کو دیکھتے ہوئے یہ بھی بجا طور پر دعوے کیا جا سکتا ہے کہ وہ نہ صرف پہلا ثمر تھا بلکہ بہترین ثمر ثابت ہوا۔ مخزن کا ایک ورق جس پر چند نوجوان اور ہونہار طلبہ کی تصویریں یکجا چھپی تھیں جو اس وقت بی۔ اے کی جماعت میں اپنے اپنے کالجوں میں پڑھ رہے تھے۔ اس وقت بھی میری چشمِ تخیل کے سامنے ہے۔ اور کل کی بات معلوم ہوتی ہے کہ ان طلبہ میں ادب اُردو کا وہ سچا خادم اور ملک کا سچا ہمدرد بھی تھا جس کا نام رسالۂ زمانہ کے ورقِ اول پر پچیس سال سے لکھا جا رہا ہے۔

دیا نرائن صاحب نگم نے بی۔ اے پاس کرنے کے بعد سرکاری ملازمت یا وکالت یا کسی نفع بخش تجارت کی طرف رخ نہیں کیا، بلکہ صحافت اور اردو صحافت کی تکلیف دہ زندگی کو اپنے لئے پسند کیا اور آج پچیس سال کی محنت کے بعد وہ مالی اعتبار سے اس سے زیادہ طاقت نہیں رکھتے کہ نہایت سادہ طرز کی درمیانہ زندگی بسر کر سکیں۔ باوجود اس کے کہ اس اثنا میں انھوں نے روزانہ اخبار بھی نکالا اور کتابیں بھی شایع کیں مگر انھوں نے وہ کام کیا جو کئی بڑے بڑے مدعیان حبِ وطن نہیں کر سکے۔ آجکل ایثار اور قربانی کے لفظ ہر ایک کی زبان پر ہیں اور بہت لوگ ببانگ بلند ایثار کے دعوے کرتے ہیں مگر چند روز کا ایثار چند روز کی قربانی اسکے ساتھ واہ واہ اور ہائے وہو ملک کو راہ ترقی میں بہت دور نہیں پہونچا سکتی اگر ملک بڑھیگا اور ترقی کریگا تو ایسے دھن کے پکے شخصوں کی بدولت جو ایک مشن یا فن کو مستقل عزم سے اختیار کرکے اسکو سطح انجام دینگے جیسے دیا نرائن صاحب نگم نے اُردو ادب کی خدمت کو بنایا ہے

شناورانِ محبت تو سینکڑوں ہیں مگر جو ڈوب جائے وہ پکّا ہے آشنائی کا

وہ فنافی الادب کا درجہ حاصل کر چکے ہیں، اور یہی سب سے بڑی کامیابی ہے۔

آؤ ذرا دیکھیں کہ زمانہ کی اس محنت سے کیا کیا نتیجے نکلے۔ کسی مہینے کا پرچہ اٹھا کر دیکھئے تو معلوم ہو گا کہ اس کے مضمون نگاروں میں ہندو اور مسلمان دونو شامل ہیں۔ یوں تو جا بجا ہندو مسلم اتحاد پر زور دیا جاتا ہے مگر زبانی باتوں کے علاوہ عملی کوشش اس اتحاد کے لئے کہاں ہو رہی ہے۔ ادبیات کا چبوترہ ہی وہ چبوترہ ہے جہاں ہندو مسلمان خلوص سے اور بلا تصنع کے جا کھڑے ہو سکتے ہیں۔ اور نگم صاحب کی کوششوں سے اوراق زمانہ پچیس سال سے کم از کم سینکڑوں اہل قلم کو اس ملاپ کی شہادت دے رہے ہیں۔ اس تفریق اور ضرب اور تقسیم کے زمانے میں جمع کا حساب صرف ادبی رسالوں ہی میں ملتا ہے، اور اس لئے یہ بہت قابل قدر ہے۔ اس رسالہ کے خریداروں میں ہندو مسلمان دونوں شامل ہیں۔ گو میرے نزدیک اغلب ہے کہ ہندوؤں کی تعداد کسی قدر زیادہ ہو گی۔ خیر زیادہ ہوں یا برابر۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ پچیس سال سے اس رسالے کی بدولت اور بعض اور رسالوں کی بدولت جو ہندو مسلمانوں کی مشترکہ کوشش سے چلتے رہے ہزاروں بلکہ لاکھوں ہندوؤں نے اُردو مضامین نظم و نثر کا لطف اٹھایا اور اُن کی وہ مغائرت جو نہ سوچنے اور نہ سمجھنے کے سبب سے انھیں اردو جیسی لطیف زبان کی دلچسپیوں بلکہ اپنے ملک کے بہترین ورثہ سے محروم کر رہی تھی ہمدردی سے بدل گئی۔ یہ ایک ایسا بڑا کام ہے جس پر زمانہ جس قدر ناز کرے کم ہے اور اس سے نہ صرف زبان اُردو ادب کی خدمت ہوئی بلکہ ملک کی عام بہتری کے لئے بھی یہ ایک معقول اور عملی خدمت ہے۔

اس رسالے کی کوششوں کا جو خالص ادبی حصہ ہے اس کا احسان بھی زبانِ اردو پر مستقل طور پر رہے گا۔ جن ادیبوں سے ہم رسالہ زمانہ کی بدولت روشناس ہوئے اُن کی تعداد بہت ہے۔ مگر ایک نامور ادیب جن کا ذکر خاص طور پر کرنا واجب ہے پنڈت برج نرائن چکبست آنجہانی ہیں۔ افسوس کہ وہ ہمیں بے وقت داغ مفارقت دے گئے۔ مگر ان کے گراں بہا تنقیدی مضامین، اُن کی دلکش نظمیں، ان کی شگفتہ تحریر نثر ہمارے پاس ہیں اور مدتوں ادب اردو کا مایۂ ناز رہیں گی۔ کاش وہ آج زندہ ہوتے اور جس رسالے سے انھیں ایسی گہری دلچسپی تھی۔ اس کی جوبلی دیکھتے۔

"زمانہ" کی خصوصیات میں ایک یہ بھی ہے کہ "زمانہ" میں سیاسیات کا پہلو بھی ملحوظ رکھا گیا۔ اور اس کے مضمون نگار سیاسی معاملات پر بھی وقتاً فوقتاً لکھتے رہے۔ جب تک رسالہ مخزن میرے ہاتھ میں تھا کئی دفعہ نگم صاحب سے میری خط و کتابت اس سیاسی حصے کے متعلق ہوتی رہی۔ نگم صاحب چاہتے تھے کہ مخزن میں بھی کچھ حصہ سیاسیات کے لئے رکھا جائے، اور میں کہتا تھا کہ "زمانہ" کو بھی سیاسیات سے الگ رکھیں

تو بہتر ہے۔ میرا خیال یہ تھا کہ کوئی چیز ایسی نہ ہو جو ادبی اتحاد میں خلل انداز ہو سکے۔ اُن کا منشا یہ تھا کہ ادبی خدمت کے ساتھ ساتھ سیاسی معلومات میں اضافہ ہوتا رہے۔ میں اب تک ادبیات میں رسم احتیاط کا قائل ہوں مگر اس کے ساتھ "زمانہ" کو اس داد کا مستحق سمجھتا ہوں کہ اس کی تحریریں عموماً سنجیدہ اور متین رہی ہیں اور اُن کا لہجہ ایسا رہا ہے جو اُن لوگوں کو بھی ناگوار نہ ہو جو لکھنے والے کے ہم خیال نہ ہوں اور یہی رنگ ایک غیر جانبدار ادبی رسالے کے لئے موزوں ہے۔ گویا "زمانہ" نے سیاسیات میں سبق دینے کی کوشش کی ہے اور جانبدارانہ جنگ سے علیحدہ رہا ہے۔

"زمانہ" کی گذشتہ جلدوں کے مجموعہ میں اُردو کے دورِ جدید کی تازہ ترین ترقی کے نمونے نظم و نثر میں اس کثرت سے موجود ہیں کہ اگر اُن کو اکٹھا کیا جائے تو ادب اردو کا ایک دل لبھانے والا گلدستہ تیار ہو جائے اور میں یہ تحریک پیش کرتا ہوں کہ اڈیٹر صاحب "زمانہ" ایک انتخاب زمانہ شائع کریں۔ تاکہ اردو نظم و نثر کے وہ لازوال ٹکڑے جو وقتاً فوقتاً زیب اوراقِ زمانہ ہوتے رہے ہیں۔ محفوظ ہو جائیں اور اس جشن جوبلی کی موزوں یادگار رہوں۔

عبدالقادر

زمانہ

آقائے سخن حضرت وسیم کی نقاد نظر میں

جس کا مشتاق اِک زمانہ ہے
اِس زمانہ میں وہ زمانہ ہے
کیوں نہ گرویدہ ہو زمانہ وسیم
کہ زمانہ کا اب زمانہ ہے

علم الکتابت
یا
ابجد کی تاریخ

(از مولانا محمد عبدالرزاق صاحب۔ مصنف البسرا مکہ وغیرہ)

۱۔ کتابت کا تعلق زبان سے ہے

انسان جس وقت عالم وجود میں آتا ہے تو وہ روتا ہوا آتا ہے، اور یہ پہلی آواز ہے جس سے نطق یا زبان کا آغاز ہوتا ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ انسان کو آفرینش کے ساتھ ہی گویائی عطا ہوتی ہے، اور وہ بے زبان یا گونگا پیدا نہیں ہوتا ہے۔ اب اس کی ابتدائی حالت پر غور کرو کہ جب یہ اِس عالم میں آیا اور اُس نے اپنے ہم جنسوں میں رہنا شروع کیا تو ادائے جذبات اور اظہارِ خیالات کا کیا ذریعہ ہوگا؟

تاریخ سے ظاہر ہے کہ انسان نے پہلے اشاروں سے کام لیا، پھر آواز سے، اور رفتہ رفتہ آواز سے مفرد الفاظ بنے۔ پھر یہ الفاظ جملے ہوگئے۔ گویا قطروں سے نہریں بنیں اور نہریں بڑھتے بڑھتے سمندر ہوگئیں۔

خلاصہ یہ ہے کہ آغاز آفرینش میں باہمی میل جول اور وسعتِ تمدن سے زبان کا نشو و نما ہوا۔ اور سیکڑوں منزلیں طے کرنے کے بعد ہر قوم میں ایک مستقل زبان پیدا ہوئی۔ اور اس وصف میں انسان حیوانات سے بڑھ گیا کیونکہ حیوان کے جس قدر انواع ہیں اُن میں ادائے مطلب کے لئے صرف آوازیں ہیں، اور اُن کی کمزور قوت عقلی وضع الفاظ پر قادر نہیں ہے۔ اور نہ اُن میں نقل و محاکات کا مادّہ ہے۔ اس اصول پر طوطے اور پہاڑی مینا کی بولیاں اس کلیہ سے خارج ہیں کیونکہ وہ مصنوعی زبان ہے۔ اور یہ جانور رٹے ہوئے الفاظ کو دُہرایا کرتے ہیں۔

یہ طے شدہ مسئلہ ہے کہ زبان کا آغاز اشارات سے ہوا، اور اُس کی قوی دلیل یہ ہے کہ جو انسان مادر زاد بہرے یعنی گونگے ہوتے ہیں وہ اشارات ہی سے ادائے مطلب کرتے ہیں۔ اشارات کے بعد آواز کا درجہ ہے چنانچہ انسان کی ہزاروں آوازیں ہیں، ان میں کچھ تو اضطراری ہیں جو خود بخود یعنی بلا ارادہ نکلتی ہیں، اور ایک خاص جذبہ کو ظاہر کرتی ہیں، اور کچھ اختیاری ہیں جیسے کھانسنے، چھینکنے، تھوکنے اور

سیٹی بجانے کی آوازیں ہیں۔ ان میں سے ہر آواز ایک خاص مفہوم ادا کرتی ہے۔

محققین السنہ نے لکھا ہے کہ تمام دنیا کی زبانوں میں بہت بڑا حصہ الفاظ کا آوازوں سے مرتب ہوا ہے[۱] خصوصاً عربی زبان میں ایسے ہزاروں الفاظ موجود ہیں۔ مثلاً تف (تھوکنے کی آواز) وائے (رنج وافسوس کی آواز) آہ، اُف (درد و تکلیف کی آواز) ان الفاظ سے سیکڑوں لغت و محاورات وضع ہوئے ہیں علاوہ بریں قدرتی آوازوں سے بھی مختلف لغت پیدا ہوتے ہیں۔ مثلاً صریر (قلم کی آواز) ہدیر (کبوتر کی غٹرغوں) غاق (کوّے کی آواز) بقبقہ (صراحی کی آواز)

انسانی آواز کے علاوہ ہزاروں غیر ذی روح آوازیں ہیں مثلاً بادل کی گرج، بجلی کی کڑک، چکّی کی گھڑگھڑاہٹ وغیرہ۔ چنانچہ انسان کے کان میں جب آوازیں آئیں تو اُس نے انھیں آوازوں سے مشابہ الفاظ بنالیے، اور ہر آواز کے لئے ایک خاص لفظ وضع کیا۔ چنانچہ انھیں الفاظ کے مجموعہ کا نام لُغت ہے۔ اسی طرح تمدنی ضرورت سے ہر قوم میں لاکھوں الفاظ پیدا ہوگئے۔ اور چونکہ اشارات کی تعداد محدود تھی اور الفاظ غیر محدود تھے جس کا یاد رکھنا قوتِ حافظہ کی طاقت سے باہر تھا اس ضرورت نے انسان کو حروف (ایک خاص علامت) کی ایجاد پر مجبور کیا، اور یہی حروف کتابت کی بنیاد ہیں۔ اور بعض اقوام نے حروف کا کام تصاویر سے لیا۔

۲۔ کتابت کی تاریخ علم الانسان (انتھروپالوجی) کی تحقیقات کے سلسلہ میں ہزاروں مفید باتیں دریافت ہوئی ہیں اور ہر روز تمدن کے مختلف شعبوں کی حقیقت واضح ہوتی جاتی ہے۔ چنانچہ انھیں مسائل میں ایک علم الکتابت (رسم الخط کے قواعد) بھی ہے۔

جب انسان حیوانیت کے مرتبہ سے ترقی کرکے انسانیت کے درجہ تک پہونچا اور خلعت علم سے مشرف ہوا تو اظہار خیالات کے لئے اُس کو کتابت (تحریر) کی ضرورت محسوس ہوئی۔ اور جب نسلیں ترقی کرکے ایک مقام سے دوسرے مقام پر ہجرت کرگئیں اور نئے نئے واقعات ظہور پذیر ہوئے جن کا محفوظ رکھنا فرض تھا تب کتابت کی ضرورت اور بھی شدید ہوگئی۔ آخر بڑے غور و فکر کے بعد نقاشی اور صورت گری سے کام لینا پڑا مثلاً ایک بادشاہ کو شیر نے مار ڈالا، یہ عظیم الشان واقعہ تھا۔ لہذا پتھر پر ایسی تصویر بنائی کہ ایک شیر انسان سے لڑ رہا ہے اور اُس کے جسم سے خون جاری ہے۔ چنانچہ اسی اصول پر شجر و حجر کی تصویریں بناتے تھے، جس سے ہر مادی صورت کا اظہار ہوتا تھا۔ اور اظہار خیالات کا یہ سب سے پہلا سادہ دَور تھا جسکا نام تاریخ میں "دورِ صوری مادی" ہے۔ چنانچہ اس قسم کے مفہوم ادا کرنے کے لئے خاص رموز اور اشارات تجویز کئے گئے،

---

[۱] ملاحظہ ہو کتاب المقدمہ (فلسفہ زبان عربی) مصنفہ جسٹس کرامت حسین مرحوم۔

مثلاً اظہار محبت کے لئے کبوتر کی تصویر کھینچی اور یہ ایک صحیح احساس تھا۔ کیونکہ کبوتر عشق بازی میں (جب وہ کبوتری کے گرد چکر کاٹ رہا ہو) عشق و محبت کا مرقع ہوتا ہے۔ اسیطرح اظہار دشمنی کے لئے سانپ کا کنڈل بنایا گیا۔ نیلگوں آسمان کے لئے نصف قوس ⌒ بنائی۔ ستاروں کے لئے قوس میں قمقمے لٹکائے۔ یہ کتابت کا دوسرا دور تھا۔ جس کا نام "دور صوری معنوی" ہے۔ لیکن یہ طرز کتابت بڑے غور و فکر کا محتاج تھا۔ اور ہر ہر واقعہ کے اظہار کے لئے متعدد تصویریں بنانا پڑتی تھیں۔ جس کے نمونے قدیم مصری کتبات اور تاریخوں میں موجود ہیں۔

عرب کی بعض وادیوں میں بھی ایسے نمونے موجود ہیں، مثلاً ایک پتھر پر اونٹ کے محمل کی تصویر ہے، جس کی نکیل ایک بدوی کے ہاتھ میں ہے۔ یہ تصویر ظاہر کرتی ہے کہ صرف ایک شخص حج کو گیا ہے۔ بعض تصاویر اس طرح پر ہیں کہ اونٹ پر ہودج ہے اور اُس کے سامنے کشتی کی تصویر ہے۔ جس کا یہ مطلب ہے کہ ایک شخص مع اہل و عیال براہ خشکی و سمندر حج کو روانہ ہوا ہے۔ چنانچہ وادی المکاتیب میں ڈیڑھ کوس تک مختلف جذبات و مناظر کی تصاویر کا سلسلہ ہے لہذا اس دشواری کے مٹانے کے لئے انسان نے اپنی ذہانت سے حروف ایجاد کئے، اور دنیا کی مختلف اجسام و اشکال سے مختلف نمونے حروف کے بنائے۔ اور ان اشیاء کی صورتوں سے صرف اس کا پہلا حرف مراد ہوتا تھا۔ اس دور کا نام "دور صوری حرفی" ہے۔ لیکن یہ تمثال کشی اور مصوری دنیا کے ہر واقعہ کے اظہار سے قاصر تھی۔ تاہم انسان کی غیر معمولی سعی اور تجربات نے ان مشکلات کو حل کر دیا، اور الف سے یائے تحتانی تک سب حروف نکل آئے۔ اور حروف نے تصویر کشی کی زحمت کو مٹا دیا۔ بعد ازاں حروف کی ترتیب سے لفظ اور پھر الفاظ سے جملے بننا شروع ہو گئے۔ یہ چوتھا اخیر "حرفی دور" تھا۔ جو اقوام عالم میں جاری ہوا۔ اور یہ واقعہ تقریباً[۵۱] سنہ ۶۶۰ قبل مسیح کا ہے۔ اس کے بعد تدریجاً حسب ضرورت ترمیم و اضافہ کا عمل جاری رہا۔

ہم کو اس مضمون میں عربی کتابت اور اس کی شاخوں سے بحث کرنا ہے۔ لہذا دیگر اقوام کی کتابت سے کوئی تعلق نہ ہوگا۔ کیونکہ یہ ان علماء کا کام ہے جو اپنی اپنی زبانوں پر جداگانہ بحث کریں۔

دنیا میں جس قدر خط ایجاد ہوئے ہیں وہ صرف دو قسم کے تھے۔ ایک اصلی دوسرے فرعی۔ اصل سے وہ خطوط مراد ہیں جن کو انسان کی طبیعت نے ضرورتاً ایجاد کیا اور اس قسم کے مکمل خطوط چار ثابت ہوئے ہیں

۱۔ مصری خط　دیگر اقوام کے مقابلہ میں مصری[۵۲] خط نہایت قدیم ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی ولادت

[۵۱] سیاحۃ المعارف نوفل آفندی صفحہ ۶۱ مطبوعہ بیروت۔
[۵۲] تاریخ الادب حفنی بک ناصف و تاریخ تمدن مصری شکری پاشا مطبوعہ مصر

(۳۹۶۰ قبل مسیح) سے ۲۰ یا ۲۵ صدی قبل مصر میں خط تمثال (تصاویر) جاری تھا اور اُس کی تین قسمیں تھیں۔

الف۔ ہیروغلیفی یا خط تمثال | یہ یونانی لفظ ہے جو ہیروس اور غلی فاؤس سے مرکب ہے۔ اول لفظ کا ترجمہ ہے "شے مقدس" اور دوسرے کے معنی ہیں "نقش و تصویر"۔ لہٰذا ہیروغلیفی کا ترجمہ "حروف مقدس" ہوا۔ ہیروغلیفی عربی لہجہ ہے جس کو انگریزی میں ہیروگلیف، ہیروگلے فکس اور ہیروگلیفک کہتے ہیں۔

یہ حروف اپنی تمثالی صورت میں دائیں سے بائیں کو اور کبھی اس کے برعکس لکھے جاتے تھے۔ ان کی کتابت پتھروں اور لکڑیوں پر ہوتی تھی تاکہ یہ مقدس صحیفے دنیا میں ہزاروں برس تک باقی رہیں۔ اس خط کے کاتب مندروں کے پجاری اور پیشوایانِ مذہب تھے، اور مذہبی احکام کی کتابت اسی خط میں ہوتی تھی۔ لہٰذا یہ خط مقدس کہلایا۔ یہ حروف (یعنی تصویر) اعلیٰ خوشنویسی سے لکھے جاتے تھے جس کو اصطلاحاً نستعلیق کہہ سکتے ہیں۔ اہرام مصر اور ممفس کے مندروں میں جس قدر کتبات ہیں وہ سب ہیروغلیفی ہیں۔ اس خط کی تصویریں اور نقوش بالذات یا بالعرض مطالب پر دلالت کرتی تھیں۔ چنانچہ یہ کتابت تیسری صدی عیسوی تک مصر میں جاری تھی۔ اور یوسف علیہ السلام کے زمانہ میں بھی مصر میں یہی خط رائج تھا، اس خط میں بڑی دقت یہ تھی کہ مختصر الفاظ کے لئے بھی متعدد تصویریں کھینچنا پڑتی تھیں۔

(ب) ہیراطیقی ہیراٹیک | یہ بھی دائیں جانب سے بائیں کو لکھا جاتا تھا۔ اس کا ماخذ ہیروغلیفی تھا۔ اور اپنی اصل سے بہت مختصر تھا۔ یہ کاغذ پر لکھا جاتا تھا، اور یہ کاغذ بھی مصریوں کا ایجاد تھا۔ جو ایک گھاس سے بنایا جاتا تھا۔ جس کا نام مصری زبان میں پاپیرس[۵۱] ہے۔ اس کے ریشے نرم ہوتے تھے اور نفشہ کی طرح نہایت باریک پتیاں ہوتی تھیں۔ عرب کی قدیم تاریخوں میں اس کاغذ کا نام بردی ہے۔ قدیم اناجیل اسی کاغذ پر تھیں لیکن یہ بہت کمزور تھا اس وجہ سے یہ تمام نسخے ضائع ہوگئے۔ یہ خط عدالتی اور دفتری تھا جسکو خطِ شکستہ کہنا چاہیئے۔ اور نہایت تیزی سے لکھا جاتا تھا۔ یہ خط تمثالی نہ تھا بلکہ حرفوں میں تھا، حضرت ابراہیم علیہ السلام سے پانسو برس قبل کے کتبات اسی خط میں موجود ہیں۔ اس میں ۲۵ حروف تھے۔ ہیراٹک کا دوسرا نام کرسیو بھی ہے۔ جس کے لغوی معنی خمیدگی کے ہیں۔ چونکہ یہ حروف ٹیڑھے اور معوج ہوتے تھے اس لئے ہیراٹک کہلائے۔ یہ خط تصاویر سے اخذ کیا گیا تھا۔

---

[۵۱] تاریخ تمدن مصر جرجی زیدان و انتھروپولوجی ٹائلر صفحہ ۱۷۶

(ج) دیوطیقی | اس خط کو اصطلاحاً "قلم العام" کہنا چاہیئے۔ اس کا ماخذ ہیراٹک تھا۔ اور بہت ہی مختصر تھا۔ اور موجودہ حروف تہجی سے قریب تر تھا جس کو اہل فنیقیہ نے اور واضح کیا۔

مصر میں جب سولھواں[۱] خاندان حکمراں تھا اس زمانہ میں یہ خط بڑے عروج پر تھا اور عموماً خط و کتابت اسی میں ہوتی تھی۔

مصریوں نے یونانی خط میں دیوطیقی خط کے بعض حروف شامل کرلئے تھے۔ کیونکہ یونانی حروف میں آوازوں کی تعبیر کے لئے کوئی حرف موجود نہ تھا۔ اور آیندہ زمانہ میں یہی رسم الخط مختلف خطوط کا ماخذ قرار پایا۔ منجملہ اس کے فینقی خط سب سے زیادہ مشہور ہے۔ اور عربی حروف تہجی مصر کے انھیں خطوط اور فینقی خط سے ماخوذ ہے۔ اور موجودہ عربی خط (نسخ) مختلف شکلوں کی تبدیلی کے بعد ظہور پذیر ہوا ہے۔

جب مصر میں یونانی حکومت شروع ہوئی تو یہ ہر سہ خط فنا ہوگئے۔ اور قبطی خط (مصریوں کا عام خط) سے ملکر قدیم یونانی حروف جاری ہوئے جس میں ۲۷ حروف تھے۔ پھر تیرھویں صدی ابراہیمی میں رومیوں نے یونانی حروف میں تبدیلی کرکے لاطینی حروف بنائے۔

قبطی خط بھی یونانی حروف سے مرکب تھا، اور عہد اسلام تک جاری رہا اور ہنوز کسی قدر موجود ہے۔

سنہ ۸۶ھ[۲] میں جب عبدالله بن عبدالملک ولید بن عبدالملک کی طرف سے مصر کا گورنر ہوا تو قبطی خط عربی خط میں منتقل ہوگیا اور قبطی زبان بھی انحطاط پر آگئی اور صرف مندروں میں باقی رہ گئی۔

۲۔ فنیقی خط | فنیقی سے اہل فنیقہ (فینیشیہ) مراد ہیں، یہ وہ قوم تھی جو کسی زمانہ میں بحرین اور خلیج فارس[۳] پر آباد تھی۔ شہر قطیف سے شرجہ تک ان کی آبادیاں تھیں۔ لیکن جب ایک فاتح قوم نے ان کو اپنے مرکز سے بیدخل کیا تو یہ عمان و نواح یمن میں جاکر آباد ہوئے۔ اس علاقہ میں انھوں نے صور[۴] و صَیدا دو شہر آباد کئے جس کے آثار ہنوز موجود ہیں۔ لیکن دوسرے انقلاب میں یہ لوگ اس علاقہ سے بھی خارج کئے گئے۔ اور ارض کنعان (شام۔ سیریا) میں ساحل بحر ابیض (بحر الروم) پر (مقابل جبل لُبنان) جاکر آباد ہوئے۔ اور یادِ وطن

---

[۱] مصر میں مسلسل ۳۴ خاندان ہوئے ہیں جن کا عہد حکومت ۵۰۰۴ ق م سے ۳۳۲ ق م تک رہا ہے۔

[۲] ہجری سال سولھویں تاریخ جولائی ۶۲۲ء سے شروع ہوا ہے۔ اگر سنہ ہجری سے سنہ عیسوی معلوم کرنا چاہو تو سنہ ہجری میں سے فیصدی ۳ عدد منہا کرکے باقی کو ۵۷۱، ۶۲۱ میں جمع کردو وہی سال عیسوی ہوگا۔

[۳] انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا میں لفظ سام اور فنیقیہ کی تفصیل دیکھو۔

[۴] صور عمان میں اور صَیدا یمن کے جنوب بین زبید و تعز آباد تھا۔ قدیم اٹلسوں میں علامات موجود ہیں۔

میں انھوں نے ساحل مذکور پر از سر نو صور (ٹائر) و صیدون (سیڈان) آباد کئے۔ جو آج بھی موجود ہیں۔ عرب صیدون کو صیدان کہتے ہیں، یہ صور سے چھوٹا تھا اور صیدون کے معنی شکار ماہی کے ہیں۔

اس قوم کی زبان آرامی تھی، جو عربی کی بہن ہے۔ کیونکہ آرامی قوم (آرام بن سام بن نوح کی اولاد) بھی ساحل بحرین پر عربوں کے ساتھ آباد تھی، اور آرامی عنصر غالب تھا۔ چنانچہ فینیقی خط اول آرامی تھا، جسکو انھوں نے اپنے پڑوسیوں سے سیکھا تھا۔ اور ارض کنعان میں جاکر انھوں نے مصریوں کے خط کا چربہ اُتارا تھا۔ اور خود کوئی تجمی ایجاد نہیں کی تھی۔ بلکہ مصر کے خط نستعلیق اور شکستہ کو سامنے رکھکر بادنیٰ تغیر اسکو جاری کیا تھا۔ (نقشہ ملاحظہ ہو) پھر دونوں کو ملاکر ایک نئی شان پیدا کی۔ اول آرامی اور فینیقی خط میں کوئی فرق نہ تھا البتہ زمانۂ مابعد میں بہت فرق ہوگیا۔ اور سب سے بڑا تغیر یہ تھا کہ آرامی خط میں زاویہ دار حروف کے سرے کھل گئے اور اکثر حروف ایک دوسرے سے منفصل ہوگئے۔ یہ کل ۲۲ حروف تھے۔ پھر یہ خط ممالک ایشیا میں پھیلنا شروع ہوا اور حسب ذیل شاخوں میں تقسیم ہوگیا۔ مسند حضرموتی۔ مسند ثمودی۔ مسند لحیانی۔ مسند حمیری سبائی (یہ سب عربی قبائل ہیں) حبشی۔ ایتھوپی۔ غازی۔ (حبش کا قبیلہ غاز) ان سب کی شان قریب قریب ہے۔ اور یہ خطوط فرعیہ کہلاتے ہیں اور شمالی عرب کے خطوط ہیں۔

خط آرامی کی دو قسمیں تھیں، جو قدیم خط ہے اس کے حروف منفصل ہیں اور جدید کے حروف متصل ہیں، اور یہ وہ شان ہے جو خط حمیری سے قریب تر ہے۔ اور ان کے کتبات موجود ہیں۔ فینیقی قوم نے دنیا کو اصول تجارت سکھائے۔ اور یونانیوں، کلدانیوں اور یہودیوں کو فن کتابت کی تعلیم دی۔

۳۔ خط مسماری
مبخی۔ پکانی۔ اشقینی۔ کنی فارم

اس خط کے حروف آہنی کیل یا تیر کے مشابہ تھے اور بالکل سیدھے تھے، لہذا ان ناموں سے موسوم ہوئے۔ یہ خط بابل اور اشور (اسیریا) میں جاری تھا۔ جس کو کلدانیوں (اقوام عراق عرب) نے فینیقیوں سے سیکھا تھا۔ اس خط کی ابتدا بابل میں پانچویں صدی قبل ابراہیم علیہ السلام ہوئی تھی۔ خط مسماری کے نمونے قدیم کتبات میں موجود ہیں۔ ۱۹۰۱ء میں شہر شوش میں عہد حمورابی (قدیم خاندان ۲۲۰۰ ق م) کا پورا قانون سلطنت جس میں ۲۸۳ دفعات ہیں اسی خط میں تھا۔ یہ قانون انگریزی اور عربی میں ترجمہ ہوکر چھپ گیا ہے۔ اور بابل میں ہزاروں کی تعداد میں پختہ اینٹیں نکلی ہیں جن پر یہ حروف منقش ہیں۔ دراصل یہ اشوربنی پال کا گلی کتب خانہ تھا جو ۶۵۰ء قبل مسیح میں جمع کیا گیا تھا۔ اس کتب خانہ میں نجوم۔ عقائد۔ ادعیہ (گنڈے تعویذ) قانون۔ لغت، صرف و نحو

۵۴ تفصیل کے لئے دیکھو کتاب الفہرست ابن ندیم و تاریخ ادب حفنی بک ناصف و قدیم جغرافیہ عرب۔

ادر ادب کی کتابیں تھیں۔ اور ایک حصہ شاہی فرامین کا تھا۔ ۱۸۶۰ء میں اسپیگل جرمنی نے اس خط کو پڑھا اور اس کی صرف و نحو مرتب کی۔ تخت جمشید۔ بے ستون شوش کرمان شاہان کی قدیم عمارات میں جس قدر کتبات ہیں وہ سب اسی خط میں ہیں (تفصیل کے لئے سفرنامہ میرزا فرصت شیرازی و قدیم نقش ایران دیکھنا چاہیئے)

یہ خط بھی ابتدا میں تصویری تھا، بعد میں پیکانی ہوگیا۔ جس کا قدیم ترین کتبہ (۳۸۰۰ ق۔م) برٹش میوزیم لندن میں موجود ہے۔ اس خط میں ۲۳ حروف ہیں۔ لیکن بعد میں اختلاف حرکت سے حروف کی صورت میں تبدیلیاں ہوئیں اور اب ان کی تعداد ۵۰ تک پہونچگئی ہے۔

خط مسماری کے چند حروف بطور نمونہ حسب ذیل ہیں۔

الف (ا) ≺ بے (ب) ≺ تے (ت) ≺

مشہور ہے کہ صحائف ابراہیم علیہ السلام بھی اسی خط میں تھے، لیکن یہ تحقیقات ہنوز غیر مکمل ہے

۳۔ خط حیثی | حیثی ایک قوم تھی جو آغاز تمدن کے دور میں شام اور ایشیائے کوچک میں آباد تھی۔ فراعنۂ مصر ان کے ہم عصر تھے۔ لیکن قبل ولادت مسیح یہ قوم فنا ہو چکی تھی۔ اشوریوں اور مصریوں سے انکی معرکہ آرائیاں رہتی تھیں۔ اس خط کے کتبات شہر حماۃ (شام) میں ملے ہیں۔ یہ بھی مصری خط کی طرح تصویری تھا۔ لیکن مصری تصاویر کے مقابلہ میں یہ تصویریں بھدی تھیں۔

۴۔ خط چینی | چین میں بھی کتابت کا رواج بہت قدیم ہے۔ یہ خط اوپر سے نیچے کو لکھا جاتا ہے۔ کیونکہ چینیوں کے عقائد میں فیضان الٰہی کا نزول بلندی سے پستی کی طرف ہوتا ہے۔ یہ رسم الخط عربوں میں مشجّر کہلاتا ہے۔ جاپانی اور قدیم مغلی خط اسی کی شاخیں ہیں۔ آتشبازی کے پٹاخے جو چین سے آتے ہیں اور اُسپر جو عبارت ہوتی ہے وہی چینی خط ہے۔ چنانچہ دنیا کے قدیم مستقل اور اصلی خط یہی چار تھے۔ جن سے خط عربی کی ایجاد ہوئی ہے۔

۵؎ ہر چار خطوط کے علاوہ عربی خط کو سریانی اور نبطی خطوط سے بھی تعلق ہے۔ سیریا کی ایک قدیم قوم تھی جس کو کلدانی اور بابلی بھی کہتے ہیں۔ یہ دجلہ اور فرات کے مابین آباد تھی، اس ملک کو اب میسوپوٹامیہ (الجزیرہ) کہتے ہیں۔ یہ سلاطین، نمرود کے لقب سے مشہور تھے۔ بخت نصر (متوفی ۵۶۰ ق۔م) بھی انھیں میں تھا۔ سریانی خط کی تین قسمیں تھیں جن میں سب سے واضح اور روشن سطرنجیلی تھا۔

نبطی بھی عرب تھے۔ (از نسل قیدار بن اسمٰعیل بن ابراہیم علیہ السلام) جو جزیرۃ العرب کے شمال میں آباد تھے۔ نبطی خط کو قبیلہ بنی لخم نے جو شرجیرہ میں آباد تھے مہذب کیا جس کی اخیر اصلاح کوفہ میں ہوئی۔

سطرنجیلی اور نبطی حروف تہجی نقشہ میں ملاحظہ ہوں۔ ان میں بھی ۲۲ حروف تھے۔

۳۔ کتابت کا رُخ | کتابت کا ابتدا میں کوئی خاص نظام نہ تھا۔ یونانی کبھی بائیں سے دائیں جانب لکھتے تھے اور کبھی اس کے برعکس۔ چنانچہ ممالک یورپ میں بائیں جانب سے شروع کرتے ہیں۔ اور اس کا عقلی سبب یہ لکھا ہے کہ خون کا دوران قلب سے شروع ہوکر بائیں جانب جاتا ہے۔ اور نیز قلب عقل کا مرکز ہے۔ اس وجہ سے کتابت بائیں جانب سے مناسب ہے۔ عرب اور دیگر اقوام سامیہ (سامیٹک اقوام) دائیں جانب سے لکھتی تھیں۔ اُن کا مقولہ تھا کہ حرکت طبعی دائیں ہاتھ سے شروع ہوتی ہے۔ اور انسان جب کسی شے کو اٹھاتا ہے تو اس کی ابتدا دائیں ہاتھ سے ہوتی ہے۔ اور رفتار میں بھی پہلے دایاں قدم سبقت کرتا ہے۔ لہٰذا کتابت کا آغاز دائیں جانب سے فطرت انسانی[۵] کے مطابق ہے۔

عربی۔ سریانی۔ عبرانی دائیں جانب سے لکھی جاتی تھی، اور رومی۔ یونانی۔ قدیم فارسی بائیں جانب سے۔ چنانچہ یہی اصول ان زبانوں کی شاخوں میں رہا۔

۴۔ حروف تہجی ابجد کی ایجاد | ارباب مذہب کا قول ہے کہ تہجی کے موجد حضرت شیث بن آدم علیہ السلام یا حضرت ادریس ہیں۔ اور خط بھی علم کی طرح الہامی ہے۔ انکار کی کوئی وجہ نہیں ایسا ہی ہوگا۔ لیکن آج دنیا میں اس قدیم خط کا کوئی نمونہ موجود نہیں ہے۔ جو ان مقدس ہستیوں سے منسوب ہو، لہٰذا یہ بحث ہی بیکار ہے۔ تاریخ اقوام سے ظاہر ہے کہ جب فنیقی قوم کا مصریوں سے سلسلۂ تجارت شروع ہوا تو اُن کو کتابت کی ضرورت محسوس ہوئی۔ اور اُنھوں نے مصری خطوط کا استعمال سیکھا۔ اور مصری ابجد سے ۱۵ حروف لئے باقی ۷ حروف خود ایجاد کئے۔ اور ۲۲ حروف کی جداگانہ شکلیں بنائیں، اور ہر حرف کا نام قدیم مصری حروف سے اخذ کیا۔ مثلاً بیل کا کلّہ مع سینگ، یہ تصویر مصری زبان میں پورے بیل (نر گاؤ) پر دلالت کرتی تھی، اور اس مخصوص شکل کا نام "آدا" تھا اور یہ تصویر حرف الف کی قائم مقام تھی۔ اہل فنیقیہ نے اس شکل کو قائم رکھا۔ (ملاحظہ ہو نقشہ) اور چونکہ فنیقی میں بیل کو الاف کہتے تھے لہٰذا الاف کا پہلا سرا لے لیا۔ اور اس کی سیدھی شکل بنائی ⊀ جو عرب میں جاکر موجودہ الف (ا) بن گیا۔ آغاز کتابت میں عربی بیل (ثور) کے سینگ خمیدہ تھے (ᔑ الف کی قدیم شکل حیری خط میں) اخیر عہد میں یہ کجی جاتی رہی۔

اسی طرح حرف (ب) کی صورت مربع تھی جو ایک مکان پر دلالت کرتی تھی جس کو مصری (با) کہتے تھے۔ فنیقی زبان میں مکان کے لئے لفظ (بیث) تھا۔ انھوں نے اپنے مکان کو مربع نہیں بنایا بلکہ اُسکا

---

[۵] صبح الاعشیٰ صفحہ ۲۱ جلد ۳۔ مطبوعہ مصر۔ یہ نایاب کتاب ۱۶ جلدوں میں حال میں شائع ہوئی ہے۔

ایک ضلع لے لیا۔ عرب میں گھر کو (بیت) کہتے ہیں لہذا عربوں نے اپنے استاد کی تقلید نہیں کی بلکہ اپنے گھر کو لیکر سیدھا بنایا باقی پیچ وخم چھوڑ دیا۔

حرف (ج) کے لئے مصری اونٹ کا سر بناتے تھے، جس کو وہ جمل کہتے تھے۔ فنیقیہ میں اونٹ کے لئے جومل کا لفظ تھا۔ عربی میں یہی لفظ بادنیٰ تغیر جَمَل (یعنی اونٹ) تھا۔ اب غور سے اس عربی اونٹ کی گردن کو دیکھئے تو وہ بلاشبہ عربی کے حرف (ج) سے مشابہ ہے۔ مختصر یہ ہے کہ فنیقی قوم نے حرف بحرف مصریوں کی تقلید کی، اسی طرح عربوں نے فنیقیہ کی تائید کی اور تصاویر والفاظ سے پوری حروف تہجی ایجاد کی۔ اور ہر حرف میں شکل ومعنی کی مناسبت قائم رکھی۔ چنانچہ الف سے ی تک ہر حرف میں صوری اور معنوی مطابقت موجود ہے، جس کی تشریح[1] بیکار ہے۔ اور نقشہ میں یہ سب صورتیں قائم ہیں۔

عربوں نے حروف تہجی میں فنیقیہ سے ۲۲ حروف لئے (قرشت تک) اور چھ حرف (ث۔ خ۔ ذ۔ (ثخذ) ض۔ ظ۔ غ (ضظغ) خود ایجاد کئے۔ اور یہ حروف ہیں جو صرف عربی زبان سے مخصوص ہیں، دوسری زبانوں میں ان کے مخرج نہیں ہیں۔ اور پھر ان میں بھی ض (ضاد) مخصوص ہے۔ حدیث نبوی ہے کہ "انا افصح من نطق بالضاد" و۔ ت۔ خ اور ث خطِ یمنی میں موجود تھے۔

حمیری خط میں جس کو عرب مسند حمیری کہتے ہیں یہ ۶ حروف روادف کے نام سے مشہور ہیں۔ کیونکہ فنیقیہ میں یہ حرف نہ تھے، اور عربوں نے ان حروف پر امتیاز کے لئے نقطے لگا دیے۔ اور ان نقاط سے جامعیت بڑھ گئی۔ اور یہ نہایت اہم اضافہ تھا۔

۵۔ ابجد کی تاریخ | ابجد سے وہ ۲۸ حروف مراد ہیں جو ایک خاص لفظی ترکیب سے آٹھ کلمات پر تقسیم ہیں۔ اور وہ کلمے حسب ذیل ہیں:۔

ابجد ہوز حطی کلمن سعفص قرشت ثخذ ضظغ

(۴) (۳) (۳) (۴) (۴) (۴) (۳) (۳) = ۲۸

ابجد کے علاوہ ان کو حروف تہجی، حروف الہجا، حروف المبنی اور حروف المعجم بھی کہتے ہیں۔ یہ کیا لفظ ہیں اور ان کے کیا معنی ہیں، اور ان کا موجد کون ہے۔ یہ ایک بڑی بحث ہے اور اس میں مختلف روایتیں ہیں۔ عرب کا قدیم مورخ ہشام کلبی لکھتا ہے کہ عرب العاربہ (قدیم ترین قبائل عرب) کتابت کے

---

[1] تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو مقدمۃ الصرف (بزبان عربی) ڈاکٹر لیٹنر صاحب سابق پرنسپل لاہور کالج مطبوعہ پنجابی اخبار لاہور۔ از صفحہ ۴ لغایۃ ۹۔ و تاریخ الادب حفنی بک ناصف و تاریخ ادب وکٹر ہوگو۔

موجد تھے۔ جب اس قبیلہ کے کچھ لوگ عدنان بن اُدد کے قبیلہ میں آئے تو ان سے لوگوں نے کتابت سیکھی، اور انھیں کے نام سے یہ حروف ایجاد ہوئے۔ اور وہ چھ اصحاب تھے۔

ابوجاد ہواز حطی کلمون صعفص قریسات

کہا جاتا ہے کہ یہ لوگ[۵۱] حضرت شعیب علیہ السلام کے زمانہ میں علاقہ مدین کے حکمراں تھے۔ چنانچہ جب کلمون مرگیا، تو اس کی بہن نے مرثیہ لکھا جس کے یہ شعر مشہور ہیں۔

کلمون ھدّ رکنی ھلکت وسط المحلہ
سیّد القوم اتاہ الحتف نارا وسط ظلہ

دوسرا شاعر کہتا ہے:۔

ملوك بنی حطی وھم وانر منھم
وسعفاص من اھل المکارم والفخر

ایک روایت ہے کہ یہ شیاطین کے نام ہیں جو عربوں میں مشہور تھے۔ ایک صاحب فرماتے ہیں کہ یہ سابور شاہ ایران کے بیٹے تھے۔

ابن ہشام عرب کا ایک مستند مورخ ہے۔ لیکن یہ کل روایتیں محض فسانہ ہیں جو اس عہد میں مشہور تھیں، اور ہر قوم کی جاہلیت کی تاریخ ایسے ہی قصوں سے مالا مال ہے۔ تاریخی حیثیت سے واضح ہے کہ ابوجاد وغیرہ (چھ کلمے) حروف تہجی کی ایک قدیم ترتیب ہے، جو موجودہ ترکیب ابجد سے مختلف ہے

دوسری ترتیب کلمات کی یہ ہے:۔

ابجاد[۱] ہاوز[۲] حاطی[۳] کلمان[۴] صاع[۵] فض[۶] قرشت[۷]

اور سب سے اخیر منتظم ترکیب کلمات ہشت گانہ کی ہے جو عام طور پر مشہور ہیں جس کی نسبت ڈاکٹر لیٹنر لکھتے ہیں "وللحروف ترتیب اٰخر من قدیم الزمان سوی الترتیب المذکور یظھر بہ قیمۃ الحروف وتعدادھا وھو ھذا

ابجد ھوز حطی کلمن سعفص قرشت ثخذ ضظغ

قدیم روایات کا خلاصہ یہ ہے کہ شہر مدین کے علماے ادب نے بچوں کے یاد کرنے کیلئے ۲۸ حروف

---

۵۱ تفصیل کے لئے دیکھو الفہرست ابن ندیم مطبوعہ لیپزگ جرمن۔ مقالہ اول علم الخط۔ وکشف الظنون بحث علم الخط والف باربلوی صفحہ ۵۷ جلد اول مطبوعہ مصر۔

کو آٹھ کلمات پر تقسیم کر دیا تھا کہ وہ حافظہ میں محفوظ رہیں، اور عہد قدیم میں مصریوں اور فنیقی وغیرہ کی تشریح الحروف بھی اسی ترتیب سے تھی جس کو جداگانہ صورت میں اس طرح پر لکھا جا سکتا ہے۔

ا ب ج د (ابجد) ہ و ز (ہوز) ح ط ی (حطی) ک ل م ن (کلمن) س ع ف ص (سعفص) ق ر ش ت (قرشت)

یہ ترتیب سیکڑوں برس قبل کی ہے، لیکن تاریخی زمانہ میں ابن مقلہ کاتب نے بچوں کی آسانی کی غرض سے اس قدیم ترتیب کو بدل دیا، اور ہم شکل حروف مسلسل لکھے، مثلاً ب ت ث ج ح خ د ذ ر ز س ش ص ض ط ظ ا ع غ ف ق ک ل م ن و ہ ی۔ (باستثنائے الف جملہ ۲۷ حروف) اور دوسری آسانی یہ کی کہ امتیاز کے لئے حروف پر نقطے لگا دیے۔

کلمات ابجد کی ارباب لغت نے عجیب و غریب تاویل کی ہے، جس کو لفظ ابجد میں صاحب غیاث اللغات نے مدار الافاضل سے نقل کیا ہے۔ ناظرین یہ دلچسپ بحث اس کتاب میں ملاحظہ فرمائیں اور ہر کلمہ کے معنی بھی لکھے ہیں۔ مگر یہ سب شاعرانہ لطیفے ہیں، فلسفۂ لغت سے اسکو کوئی تعلق نہیں ہے۔

ادب[1] و تاریخ کی کتابوں سے پایا جاتا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت میں الفاظ ابا جاد (ابجد) اور سعفص وغیرہ اس قدر عام تھے کہ بدوی بھی ان کلمات سے واقف تھے۔ چنانچہ ایک مشہور روایت ہے کہ حضرت عمر کے دربار میں ایک بدوی آیا، آپ نے پوچھا کہ تو قرآن اچھی طرح پڑھ سکتا ہے؟ اس نے عرض کیا کہ ہاں۔ تب آپ نے حکم دیا کہ ام القرآن (سورۂ فاتحہ) پڑھ۔ یہ سنکر بدوی نے کہا کہ خدا کی قسم جب قرآن کی بیٹیاں ایسی خوبصورت ہیں تو اس کی ماں بدرجہ اولیٰ حسین ہوگی۔ اس گستاخانہ جملہ پر حضرت عمر نے بدوی کے ایک دُرّہ لگایا، اور سورۂ فاتحہ لکھکر دی کہ اس کو یاد کرلے، بدوی یہ سورہ لیکر اپنے قبیلہ میں بھاگ گیا اور گاؤں والوں سے کہا:۔

اتیت هاجرین فعلمونی	ثلاثته احرف متتابعات
وخطوالی اباجاد وقالوا	تعلم سعفصا وقریشیات
وماانا والکتابة والتهجی	وماخط البنین مع البنات

حروف تہجی کی ترتیب علمائے ادب نے تین طرح پر کی ہے۔ اور ہر ایک نے سہولت کو مدنظر رکھا ہے چنانچہ وہ ترتیب یہ ہے۔

---

[1] کتاب الف با ر بلوی صفحہ ۵، جلد اول

۱- اہل مشرق | قدیم اقوام خصوصاً سامی نسلوں میں حروف کی یہ ترتیب تھی

ابجد ہوز حطی کلمن سعفص قرشت (ثخذ ضظغ)

یہ سب سے پہلی تشریح الحروف ہے۔ اور واضع نے اپنے خیال میں آسان اور مشکل مخارج کے لحاظ سے یہ ترتیب رکھی تھی۔ جیسا کہ حرفوں کی آواز سے ظاہر ہے کہ آہستہ آہستہ ان کے مخرج مشکل ہوتے جاتے ہیں، اور یہ ظاہر ہے کہ جب بچے بولنا سیکھتے ہیں تو پہلے ابا، اماں اور مم وغیرہ الفاظ ان کی زبان سے نکلتے ہیں اور یہ وہ حروف ہیں جو لب کے اشارے سے ادا ہوتے ہیں۔

۲- اہل مغرب | مشرق کے مقابلہ میں مغرب (اہل بربر و مراکش) کی حروف تہجی میں کسی قدر فرق ہے۔ اور وہ ترتیب یہ ہے:-

ابجد ہوز حطی کلمن صعفض قرست ثخذ ظغش

اس ترکیب میں بعض حروف تبدیل ہو گئے ہیں لیکن حروف کا شمار برابر ہے۔ تیسری ترتیب محض مخارج کے اعتبار سے ہے جس میں حروف کی آواز سینہ سے لبوں کی طرف جاتی ہے، اور یہ حروف مد ہیں۔

ہمزہ، ہ، ع، ح، غ، خ، ق، ک، ج، ش، ی، ض، ل، ر، ن،
ط، د، ت، ص، س، ز، ظ، ذ، ث، ف، ب، م، و،

یہ ترتیب خلیل بصری (متوفی ۱۷۰ھ) سیبویہ نحوی (متوفی ۱۸۰ھ) اور ابن سیدہ لغوی (متوفی ۴۵۸ھ) کے زمانہ تک قائم رہی۔

خلیل بصری نے جب سب سے پہلی کتاب العین (لغات عرب کا پہلا متن ہے) لکھی تو اس میں مخارج حروف کے لحاظ سے ترتیب قائم کی۔ اور حروف حلقی سے ابتدا کی جس کی ترتیب یہ ہے:-

ع، ح، ہ، خ، غ، ق، ک، ج، ش، ض، ص، س، ز، ط، د، ت،
ظ، ذ، ث، ر، ل، ن، ف، ب، م، و، ا، ی، (دائی مجموعہ حرف علت)

ابن حزوف (محمد بن علی القرطبی شارح کتاب سیبویہ متوفی ۶۰۵ھ) کا قول ہے کہ جو حرف ایک مخرج سے نکلے ہیں سیبویہ نے ترتیب میں اس کا خیال نہیں رکھا ہے۔ اخیر ترتیب نصر بن عاصم اور یحییٰ بن یعمر عدوانی نے کی ہے۔ (عہد عبدالملک بن مروان ۶۵-۸۶ھ) اور یہی ترتیب تمام بلاد عرب میں اس وقت جاری ہے، جس کو مصنف صحاح اور قاموس نے تسلیم کیا ہے۔ اس ترتیب میں مشابہت حروف کا خاص طور پر لحاظ رکھا

گیا ہے :-

ا ب ت ث ج ح خ د ذ ر ز س ش ص ض ط ظ ع غ ف ق ک ل م ن ہ و ی۔

اہل مغرب[۵۱] نے حرف ز کے بعد یہ حروف قائم کئے ہیں۔ جن میں حروف متشابہ کا حتیالی لحوظ رکھا گیا ہے۔

ط ظ ک ل م ن ص ض ع غ ف ق س ش ہ و ی

شیخ لسان[۵۲] الدین خطیب اندلس نے ایک نظم لکھی ہے، جس کے ہر لفظ سے پہلا حرف لیکر حروف تہجی کو الف سے ی تک جمع کیا ہے۔

اَسا جمعہ بالواد بین تبوائ — ثمارا جتھا حالیات خواضب
دعن ذکر روض زانہ سقی شربہ — صباح ضحی طی ظباء عصائب
غرام فوادی قاذف کل لیلۃ — متی ما نای وھنا ھواہ یراقب

ترتیب اس کی یہ ہے:-

ا ب ت ث ج ح خ د ذ ر ز س ش ص ض ط ظ ع غ ف ق ک ل م ن

و ہ ی (۲۸)

حرف لا (لام الف مرکب) یہ حرف چوتھی صدی عیسوی کا ایجاد ہے، نبطی خط میں موجود نہ تھا۔

ابجد[۵۳] کی ایجاد میں ایک علمی روایت اور بھی ہے اور وہ یہ ہے کہ یہ حروف زبور مقدس کے (۲۲) ابواب سے اخذ کئے گئے ہیں، اور ہر فصل کا پہلا حرف لیکر ترتیب ابجد کی قائم کی گئی ہے۔ (اصل عبرانی حروف کی صورت زبور میں دیکھنا چاہیئے) اور یہ وہی طریقہ ہے جس طرح قرآن حکیم میں حروف مفردات سورہ ق - ن - س اور حروف مقطعات ہیں۔

نام ابواب زبور	پہلا حرف
الف	ا
بیست	ب

---

۵۱ کتاب آنتشار الخط العربی عبدالفتاح مطبوعہ مصر ۱۹۱۵ء

۵۲ علم الادب عند الافرنج ویکٹر ہوگو صفحہ ۶۵ مطبوعہ مصر

۵۳ زبور مقدس از صفحہ ۸۸ لغایۃ ۹۳ مطبوعہ لندن ۱۸۸۷ء (نغمۂ زبور ۱۱۹)

نام ابواب زبور	پہلا حرف	نام ابواب زبور	پہلا حرف
جیمل	ج	میم	م
دالت	د	نون	ن
	ابجد		کلمن
ھے	ہ	ساک	س
واو	و	عین	ع
زین	ز	فے	ف
	ہوز	صادے	ص
حیت	ح		سعفص
طیط	ط	قوف	ق
یود	ی	ریش	ر
	حطی	شین	ش
کف	ک	تو	ت
لامد	ل		قرشت = جملہ ۲۲ حروف

اس روایت سے ثابت ہوتا ہے کہ عبرانیوں میں بھی حروف تہجی میں ۲۲ ہی حروف تھے۔ اور یہ بھی قدیم مصریوں اور فنیقیوں کے مقلد تھے۔

۶۔ ابجد کا رسم الخط اور دور ترقی

تحقیقات جدیدہ کے مطابق فنیقی خط سے چار مشہور خط ایجاد ہوئے۔ یعنی یونانی قدیم عبری قدیم، آرامی اور مسند حمیری۔ لیکن ہم کو یونانی اور عبری سے اس مضمون میں بحث کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ آرامی خط جسکو سامی بھی کہتے ہیں خط حیری یا مسند حمیری سے پہلے جاری ہوا ہے۔ اور بہت زیادہ رائج تھا۔ اور اس سے چھ خط نکلے۔ اور خود فنا ہوگیا۔ تفصیل ان خطوط کی یہ ہے:۔

(۱) نبطی — مدین، ارض سینا، فلسطین اور حوران (ممالک شام) میں جاری تھا۔

(۲) سریانی — توراۃ اول اسی خط میں لکھی گئی۔ پانچویں صدی عیسوی کے نمونے ہنوز باقی ہیں۔

(۳) تدمری — یہ خط شہر پال مائرا (اس کو عرب تدمر کہتے ہیں) سے مخصوص تھا۔ اب مردہ خطوں

میں داخل ہے۔

(۴) عبری مربع (موجودہ عبرانی خط) اس خط کی بنیاد بابل میں پڑی۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ جب بخت نصر شاہ بابل نے یہودیوں کو بیت المقدس سے جلاوطن کرکے بابل میں آباد کیا تھا۔ اس عہد میں خط معماری کے علاوہ بابل میں آرامی خط بھی جاری تھا جسمیں توراۃ لکھی گئی ہے۔ لیکن عبری خط کا کوئی نسخہ نویں صدی عیسوی سے قبل کا موجود نہیں ہے

(۵) پہلوی ایران کا یہ قدیم خط ہے۔ جو مُردہ ہوچکا ہے۔

(۶) ہندی یہ[1] زندہ قوم کا خط ہے، جو مختلف شاخوں میں تقسیم ہے۔

جزیرۃ العرب کے باشندے جب بہ تقریب سیاحت و تجارت ملک شام میں گئے تو اُنھوں نے نبطی قوم سے اُنکا خط سیکھا جس کو عرب مسند حمیری کہتے ہیں۔ اور حمیر یمن کا قدیم مشہور قبیلہ ہے جو مغربی عرب میں آباد تھا جس کا عہد حکومت ۱۱۵ ق۔م سے شروع ہوکر ۲۵ء میں قوم تبع اور اصحاب الاخدود پر ختم ہوجاتا ہے۔ جس کا تذکرہ قرآن کے سورۂ بروج میں موجود ہے۔ (قُتِلَ اَصْحَابُ الْاُخْدُوْدِ النَّارِ ذَاتِ الْوُقُوْدِ)

جنوبی عرب میں مسند حمیری جناب مسیح سے کئی صدی قبل جاری تھا، اور یہ عرب نبطیوں کے پہلے شاگرد ہیں۔ چنانچہ عرب کے قدیم پیغمبر حضرت ہود علیہ السلام کے صحائف اسی خط میں پتھروں پر کندہ تھے۔

حمیری خط کی حروف تہجی اپنے اصل فنیقی اور نبطی سے زیادہ آڑی اور ترچھی تھی۔ چنانچہ اول یہ خط[2] قبیلہ طے میں جاری ہوا، اس قبیلہ میں خط مذکور کے ماہر مرامر بن مرہ، اسلم بن سلاہ اور عامر بن جدرہ تھے، اور یہ خط طاہود علیہ السلام کے کاتب وحی خلف جان کے شاگرد تھے۔

ابن ندیم کی روایت ہے کہ مرامر۔ اسلم، اور عامر انبار کے باشندے تھے۔ انھوں نے حروف موصولہ اور مقطعہ ایجاد کئے۔ چنانچہ مرامر نے حروف کی شکلیں ایجاد کیں۔ اسلم نے جوڑ اور پیوند لگائے اور عامر نے

---

[1] ہم کو امید ہے کہ ہمارے وہ بھائی جو سنسکرت کے عالم ہیں ہندوستان کے خطوط پر رسالہ زمانہ میں محققانہ مضمون لکھیں گے۔ اور قدیم نمونے فوٹو میں درج کریں گے۔

[2] بلوغ الارب صفحہ ۳۸۲۔ تاریخ عہد جاہلیت عرب مطبوعہ بغداد و تاریخ بلاذری و الفہرست ابن ندیم و تاریخ حفنی بک و کتاب الوزراء جھشیاری صفحہ ۲۷ مطبوعہ جرمن

نقطے ایجاد کئے۔ ابتدا میں مسند حمیری کا نام جزم تھا جزم کے معنی نوزائیدہ بچہ کے ہیں اور لفظی مناسبت ظاہر ہے۔ چنانچہ ان اساتذہ سے انبار (عراق کا مشہور شہر) کے باشندوں نے یہ خط سیکھا۔ اور انبار والوں کے اہل حیرہ (عراق) شاگرد ہوئے، اور سلسلہ بہ سلسلہ نواح یمن، کندہ اور حضرموت تک یہ خط عام ہوگیا اور اب یہ خط بہت مہذب ہوگیا تھا۔ اس کی دو قسمیں تھیں۔ ایک مقور (مشتق از قور، قدم پر قدم رکھنا) جس کے حروف ایک دوسرے سے خوب ملے ہوئے تھے، اور پھیلاؤ کم تھا۔ عہد رسالت کی تمام مراسلت اسی رسم الخط میں ہے۔ دوسری قسم کا نام مبسوط تھا۔ یہ نہایت واضح خط تھا۔ مساجد اور دیگر عمارات کے کتبات اسی خط میں لکھے جاتے تھے۔ آغاز اسلام سے قبل حرب بن امیہ بن عبد شمس جب بہ سلسلہ تجارت عراق میں گیا تو اس نے بشر بن عبدالملک (برادر رئیس دومۃ الجندل متصل نجف اشرف) کی شاگردی کی اور اپنے استاد کو شہر مکہ میں لیکر آیا، اور اپنی بیٹی صہبا سے بشر کا نکاح کر دیا۔ چنانچہ اس تقریب سے شرفائے قریش (سرداران شہر مکہ) نے مسند حمیری حاصل کیا۔ حضرت عمر بن الخطاب۔ حضرت عثمان۔ حضرت علی ابوعبیدہ اور معاویہ اور یزید (پسران ابوسفیان) اس عہد کے مشہور خطاط ہیں۔ جن کا سلسلۂ شاگردی بشر تک پہونچتا ہے۔ مسند حمیری کا نہایت قدیم نمونہ وہ خط ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مسیلمہ کذاب (مدعی نبوت) کو لکھا تھا۔ یہ خط ۱۸۹۶ء میں لندن کے پکچر میگزین میں شائع ہوچکا ہے۔

دوسرا خط نبی کریم کا وہ ہے جو مصر کے شاہ مقوقس کو ۶ھ/۶۲۸ء میں لکھا گیا تھا۔ اس خط کا فوٹو ایک وصلی کی صورت میں شائع ہوچکا ہے۔ اور عام طور سے ملتا ہے۔ یہ دونوں خط نقاط اور اعراب سے خالی ہیں۔ عربی میں جمع کے صیغہ میں جو الف خیر میں لکھا جاتا ہے وہ بھی اس عہد کی یادگار ہے۔ یہ بھی قاعدہ تھا کہ ایک لفظ کے دو ٹکڑے کرکے الگ الگ لکھتے تھے۔

۲۔ خط کوفی یا خط نسخی

قدیم مسند حمیری، خط جب کوفہ پہونچا اُس وقت بہت کچھ اصلاح پذیر ہوچکا تھا۔ لیکن کوفیوں نے اپنی ذہانت سے اس کے آڑے اور ترچھے حروف کی اور اصلاح کی۔ کوفیوں کی اصلاح سے قبل حجاز میں یہ خط مکی یا مدنی کہلاتا تھا۔ لیکن مامون الرشید عباسی (متوفی ۲۱۸ھ/۸۳۳ء) کے زمانہ میں یہ خط کوفی کہلایا۔ اور ہنوز یہی نام مشہور ہے۔ خط کوفی کی نسبت مشہور ہے کہ اس خط میں سطرنجیلی سے بھی مدد لی گئی ہے۔ اور یہ رائے قرین صحت ہے، کیونکہ سطرنجیلی سُرمانی، آرامی ہی کی ایک شاخ ہے جو عربی خط کی اصل ہے۔ عہد رسالت میں تمام مکہ میں صرف سولہ اشخاص لکھنا جانتے تھے۔ لیکن واقعہ

۱؎ ابن خلکان حالات علی بن ہلال کاتب۔ ۲؎ فتوح البلدان بلاذری صفحہ ۴۷۹

بدر کے بعد مدینہ میں بکثرت خطاط پیدا ہو گئے۔ کیونکہ بدر میں جو تعلیم یافتہ قیدی گرفتار ہوئے۔ ان کو رسول اللہ صلعم نے یہ حکم دیا تھا کہ وہ دس دس لڑکوں کو لکھنا سکھاویں۔ اور یہی اُن کی آزادی کا فدیہ تھا۔ چنانچہ زید بن ثابت مشہور کاتب انھیں لوگوں میں تھے۔ اور یہ قیدی تعداد میں ستر تھے۔

عہد اسلام میں ابو الاسود دوئلی (شاگرد حضرت علی کرم اللہ وجہہ) اس خط کا نامور استاد تھا۔ لیکن اس کے انتقال پر (۶۹ھ/۶۸۸ء) یحییٰ بن یعمر، میمون بن اقرن، عنبسہ بن معدان فہری نے جو ابو الاسود ہی کے شاگرد تھے اس خط میں بہت سے اضافے کئے۔ ان کے بعد عبد الرحمٰن بن ابی اسحٰق حضرمی اور ابو عمر ابن علار (متوفی ۱۵۴ھ) نے خاص طور سے نوک پلک درست کی۔

خلافت فاروقی میں کوفہ اور بصرہ آباد ہوئے اور عہد امیہ و عباسیہ میں ان شہروں کو عروج ہوا۔ اور خلیل بن احمد بصری (موجد علم عروض متوفی ۱۷۰ھ) اور علی بن حمزہ کسائی کوفی (متوفی ۱۸۲ھ) جیسے نامور علما پیدا ہوئے تو انھوں نے خط کوفی کی رسم الخط میں نئی نئی ایجادیں کیں۔

خط کوفی میں سب سے بڑی ترقی یہ ہوئی کہ موجودہ نقاط کی بنیاد پڑی، جن سے مختلف الصوت حروف میں امتیاز پیدا ہوا۔ لیکن اس عہد میں یہ نقطے گول نہ تھے بلکہ باریک ترچھی لکیروں کی صورت میں تھے ان قدیم خطوط کے نمونوں کے لئے انسائیکلو پیڈیا آف اسلام صفحہ ۳۸۴ ملاحظہ ہو۔

۳۔ موجودہ عربی خط عربی کا موجودہ خط جو عموماً نسخ کے نام سے مشہور ہے اس کی اصل خط کوفی ہے اور یہ نامور وزیر محمد بن علی مشہور بہ ابن مقلہ (متوفی ۳۲۸ھ/۹۴۰ء) کی ایجاد ہے۔ ابن مقلہ نے خط کوفی کی تمام پیچیدگیوں کو مٹا دیا۔ اور ہر حرف کو خوشنما دائرہ میں لکھا۔ اور اصل ماخذ سے حسب ذیل چھ خط ایجاد کئے:۔

محقق[1] ثلث[2] نسخ[3] توقیع[4] رقاع[5] اور ریحان[6]

اعراب میں جزم، تشدید اور تنوین (دُہرے زیر زبر) کا موجد بھی ابن مقلہ ہے

ابن مقلہ کے عہد میں جو خامیاں رہ گئی تھیں، اس کی ابن البواب (متوفی ۴۲۳ھ/۱۰۳۱ء) کاتب نے اصلاح کی۔ چنانچہ موجودہ عربی خط تمام و کمال ابن بواب کا مرہون منت ہے۔ جب یہ نسخی خطوط تمام عجم میں پہونچے تو عجمیوں نے الٹ پھیر کر کے خط توقیع سے ایک سا تواں خط ایجاد کیا جس کا نام تعلیق ہے مولانا جامی فرماتے ہیں:۔

کاتباں را ہفت خط باشد بطرز مختلف ثلث و ریحان و محقق نسخ و توقیع و رقاع

بعد ازاں تعلیق آں خط است کش اہل عجم ازخطِ توقیع استنباط کردند اختراع

ان خطوط میں باہم جس قدر فرق ہے وہ صرف فوٹو سے ظاہر ہو سکتا ہے اور اس کے لئے ایک جداگانہ مضمون کی ضرورت ہے۔

۴۔ اعراب و نقاط | ابن ندیم کی روایت سے ثابت ہو کہ عہد قدیم میں عامر انباری نے نقطے ایجاد کئے تھے۔ لیکن وہ نقطے کس قسم کے تھے، تاریخ میں اس کی کوئی صراحت نہیں ہے۔ البتہ خطِ کوفی میں جو نقطے لگائے گئے اس کی یہ تاریخ ہے کہ زیاد بن ابیہ والی عراق کے حکم سے جب ابوالاسود دوئلی نے زبان عربی کی تعلیم کے لئے قواعد بنانے شروع کئے تو اس نے اپنے کاتب کو حکم دیا کہ تم میرے لبوں کی حرکت کی طرف دیکھا کرو جب کوئی لفظ میں بولوں تو حرف کے طرز ادا پر خیال کرو۔ جس حرف کے ادا کرنے میں منہ کھلا رہے اُس کے اوپر ایک نقطہ لگا دو، اور جس حرف میں دونوں لب کناروں سے ملے ہوئے ایک حلقہ کی صورت میں نظر آئیں تو اس حرف کے دائیں جانب ایک نقطہ دیدو، اور اگر میرا منہ ٹکا ہوا اور نیچے کا لب ٹھوڑی کی طرف جھکا ہوا ہو تو اس حرف کے نیچے نقطہ لگا دو۔ کاتب نے اس پر عمل کیا۔ یہ نقطے اس عہد میں باریک لکیریں تھیں۔ جنھوں نے سو برس تک اعراب (ضمہ۔ فتحہ۔ کسرہ) کا کام دیا۔ اور دوسری صدی ہجری میں مشہور نحوی خلیل بن احمد نے موجودہ پیش۔ زبر۔ زیر (اعراب) کی علامتیں ایجاد کیں، اور قدیم نقاط کا رواج موقوف ہوا۔ عہد رسالت اور خلافت میں جس قدر قرآن لکھے گئے یا جو مراسلت ہوئی وہ اعراب و نقاط سے خالی تھی، اور عربوں کو اس کی مطلق ضرورت نہ تھی۔ لیکن اہل عجم کو اعراب اور نقاط کی سخت ضرورت تھی کیونکہ بغیر اس کے وہ قرآن کو کسی طرح صحیح نہیں پڑھ سکتے تھے۔ گول نقطے حجاج بن یوسف[1] (گورنر عراق عبدالملک بن مروان متوفی ۹۵ھ) کے عہد میں وضع ہوئی۔ اور اس شکل کے موجد نصر بن عاصم اور یحییٰ بن یعمر نحوی تھے۔ اور یہ نقطے حروف متشابہ کی تمیز کے لئے ایجاد کئے گئے تھے مثلاً د ذ ر ز س ش وغیرہ۔ یہ نقطے بھی دو قسم کے تھے۔ مفرد اور زوج، اور حروف کے اوپر بھی ہوتے تھے اور نیچے بھی۔

۵۔ علم ادب اور کتابت | عہد جاہلیت کی شاعری سے بھی پتہ چلتا ہے کہ عرب نہایت قدیم زمانہ سے لکھنا جانتے تھے۔ چنانچہ لبید بن ربیعہ کا قول ہے۔

وجلا السیول عن الطلول کانھا زبر تجد متونھا اقلامھا

عربی علم ادب میں کتابت کے لئے جو الفاظ ہیں وہ بھی اس امر کے شاہد ہیں کہ عرب لکھنا جانتے تھے

---

[1] تفصیل کے لئے ابن ندیم، تفسیر اتقان سیوطی، و ابن خلکان حالات ابن مقلہ و ابن بواب دیکھنا چاہیئے۔

مثلاً قلم۔ دوات۔ ملیق (سوت) مداد۔ مسقط (قط زن) مجرہ۔ مسرہ۔ صحیفہ۔ سجل۔ زبور۔ کتاب۔ رقیم۔ کاتب۔ مکتوب۔ ختام۔ قرطاس وغیرہ۔

کاغذ کی ایجاد سے قبل عرب سفید پتھروں پر کتابت کرتے تھے جسکو لخاف کہتے تھے، پھر حیوانات کی صاف اور چوڑی ہڈیاں، کھجور کے پتوں، اور ہرن کی جھلی پر لکھنا شروع کیا۔ اس کے بعد نرم چمڑہ پر کتابت شروع ہوئی جسکو پارچمنٹ کہتے ہیں۔ قرآن میں رق منشور سے یہی چمڑہ مراد ہے جو ایک صدی قبل مسیح جاری ہو چکا تھا۔ اخیر میں حریر اور دیبا پر مشاہیر شعرائے عرب کے قصائد لکھے گئے۔ اور امیر معاویہ کے زمانہ (۴۲ھ/۶۶۱ء) سے کاغذ کا عام طور پر استعمال شروع ہوا۔ یہ کاغذ چین و سمرقند سے آتا تھا۔ اس کے علاوہ مصری کاغذ بھی مستعمل تھا۔ جو ایک گھاس سے بنایا جاتا تھا۔ کلدانی اور بابلی اقوام میں اینٹ اور پتھر پر کتابت ہوتی تھی۔

۶۔ ابجد سے ہندسوں کا کام لیا گیا

ابجد سے عموماً اصطلاحی ابجد مراد ہے۔ جس سے تاریخی مادے نکالے جاتے ہیں۔ اور یہ امر تحقیق طلب ہے کہ ابجد کے آٹھ جملوں سے حساب جُمَل (حروف سے اعداد کا شمار) کا طریقہ کس ضرورت سے اور کب ایجاد ہوا اور اس کا موجد کون ہے؟

تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ بھی عربوں کی اختراع ہے۔ اور علم الحساب میں یہ ایک مفید اضافہ تھا۔ رسد گاہوں میں سب سے پہلے حساب جمل سے کام لیا گیا۔ لیکن ہندسوں کے محو یا مشکوک ہو جانے سے اختلاف عظیم ہو جاتا تھا۔ اس بنا پر اندراجات کی صحت قائم رکھنے کے لئے علمائے ہیئت نے ہندسوں کے عوض حروف ابجد سے کام لیا۔ اور ستاروں کی گردش کا حساب، ہر زیج میں حروف سے لکھا گیا مثلاً ۲۳ درجے اور ۲۰ دقیقے لکھنا منظور ہیں تو بحساب ابجد اس طرح پر لکھیں گے۔ کچ (ک ۲۰ + ج ۳ = ۲۳) کچ (ک ۲۰ + ح ۸ = ۲۸) دقیقہ کے بعد اگر ثانیہ یا ثالثہ وغیرہ کی ضرورت ہو تو اسی ترتیب سے حروف بڑھاتے جاتے تھے۔ مثلاً زیب ۳۷ ۱۲ ۔ زیج کے علاوہ اسطرلاب میں بھی ابجد سے کام لیا گیا ہے۔ اس ایجاد نے غلطی کا استیصال کر دیا۔ اور زیج کے علاوہ علم الرصد میں جو کتابیں نظم میں لکھی گئی ہیں اس میں بھی اسی قاعدہ پر عمل کیا گیا ہے۔ ابن یونس فلکی[1] (متوفی ۳۹۹ھ) (رئیس الرصد الحاکمی) ایک علمی مسئلہ

---

[1] مصر میں یہ رصد گاہ جبل مقطم پر تھی۔ جو خلیفہ الحاکم بامر اللہ فاطمی کے حکم سے بنائی گئی تھی۔ ابن یونس اس رصد گاہ کا مہتمم تھا۔ جس نے الحاکم کے نام سے زیج الکبیر الحاکمی لکھی۔ یہ زیج مع ترجمہ فرنچ ۱۸۰۴ء میں پروفیسر کوسان دی پرسفال نے شائع کی ہے۔

بیان کرتے ہوئے لکھتا ہے۔

دقائق اختلاف راس الجدی لب (۳۲) وخمسۃ فزدلھا ما عقب

الی ابتداء السرطان فھی سب (۶۲) ومنہ فانقص خمسۃ تعوو لب (۳۲)

اسی اصول کے مطابق علم المیقات اور تقویم میں بھی حروف مہملہ (بے نقط) اور حروف معجم (نقطہ دار) سے کام لیا گیا ہے۔ مثلاً سنین ہجری میں ہر تیس سال کے اندر گیارہ سال کبیسہ (لوند) کے ہیں، اور یہ سال تین سو پچپن یوم کا ہوتا ہے۔ تفصیل ان سنین کی یہ ہے۔

دوسرا۔ پانچواں ساتواں دسواں تیرھواں پندرھواں اٹھارھواں اکیسواں چوبیسواں چھبیسواں اور انتیسواں۔

چنانچہ یہ عظیم الشان مسئلہ حروف ابجد کی مدد سے ایک شعر میں حل کر دیا گیا ہے اور وہ یہ ہے:۔

کف الخلیل کفہ ویانہ ۱۶۔ حروف

عن کل خل حبہ فصانہ ۱۴۔ حروف

شرح اس شعر کی یہ ہے کہ اس میں تیس حرف ہیں۔ منجملہ ان کے گیارہ حرف معجم ہیں اور انیس مہمل ہیں۔ پھر ان میں جس قدر حروف مہمل ہیں وہ سال لبط ہیں اور حروف معجم سال کبیسہ ہیں۔ مثلاً یہ تحقیق کرنا ہے کہ ۱۳۲۸ھ کون سال ہے۔ لہٰذا ۱۳۲۸ کو ۳۰ پر تقسیم کیا، ۴۴ خارج قسمت نکلا، اور ۸ کا عدد باقی رہا۔ اب شعر میں تلاش کرو کہ آٹھواں حرف کون ہے، شمار کیا تو خلیل کا اخیر لام نکلا۔ یہ حرف مہمل (بے نقط) ہے، لہٰذا ۱۳۲۸ھ سال لبط ہے (اس میں لوند نہیں ہے) خلاصہ یہ ہے کہ تقسیم کے بعد اخیر باقی ۳۰ کے اندر رہیگی اور زیادہ سے زیادہ ۳۰ تک ہوگی اس سے زائد نہ ہوگی۔

ارباب جغرافیہ نے بھی شہروں کے طول البلد اور عرض البلد میں حروف ابجد سے کام لیا ہے۔ اور قدیم جغرافیوں میں درجہ اور دقیقہ کا اندراج حروف میں کیا گیا ہے۔ علاوہ بریں نجوم میں ابجد کی تقسیم بروج دوازدہ گانہ پر ہے، مثلاً:۔

۱۔ برج حمل الف

۲۔ 〃 ثور ب

۳۔ 〃 جوزا ج

۴۔ 〃 سرطان د

ابجد

یہی سلسلہ اخیر تک قائم ہے۔

۷۔ شاعری اور ابجد | سب سے زیادہ حروف ابجد سے شعراء اور موٴرخین نے کام لیا ہے۔ اور ابجد گویا ایک خاص اصطلاح ہے۔ اور یہ ہم لکھ چکے ہیں کہ سب سے پہلے رصد گاہوں میں حروف ابجد سے کام لیا گیا ہے۔ اور دنیائے اسلام میں سب سے پہلی رصد گاہ بغداد میں مامون الرشید عباسی (متوفی ۲۱۸ھ / ۸۳۳ء) نے قائم کی تھی۔ اس حساب سے ظاہر ہے کہ تیسری صدی ہجری کے آغاز میں جو زیچ مرتب ہوئیں اُن میں حروف ابجد استعمال ہوئے۔ بعد ازاں علمائے ہیئت کی تقلید میں شعراء نے تاریخی مادے نکالے۔ لہٰذا شاعروں نے تیسری صدی ہجری سے مادے نکالنا شروع کئے۔ اور اس کے قبل یعنی پہلی صدی سے اخیر تیسری صدی ہجری تک جس قدر مادے موجود ہیں۔ مثلاً خلفائے راشدین وغیرہ کی موت و حیات پر جو قطعات ہیں وہ سب زمانۂ حال کی تصنیف ہیں۔ قدیم ترین تاریخی مادے حسب ذیل ہیں۔

۱۔ ابتدا میں حروف کے اعداد نہیں لئے جاتے تھے۔ بلکہ الفاظ میں ذکر کیا جاتا تھا۔ فردوسی طوسی نے سنہ ۴۰۰ھ میں شاہنامہ ختم کیا۔ چنانچہ جب یزدجرد کی اخیر داستان ختم کر چکا تو یہ واقعہ اس طرح پر لکھتا ہے۔

سر آمد کنوں قصۂ یزدگرد — بماہ سفندارمذ، روز اُرد
ز ہجرت شدہ، پنج و ہشتاد بار — کہ گفتم من ایں نامۂ شاہوار

۵ × ۸۰ = ۴۰۰ سنہ ھ

۲۔ ایک طریقہ یہ بھی تھا کہ الفاظ میں سنین کی صراحت کر دی جاتی تھی۔ چنانچہ ملک عماد زوزنی نے شیخ ابوالفتح بُستی (مشہور شاعر) کی تاریخ یہ لکھی ہے:۔

شیخ عالی قدر مجد الدین ابوالفتح آنکہ بود
مقتدائے اہل فضل و سرورِ اہل کلام
چار صد۔ با سی چو از تاریخ احمد در گزشت
در مہِ شوال رحلت کرد تا دار السلام

۳۔ اور اغلباً پانچویں صدی ہجری کے آغاز سے حروف ابجد میں مادے نکالے گئے۔ چنانچہ شیخ الرئیس ابوعلی سینا کی تاریخ یہ ہے۔

حجۃ الحق ابوعلی سینا — در شجس آمد از عدم بوجود
(۳۶۳ ولادت)

در شمار کرد کسب جملہ علوم در تکز کرد ایں جہاں پدرود

بعض تاریخوں میں (۳۹۱) بجائے شمس کے شمع ہے، جس کے عدد ۳۷۰ (۴۲۷ - ۵۷ وفات) ہوتے ہیں۔ لیکن نامۂ دانشوراں ناصری وغیرہ میں شیخ کی عمر ۹۳ سال لکھی ہے، اس حساب سے شمس صحیح ہے۔

۴۔ ایک طریقہ یہ تھا کہ محض حروف ابجد کا نام لیا جاتا تھا، اور اس کے اعداد مراد ہوتے تھے جیسا کہ علامہ قطب الدین شیرازی کی تاریخ ہے۔

بازی کرد چرخ کج رفتار در مہ روزہ آہ آزاں بازی
ذال و با رفتہ از گہ ہجرۃ رفت در پردہ قطب شیرازی

۶۰۰ + ۲ = ۶۰۲ھ

شیخ سعدی شیرازی کی تاریخ بھی اسی قسم سے ہے۔ ۶۰۰+۹۰+۱ = ۶۹۱ھ

شب آدینہ بود و ماہ شوال ز تاریخ عرب خ۔ص۔آ سال
ہمائے روح پاک شیخ سعدی بیفشاند از غبار تن پر و بال

اسی مادہ کو دوسرے شاعر نے اس طریقہ پر نظم کیا ہے۔

ہمائے روح پاک شیخ سعدی چو در پرواز شد از دی اخلاص
مہ شوال بود و شام جمعہ کہ در دریائے رحمت گشت غواص
یکے پرسید سال فوت۔ گفتم ز خاصاں بود ازاں تاریخ شد خاص

خاک مصلے (حافظ) ۔ شاہ مرو۔ شب قیامت بھی ایسے ہی مادے ہیں (۶۹۱ھ)

اس سلسلہ میں (سنجر) خواجہ علی مؤید (رافع بیگ) کی تاریخ بھی قابل ملاحظہ ہے۔

بر دال محمد چو نہی یک نقطہ
تاریخ وفات نجم دیں خواجہ علی ست

حرف دال پر ایک نقطہ لگانے سے ذال ہو گیا جس کے عدد ۷۰۰ ہوتے ہیں۔ یہ جدت بھی قابل تعریف تھی۔ اس کی دوسری مثال یہ ہے:۔

بر صاد وصال چوں زنی یک نقطہ
تاریخ وفات بایسنقر خان است ص = ض = ۹۰۰

تذکرہ دولت شاہ سمرقندی اور تذکرہ عوفی میں ایسے مادے متعدد ہیں۔ زیادہ صراحت کی ضرورت

نہیں ہے۔ شعرائے عرب نے بھی بحساب جمل تاریخی مادے نکالے ہیں، لیکن یہ زمانہ حال کی ایجاد ہے تیمم عربی تاریخیں ایسے مادوں سے خالی ہیں۔ شعرائے ہند نے اردو میں نہایت لاجواب مادے نکالے ہیں جس کی تفصیل رسالہ زمانہ میں چھپ چکی ہے۔

محمد عبد الرزاق
مصنف البرامکہ - بھوپال

بیر بھوٹی

(از منشی درگا سہائے صاحب سرور جہان آبادی)

کچھ عجب عالم ہے تیرے حسن کے انداز کا
سرخ ڈورا ہے کسی چشم فسوں پرداز کا

قطرۂ مضطر ہے خون کشتگانِ ناز کا
قلبِ خوں گشتہ ہے مژگاں پر کسی جانباز کا

یا شفق کا کوئی ٹکڑا ہے زمیں پر جلوہ گر
جامِ زریں میں ہے یا صہبائے احمر جلوہ گر

گل بداماں ہے شفق میں شعلۂ تنویرِ حسن
خون عاشق یا زمیں پر ہے گریباں گیرِ حسن

یا عقیق سرخ کی چھوٹی سی ہے تعمیرِ حسن
نقش نیرنگِ فسوں ہے یا کوئی تصویرِ حسن

جلوۂ گل ہے فضائے وادیِ پرخار میں
سرخ تکمہ ہے قبائے سبزۂ کہسار میں

جلوۂ گل سے ہے رنگیں روئے زیبائے بہار
نازنیں ہے یا کوئی محوِ تماشائے بہار

یا مئے گلرنگ سے گلگوں ہے مینائے بہار
یا ہے آغشتہ بخوں داغِ سویدائے بہار

سبزۂ کہسار نے یا لعل اگلا ہے کوئی
چن رہی ہے پھول یا دوشیزۂ رعنا کوئی

وادیِ پرخار میں اک مجمرِ سوزاں ہے تو
دامنِ کہسار میں اک شعلۂ عریاں ہے تو

کشتِ زارِ حسن میں اک دانۂ مرجاں ہے تو
یا کسی گلگوں قبا کا گوشۂ داماں ہے تو

ناز ہے صحرا کو تیری شوخیِ رفتار پر
دوڑتا ہے خوں کا قطرہ سبزۂ کہسار پر

سرور جہان آبادی مرحوم

اسلاف ہند کے تمدنی کارنامے

از ٹھاکر جے۔ آر۔ رائے۔ صاحب

اسلاف ہند قدیم اور ان کے موجودالوقت جانشینون مین بعدالمشرقین ہے۔ مدّت ہوگئی ہمارے بلند ہمّت اولوالعزم بزرگون کے اوصاف حمیدہ ہمسے رخصت ہوگئے بلکہ ان کے برعکس زمانۂ حال کے ہندؤن مین ایسی مذموم عادتین اور رذیل خصلتین پیدا ہوگئی ہین جو ان کے واجب الاحترام اسلاف کے سو کوس بھی قریب نہ پھٹکی تھین۔ یہ بےمثیل امتیاز اسلاف ہند ہی کو حاصل ہے کہ انھون نے ملک گیری کے مقبول عام دستورالعمل سے دانستہ انحراف کرکے اپنے ہمجنسون کی لوٹ مار روا نہ رکھی۔ بلکہ ان کی تمدنی ترقی کے خیال ہی کو مدنظر رکھا۔ اور دنیا مین اپنی اولوالعزمیون کے غیرفانی نشانات چھوڑ گئے۔ جو زمانہ کی دستبرد سے اب تک نیست ونابود نہین ہوسکے۔

زمانہ قدیم کے بلندنظر ہندؤن نے بلاشبہہ غیر ملکون پر پُرامن چڑھائیان کین مگر دوسرون کے زرومال سے مستفید ہونے کے مقصد سے نہین۔ انسانی خون سے زمین رنگنے کے ارادہ سے نہین بلکہ بنی نوع انسان کے اخلاقی اور تمدنی حالت درست کرنے کے خیال سے انھون نے ترک وطن کیا اور تمدن سے ناآشنا قومون کے درمیان بستیان بنائین جو ترقی کرتے کرتے شاندار سلطنتین بن گئین انھون نے متعدد ممالک مین اپنا دھرم رائج کیا۔ لوگون کو اپنے علوم وفنون سکھائے اور رفتہ رفتہ مختلف ممالک کے باشندون کو لوازم تہذیب سے کماحقہ روشناس کرادیا۔

اشاعت تمدن اور اقتصادی ترقی اسلاف ہند کا دستورالعمل اور ان کی معاشرتی حکمت عمل کا اولین اُصول تھا۔ جسکی بدولت ہند تمام دنیا کا محور ہوگیا تھا۔ یہ محض دعوے اور میرا قیاس ہی نہین ہے بلکہ تاریخ عالم کا ایک زبردست واقعہ ہے جس سے کوئی صاحب فہم (جسے تاریخی واقعات کی تحقیقات سے سطحی دلچسپی ہو) کسی طرح انکار نہین کرسکتا ہے۔ سنہ عیسوی کے آغاز سے تھوڑا عرصہ پہلے یا پیچھے بلند ہمّت ہندو اپنے ملک سے روانہ ہوکر ساحل جاوا پر وارد ہوئے۔ اسی طرح اولوالعزم آبادکارون کا ایک دستہ مشرق مین ہند چینی کیطرف بڑھا۔ اور کمبوڈیہ مین ایک عظیم الشان سلطنت قائم کردی۔ اور ایک دستہ اُسی زمانہ مین وسطی ایشیا کیطرف گیا۔ جس کے قدیم کے نشانات ابھی تک صحرائے ختن

تین تین سو میل تک ریت کے تودون کے نیچے دبے ہوئے ہین سنہ عیسوی سے ڈیڑھ دو سو سال پیشتر قنوج کے دو شہزادون نے ایک زبردست بستی آرمینا مین قائم کی تھی جو کئی سو برس تک نہایت تزک و احتشام کے ساتھ برقرار رہی۔ وادیٔ دجلہ فرات اور نیز وادی نیل مین ہندو تمدّن کے نشانات برآمد ہوئے ہین۔ مگر انکی نسبت صرف استدلالی تمثیلی سے مماثلت قائم کی گئی ہے وہان پر ہندو تہذیب کی ایسی شاندار یادگارین نظر نہین آتی ہین جیسی جاوا اور کمبوڈیہ مین سیاحان مغرب کی حیرت و تحسین کی مرکز بنی ہوئی ہین۔

تمدن ہند کی قدامت و عظمت

ہندؤن کو یہ فخر ہے کہ وہ سب سے پرانی قوم ہین۔ انھون نے اپنے ہمعصر قومون کی عظمت و شوکت آسمان تک پہونچتے ہوئے دیکھی اور پھر اسے شہاب ثاقب کی مانند نیستی مین منیست ہوتے بھی دیکھا اُن کے سامنے قومین بنین اور بگڑین۔ بلکہ نیمی راس (آسوریہ کی مردانہ صفت حملہ آور) کی یورش اور سیس طرس اعظم (شاہ مصر) کی یلغار بھی دیکھی۔ ایسرہنی پال اور بنوکدنضیر کے ہمقوم اور نیز محکوم جہان سے مٹ چکے ہین اور اب انکے کارنامے محض افسانہ ہین دارا اور سکندر کی نسل پردہ رنیستی مین مستور ہوگئی ہے حضرت ابراہیم کی اولاد زندہ ہے۔ مگر من حیثیت قوم نہین۔ غرض ہزارہا تاریخی انقلابات ہوئے۔ قومین ہستی سے نیستی مین پنہان ہوچکی ہین مگر بخود تاریخ جدید کے تغیر و تبدل دیکھنے کو اب بھی دنیا مین موجود ہین جو لوگ ابھی زمانہ حال تک ہندؤن کی قدامت کے دعوے کو شک و شبہ کی نگاہ سے دیکھتے تھے وہ بھی اب ان روایات کو تسلیم کرنے پر مجبور ہوگئے ہین درحقیقت اس دعوی کی تائید و تصدیق مین جو ثبوت بہم پہونچے ہین۔ ان سے علمی دنیا مین عظیم تہلکہ برپا ہوگیا ہے۔ اور مغربی محققین اپنے نصف صدی کے مفروضات کے ترمیم و تنسیخ پر مجبور ہوگئے ہین اور جو مسائل برسون سے ارباب فکر کی تاخ سوزی کے موضوع بنے ہوئے تھے۔ اب خود بخود حل ہوگئے ہین۔ ہڑپہ (ضلع منٹگمری) اور ماہن جودارو (لڑکانہ سندھ) کے حیرت انگیز کھنڈرون نے جن کی کھدائی کا کام جو ۱۹۲۲ء سے جاری ہے۔ محکمہ اثریات (آرکیالوجی) کے ڈایرکٹر۔ سرجان مارشل اور دیگر مغربی محققون کو اس صداقت کے تسلیم کرنے پر مجبور کردیا کہ ہڑپہ اور ماہن جودارو کے درمیانی علاقہ کے باشندے اس تمدّن کے مخترع اور موجد ہین جسکے قابل قدر نشانات وادیٔ دجلہ اور فرات مغربی ایشیا۔ وسطی ایشیا۔ اور جزیرہ کریٹ تک پائے جاتے ہین۔ پروفیسر سیس ماہر آثار فلک آسوریہ اور مسٹر لڈن اسمتھ نے جو عجائب خانہ لندن کے شعبۂ اثریات کے مہتمم ہین۔ ہڑپہ اور ماہن جودارو کے آثار قدامت کی بنا پر تمدن ہند کی قدامت چھ ہزار سال قرار دی ہے۔ سرجان مارشل موصوف کی یہ بھی رائے ہے کہ ہڑپہ اور وادی سندھ کے قدیم زمانہ کے باشندے عمدہ شہرون مین رہتے تھے۔ ان کا تمدّن نسبتاً نہایت بلند پایہ تھا۔ ان کے صنعت و حرفت درجۂ کمال پر پہنچ گئی تھی۔ اور ان کا رسم الخط بھی اعلےٰ درجہ کا

مکمل تھا۔ ان کھنڈروں میں پختہ مندر اور اچھے اچھے مکانات پائے گئے ہیں۔ نالیوں پر سنگ مرمر کے تختے جڑے ہوئے ہیں۔ بدروؤں کا نہایت عمدہ انتظام معلوم ہوتا ہے۔ بہت سکے بھی نکلے ہیں جو دنیا میں نیطیر اور سب سے پرانے قرار دیئے گئے ہیں۔ غرض ان دونوں مقاموں سے سیکڑوں چیزیں برآمد ہوئی ہیں جن سے ہزار سال کے تمدن ہند پر خوب روشنی پڑتی ہے۔ ماہرین آثار قدیمہ کی رائے میں وادیٔ سندھ کے اسلاف ہند بلوچستان نیز براستہ بحر مسوپوطامیہ میں پہنچے اور وہاں بھی اپنی بستیاں قائم کرتے ہوئے ایشیائے کوچک تک چلے گئے۔ جس سے ثابت ہوتا ہے کہ اہل ہند قدیم ہی سے اغیار کے درمیان تمدن پھیلانے کا مستحسن کام کر رہے ہیں۔ اب سے تین چار ہزار سال پہلے وادی دجلہ و فرات کے درمیان تمدن ہند کی اشاعت استدلال تمثیلی یعنی آثار قدیم کی باہمی مشابہت سے ثابت ہے اور اب سے دو ہزار سال پہلے ہندوؤں نے جو بستیاں غیر ممالک میں بسائی تھیں اُن کے کوہ پیکر نشانات اسوقت بھی باقی ہیں اور زبان حال سے ہندو تمدن کی عظمت کی لازوال داستان بیان کر رہے ہیں۔

غیر ملکوں میں ہندو بستیاں

جیسا کہ اوپر ذکر ہو چکا ہے وادیٔ ہائے دجلہ و فرات اور نیل میں ہندو نوآبادیوں کے ثبوت صرف تمدنی آثار میں پائے جاتے ہیں۔ مگر جنوب مشرقی ایشیا کی ہندو بستیوں کے شاندار نشانات اب بھی سنگلاخ عمارتوں اور کتبوں کے شکل میں موجود ہیں۔ وہاں کے لٹریچر اور معاشرت پر بھی ہندو طرز بود و باش کا نہ مٹنے والا اثر نمایاں ہے۔ اسلئے سب سے پہلے جاوا اور سماٹرا اور بلی کی ہندو بستیوں کا ذکر ہوگا پھر ہند چینی اور ترکستان کی ہندو آبادیوں پر بحث کی جائے گی۔

جاوا میں ہندو تمدن کے آثار

کرنیل ٹاڈ صاحب نے اپنی "راجستان" میں لکھا ہے کہ

"مجمع الجزائر ہند سورج بنسیوں نے آباد کیا تھا جن کے کارنامے اور دیوبرتانت وہاں کے کہنہ سال عمارتوں پر منقش اور کتابوں میں قلمبند ہیں"۔ مشہور مورخ الفنسٹن صاحب بھی رقمطراز ہیں کہ "تاریخ جاوا سے بخوبی ثابت ہوتا ہے کہ کالنگہ دیش کے بہت سے ارکان وطن جزیرہ جاوا میں وارد ہوئے۔ اور وہاں کے باشندوں کو ہندو تمدن کا سبق سکھایا اور اپنا سن جاری کیا۔ جو اب تک رائج ہے"۔ جاوا کے انگریز گورنر اور مورخ سر اسٹامفرڈ رفلز کی رائے ہے (جس سے پروفیسر ہیرن نے بھی اتفاق کیا ہے) کہ جاوا کے مشرقی ساحلوں کو براہمنوں نے آباد کیا تھا۔ سیول صاحب مسٹر فرگیوسن کی تائید کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ۷۵۶ء میں ایک راجہ گجرات سے پانچ ہزار براہمنوں کے ساتھ جاوا میں وارد ہوا اور ماترام میں ایک

بستی قائم کی اس قسم کی رائین دیگر مغربی عالمون نے بھی اب سے چالیس پچاس سال پہلے ظاہر کی تھین اور گذشتہ چوتھائی صدی کی اثری تحقیقات سے ان خیالات کی صحت ثابت ہو گئی ہے۔ غرض جاوا اولوالعزم ہندو آباد کارون کی شاندار نوآبادی اور زمانۂ بعد کی پُرشوکت ہندو سلطنت تھا۔

جزائر مجمع الہند مین جاوا سب سے بڑا اور نہایت گنجان ہے۔ اسکا رقبہ معہ جزیرہ مدورا پچاس ہزار چار سو مربع میل اور آبادی تین کروڑ سے متجاوز ہے۔ تقریباً سو سال سے ڈچ حکومت ہے۔ آجکل اہل جاوا کا مذہب اسلام ہے۔ گو روزانہ زندگی پر اب بھی قدیم ہندو خیالات اور رسم و رواج کا تسلط ہے۔ جاوا کا سنسکرت نام یاوَدیپ ہے۔ جس کے معنی "جو اور منڈوے کا ملک" ہے۔ جنوبی ہند کے شہر مدورا کے نام پر جاوا کے پاس بھی ایک جزیرہ کا نام مدورا رکھا گیا ہے جاوا کے جغرافیائی نام سنسکرت سے مستعار ہے۔ وہان کے مشہور آتش خیز پہاڑ کا نام سمیرو ہے۔ کہ جسکا ذکر اکثر پورانون مین آیا ہے۔ چنڈی ارجنو۔ چنڈی بیمو یعنی ارجن اور بھیم کی یادگارین۔ سکُ بومی (سکھ بھومی) "سرزمین راحت" پرم بن وغیرہ بھی سنسکرت ہی کے نام ہین۔ اہل جاوا کی زبان مین بھی سنسکرت الفاظ کثرت سے پائے جاتے ہین۔ اور جاوا کا ادبیات ہندو لٹریچر کا عکس ہے۔ مثلاً بارت یُدّ (بھارت یدھ یعنی مہابھارت) "ارجن پورہ" وغیرہ۔ مہابھارت اور گیتا کا بڑا رواج ہے۔ اکثر تقریبون پر اب بھی انھین کی تلاوت کیجاتی ہے۔ دارالصدر بٹاویہ سے جو کتبے برآمد ہوئے ہین۔ ان مین راجہ پورن ورمن کی بہت تعریف لکھی ہوئی ہے۔ دیگر کتبون سے ظاہر ہوتا ہے کہ ابتدائی ہندو آباد کار ویشنومت کے پیرو تھے۔ بعد کی تاریخ نہین ملتی جب ہندو وسطی اور مشرقی حصّون مین آباد ہو گئے تو ظاہر ہوتا ہے کہ ویشنومت کی جگہ شیو پوجا نے لے لی۔ ۱۴۱۲ء مین چینی سیاح فاہیان جاوا مین گیا۔ وہ ہندو آباد کارون کے عروج اور خوش حالی کا ذکر کرتا ہوا لکھتا ہے کہ ہندوؤن کو اس جزیرہ کے اصلی باشندون کے درمیان اپنا مذہب رائج کرنے مین حیرت انگیز کامیابی نصیب ہوئی ہے اور انھون نے اپنے نئے وطن کو اپنی بےنظیر صنعت اور شائستگی کے دائمی نشانات سے مزیّن کر دیا ہے۔ وہانگ اور اہانگ کے کتبون سے ثابت ہوتا ہے کہ مغربی اور وسطی حصّون کے ہندو مت باہم دگر پیوست تھے اور ان کا زور ۹۲۸ء تک رہا۔ ۷۷۸ء کے کتبون سے جو کشن اور جے جے کرتا سے برآمد ہوئے ہین ظاہر ہوتا ہے کہ بودھ مت اور شیومت آپسمین شیروشکر ہو گئے تھے۔

یہان پر مغربی عالمون کے تازہ ترین رائیون کا اقتباس خالی از لطف نہ ہوگا۔

جاوا مین ہندو اقتدار پانچوین صدی سے شروع ہوا تھا اس جزیرہ کے مذہب اور لٹریچر طریقۂ حکومت اور زبان۔ رسم الخط اور فنون پر ہندو عظمت کا دائمی اثر نمایان ہے۔۔۔۔ ہندو آباد کارو

کی مساعی حسنہ سے شاندار سلطنتین معرض وجود مین آئین - جاوا کے ہندو تمدن کی شوکت کا اثر سماٹرا - بورنیو - اور جزائر ملایا تک پہونچا - بعض عالمون کی رائے مین ہندو اقتدار کا اثر پاپوا اور آسٹریلیا تک نمایان پایا گیا ہے - (ماخوذ از نیو انٹرنیشنل انسائیکلوپیڈیا جلد ۱۱ صفحہ ۱۵۴)

ذیل کا اقتباس انسائیکلوپیڈیا برطانیکا (گیارھوان اڈیشن جلد ۱۵ صفحہ ۲۵۲ سے دیا جاتا ہے -

تاریخ جاوا کا سب سے پہلا باب ہندو شوکت سے شروع ہوتا ہے جو تین زمانون پر منقسم ہے اوّل بودھ مت کا عہد - دوم شیو پرستی کے غلبہ کا زمانہ - سوم ان دونون کے باہمی ملاپ کا قرن ہے - جاوا مین جتنی ہندو سلطنتین قائم ہوئی ہین - ان مین سب سے زبردست اور مشہور وہ ہے جو پندرھوین صدی تک رہی - اور کئی حکومتین بھی اسکی باجگزار تھین اور اسی کی شوکت کا اثر دور افتادہ جزائر تک بھی پہونچا تھا جہان ہندؤن کی بہت سی عظیم الشان یادگارین ابھی تک پائی جاتی ہین - ان کی تعمیر کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ محرابون اور ستونون کے بنانے مین چونہ سے کام نہین لیا گیا - وسطی خطّہ کے مندر آٹھوین اور دسوین صدی کے ہین -

ہندو سلطنت کی عظمت ساتوین صدی سے لیکر بارھوین صدی تک رہی - اسکے بعد پندرھوین صدی مین جاوا مین اسلام کی ابتدا ہوئی - جاوا اور بلی کی موجودہ حالت کیا ہے؟ اس دلچسپ سوال کے جواب مین ملک الشعراء ڈاکٹر رابندر ناتھ ٹیگور کے خیالات کا خلاصہ بیان کرنا بیجا نہ ہوگا -

جولائی ۱۹۲۷ء مین آپ دو چار اور بنگالی احباب کیساتھ جاوا - بلی - ملایا - سنگاپور - اور سیام کی سیاحت کو گئے تھے - جہان سے آخر اکتوبر گذشتہ مین آپ واپس آئے - چنانچہ ڈاکٹر موصوف نے اخبار "اسٹیٹسمین" کلکتہ کے ایک نمایندہ سے دوران مکالمہ مین یہ فرمایا کہ "ہندو فلسفہ اور ہندو خیالات کا جیسا خوشنما اظہار جزائر جاوا اور بلی مین ہوا ہے ویسا ہمنے اور کہین نہین دیکھا - خصوصاً اہل بلی کی معاشرت تو ہندو تہذیب و تمدن کا ابھی تک سکہ بیٹھا ہوا ہے چنانچہ مہابھارت اور رامائن کا تو وہان کے لوگون کی روزمرہ کی زندگی مین بہت بڑا اثر ہے - حتی کہ خود ہندوستان مین مہابھارت و رامائن عوام کے زندگی پر اسطرح متسلط نہین ہین جیسے کہ جاوا اور بلی مین ہین وہان کی صنّاعی اور موسیقی ناچ رنگ اور تماشے کو ان دونون کتابون سے تحریک حاصل ہوئی ہے - غرض جو مقبولیت سنسکرت کی رزمیہ شاعری کو وہان حاصل ہوئی ہے وہ ہندو فلسفہ کو بھی نصیب نہین ہوسکی"

جاوا مین ہندو تسلّط کی غیر فانی یادگار بورو بدر کا کوہ پیکر مندر ہے جو سطح مرتفع دہانگ پر واقع ہے - یہ پہاڑی ساڑھے چھ ہزار فٹ بلند ہے اور اسکے اوپر آنے جانے کے لیے عمدہ سڑک بنی ہوئی ہے

جس کے دو ہزار سات سو زینے ہین - اوپر کے پانی کے اخراج کے لیے جو نہر بنی ہوئی ہے وہ اگلے زمانے کے ہندوؤن کی صنّاعی کا قابل تعریف نمونہ ہے - اسی حظّہ مین مندر واقع ہے اور اس کی بلندی اردگرد کے میدان سے ڈیڑھ سو فٹ ہے - اس کی چار منزلین ہین اسکے بیرونی حصّہ مین لاوے کے سنگلاخ ڈھیلے صاف کرکے پیوست کئے گئے ہین جو بہت بڑے اور وزنی ہین - سنگ تراشی کی نازک اور دلفریب صنعت کاریون سے اس مقدّس مندر کو آراستہ کرنے مین کوئی دقیقہ فروگذاشت نہین کیا گیا ہے - اعلیٰ ترین دستکاری کے ہزارہا نمونے در و دیوار - فرش اور چھت اور پہلوؤن مین موجود ہین - صدہا آراستی مورتیان اور زیبائشی بیل بوٹے - انسانی اور حیوانی نباتاتی تشکلین منقش ہین - ماہرین کا یہ اندازہ ہے کہ اگر ان تمام مورتیون کو پہلو بہ پہلو آراستہ کیا جائے تو ان کے لیے تین میل لمبا میدان درکار ہوگا - ان کا کل شمار دو ہزار ایک سو اکتالیس ہے - بورو بدر کی ابتدائی منزل کا ہر ایک ضلع چار سو ستانوے فٹ اور بلندی بچاس فٹ ہے - سب کے اوپر ایک بڑا گنبد ہے کہ جسکا قطر باون فٹ ہے - اس کے اردگرد اور سولہ گنبد ہین جو سب سے سب بڑے گھنٹے کی مانند ہین - پرمبن کے مندر بھی گذشتہ ہندو عظمت کی زندہ یادگار ہین -

جاوا اور بلی کے باشندون کے طور و طریقے ہندوانہ ہین - چنانچہ جزیرۂ بلی مین اب تک ستی کا رواج ہے - وہان کے لوگ اسلام کے دائرہ مین نہین آئے ہین دونون جزیرون کے لوگ ہندو رسم و رواج کے پابند اور ہندو تیوہارون کے معتقد ہین مسجدون مین نماز خاص موقع ہی پر پڑھی جاتی ہے - بالفاظ دیگر اہل جاوا صرف نام کے مسلمان ہین -

کمبوڈیہ مین قدیم ہندو شوکت کے نشانات

سنہ عیسوی سے کچھ عرصہ پیشتر ہندوستان کے مشرقی ساحل - غالباً ساحل بنگال سے کئی مقتدر روسا اپنے وفادار ساتھیون کے ساتھ کہ جنمین براہمن کشتری - ویش وغیرہ قومون کے افراد تھے - ہند چینی کو گئے اور ایک بستی قائم کرلی - کہ جس سے کمبوڈیہ مین رفتہ رفتہ ہندو سلطنت قائم ہوگئی - اس ملک کی روایات کے رو سے ابتدائی ہندو آبادکارون کا سردار ہمارا جدّی کارا جکار پریہ سنگھ تھا - اور ناگ ان کا خاص قومی نشان تھا اسی وجہ سے ان کے مندرون اور قلعون اور دیگر عظیم الشان عمارتون پر سانپ کی مورت بنی ہوتی تھی - جو اب تک کمبوڈیہ کی تاریخی عمارتون پر پائی جاتی ہے - کمبوڈیہ کے پرانے باشندے تہذیب سے بالکل بیگانہ تھے - اسلئے انہون نے مذہب اور ہندو تمدّن کو قبول کرلیا - جدید اثری تحقیقات سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ پانچوین صدی عیسوی مین یہان پر ہندو دھرم کا عام رواج تھا - اور ہندو ادبیات نے یہان کے اصلی باشندون کو اپنا گرویدہ بنالیا - دیگر علوم و فنون بھی مقبول عام ہوگئے تھے - پر اُنے باشندے اپنی قومی روایات کو فراموش

کرکے ہندو مذہب اور دیگر باتون پر دل وجان سے قربان تھے۔ شترورمن کے زیر کمان ہندو آباد کارون کو بڑا عروج حاصل ہوا۔ مگر ساتوین صدی مین شترورمن کے شاہی خاندان کا نام مٹ گیا۔ اور ہندو سلطنت دو حصّون مین بٹ گئی۔ اور دو حکمران حکومت کرتے تھے۔ نوین صدی کے آغاز مین ان دونون خاندانون مین پھر اتفاق واتحاد ہوگیا۔ اور جے ورمن سوم کے شاہی خاندان کی حکومت شروع ہوئی کہ جسکے دوران مین ہندو تہذیب کو غیر معمولی عروج حاصل ہوا۔ اسی مبارک عہد مین وہ شاندار عمارتین تعمیر ہوئی تھین جو اب تک ہندو صنعت کی بہترین یادگارین سمجھی جاتی ہین۔ انک کرراجدھانی قرار پایا جس کی تعمیر کی تکمیل جیشو ورمن نے ۹۰۰ء مین کی تھی۔ جب ہندو سلطنت کا اقبال بلند ہوا تو ہندو دھرم راج دھرم قرار پاگیا اور دسوین صدی تک مروّج رہا پھر بودھ مت پھیلنا شروع ہوا تھا انک ور کا مشہور مندر بارھوین صدی کے پہلے حصّہ مین تعمیر ہوا تھا یشودھرپور کا راجہ کا میر عمارت اور کارمختار تھا کہ جسکے زیر ہدایت یہ عظیم الشان مندر تعمیر ہوا وہ اپنے زمانہ کے تمام ہندو حکمرانون کا منظور نظر تھا۔ اُس زمانہ مین چمپہ کا راج کوچین چائنا اور جنوبی انام پر حاوی تھا۔ کہ جے ورمن ہشتم کے عہد مین بارھوین صدی کے اخیر مین مفتوح ہوکر کمبوڈیہ کی ہندو سلطنت مین شامل ہوگیا موجودہ سیام اور چین کے جنوبی صوبے بھی ہندو راج کے زیر نگین تھے۔ یہ سلطنت ایک وقت مین موجودہ ہند چینی پر متسلط تھی۔

موجود الوقت کمبوڈیہ مین انھین پرانے ہندؤن کی اولاد اب بھی بستی ہے۔ راجہ بھی ہندو نسل سے ہے جو کئی برس سے فرانس کے زیر سایہ راج کرتا ہے۔ ہندو ورن آشرم صدہا سال سے وہان پر قائم چلا آتا ہے۔ گو لوگون کا عام دھرم بودھ مت ہے۔ مگر رسم ورواج اور خیالات اور ادبیات اور دیگر فنون پر ہندو تمدّن کا استمراری اثر منقش ہے۔ براہمنون کا زور ہے۔ ہندو توہمات بھی عام ہین زبان پر بھی سنسکرت الفاظ کا تصرّف ہے۔ راج دربار کے فرائض براہمنون کی اولاد انجام دیتی ہے۔ شاہی نسل کے لوگ "برونبش" کہلاتے ہین۔ ولیعہد "اُپ راج" کہلاتا ہے۔ دریاکو اہل کمبوڈیہ "میگان" کہتے ہین جس کے معنی گنگا ماتا کے ہین شہر کو وہ نگر کہتے تھے۔ جو بگڑکر اب انگر رہ گیا ہے۔ ملک کا نام کمبوڈیہ کمبوج سنسکرت سے مستعار ہے جسکا ذکر مہابھارت اور پورانون مین آیا ہے۔ غالباً اس ملک کا پہلا ہندو فرمانروا کمبو تھا جس کی وجہ سے اسکا نام قرار پایا۔ کمبوڈیہ مین ہندو عظمت کی سب سے بڑی یادگار انگروت کا عظیم الشان مندر ہے جو جنوبی ہند کے مندرون کے طرز پر تعمیر کیا گیا ہے۔ اسکی دیوارون پر سینکڑون نفیس مورتیان اور نقش ونگار کندہ ہین جسمین کرشن جی۔ رامچندر جی۔ راون اور گرڑ وغیرہ خاص طور پر قابل ذکر ہین۔ "اننت سرپ" کی مورتی ہر جگہ دکھائی دیتی ہے۔ اور سینکڑون دیویان دیوتے بھی ہر جگہ کندہ کئے گئے ہین۔ مندر کا وسطی گنبد ایک سو اسّی فٹ بلند ہے۔ اور اسکی پراکا کا ایک پہلو نصف میل لمبائی مین ہے اس سے اسکی وسعت کا

اندازہ ہوسکتا ہے۔ مندر کی چار دیواری سنگلاخ ہے اور ہر طرف دو دو میل تک پھیلی ہوئی ہے۔ دیوار بیس اور تیس فٹ بلند ہین اسکے اندر جانے کے لیے پانچ عظیم الشان دروازے ہین۔ شاہی محلات اور مندر دونون اسی وسیع احاطہ کے اندر واقع ہین مندر کے پچاس بڑے بڑے میناروں پر برہما کی چوکھی مورتیان ہین جو ہندو صناعی کا بہترین نمونہ سمجھی جاتی ہین۔

کمبوڈیہ کے میدانون جنگلون اور پہاڑون مین اب تک پرانے شہرون مندرون اور قلعون کے نشانات پائے جاتے ہین علاوہ بریں پرانے ہندو آبادکارون نے آمد و رفت کی عمدہ سڑکین بنوائی ہین دریاؤن اور ندی نالون پر پختہ اور مستحکم پل بنوائے تھے جن کے کھنڈر اب تک پائے جاتے ہین۔ سلسلۂ انہار بھی قائم کیا تھا۔ جو ہندو انجینیرون کی ہنرمندی پر دال ہے۔ ابھی یہ نہین معلوم ہوا ہے کہ ہند چینی مین ہندو شوکت کو کیونکر زوال لاحق ہوا۔ لیکن آثار سے معلوم ہوتا ہے کہ ان پر کوئی آفت ناگہانی نازل ہوئی۔ زلزلہ یا پلیگ وغیرہ۔ جس سے چشم زدن مین ساری عظمت ہند نابود ہوگئی۔ فرانس کا محکمۂ آثار قدیمہ بھی تحقیقات اور پرانی عمارتون کی شان بحال کرنے مین مصروف ہے۔

وسطی ایشیا مین ہندو تمدن کے آثار

پچاس ساٹھ سال سے مغربی عالمون کا یہ خیال ہے کہ وسطی ایشیا یعنی ترکستان خُتن مین بھی ہندو آبادیان تھین۔ ٹاڈ صاحب اپنی "راجستان" مین لکھتے ہین "عبدالغازی متسک کا ذکر کرتا ہے کہ جو ترک کا بیٹا تھا پورانون مین اسے ترشکہ بیان کیا گیا ہے۔ اسکی اولاد نے اس ملک کو تورک استھان یعنی ترکستان کا نام دیا تھا" میکس مولر کی رائے ہے کہ ترکہ اور اسکی اولاد جو تورانیون کی نمائندہ ہے۔ زمانۂ مابعد کی زرمیہ کتابون مین مذکور ہے۔ اسے ملون لکھا ہے کہ جو اپنے ورثہ سے محروم ہونے سے ترک وطن کرنے کو مجبور ہوئی تھی" ایک مسلمان مورخ (بقول ہنٹر) دسپر یارٹی راوی ہے "ملک خطا کو ابتدا مین ہندو آبادکارون نے آباد کیا تھا" یہ امر موجب مسرت ہے کہ نصف صدی پہلے کے خیالات اور پورانون اور مہابھارت کے جوابون کی تائید و تصدیق سر آرل اسٹائن اور کرین ہیڈن کی تحقیقات سے بھی بخوبی ہوتی ہے کہ جو موجودہ صدی کے آغاز سے ہوتی چلی آئی ہے اور اسبارے مین سر آرل موصوف نے ہند پر جو احسان کیا ہے اُس سے سبکدوش ہونا امر محال ہے۔

ترکستان کے مشرقی حصہ مین ہندؤن کی جو بستی تھی اسکے نشانات صحرائے خُتن مین پائے گئے ہین۔ کتبے۔ سکّے۔ مسودّے اور بیسیون چیزین برآمد ہوئی ہین۔ جن سے ہندو آبادکارون کے تمدنی ترقی پر معتدبہ روشنی پڑتی ہے۔ سنگ تراشی کے نمونے بھی دستیاب ہوئے ہین۔ جو ہندو صناعی کا قابلقدر

نونہ ہین سر آرل اسٹائن نے سنہ ۱۹۰۰ء اور سنہ ۱۹۰۱ء مین صحرائے ختن کے مدفون کھنڈرون کی کھدائی کی تو سینکڑون پرانی چیزین برآمد ہوئین۔ پہلی اور دوسری صدی عیسوی کی نقاشی اور کارچوبی کے نمونے ہاتھ آئے ہین تحریرین ہندی رسم الخط مین ہین۔ بعض سنسکرت مین اور پراکرت بھاشا مین بھی ہین۔ اسی راستہ سے بودہ مت چین مین پہنچا تھا۔ سر آرل اسٹائن کا اندازہ ہے کہ مشرق سے مغرب تک تین سو میل کی لمبائی مین اڑتی ریت کے نیچے مدفون شہرون کے کھنڈر پائے جاتے ہین۔ غرض موصوف کی رائے مین "ہر چیز پر ہندو تمدن کا نقش نظر آتا ہے"۔

چوبی لوحون اور چرمی پرزون پر صدہا تحریرین دریائے نیہ کے آگے کی سرزمین سے ہاتھ آئی ہین جو خروشتی حروف مین ہین ایک تختی پر پراکرت پائی گئی ہے کہ جس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ دوسری تیسری صدی عیسوی مین پنجاب سے لیکر ختن تک یہی ہندون کی عام بولی تھی۔ پروفیسر راپسن کا خیال یہ ہے کہ خط تو خروشتی مگر زبان پراکرت تھی جسمین سرکاری احکام نافذ ہوتے تھے۔ ختن کے ملک کو ٹکسلا کے ہندون نے سن عیسوی سے دو سو سال پہلے فتح کیا تھا۔ سر آرل موصوف اس امر کی نسبت حیرت کا اظہار کرتے ہین کہ روزمرہ کی معاشرت کے حالات ہندوستانی زبان مین قلمبند پائے جاتے ہین بہرحال ان واقعات سے واضح ہوگیا ہے کہ ترکستان مین بھی ہندو آبادکارون نے اپنا دھرم اور تمدن رائج کیا اور پھر حکومت قائم کردی۔

جے۔ آر۔ رائے

نوع انسان کی تاریخ مین ہمیشہ کچھ لوگ ایسے ہوتے رہین گے جو تکلیف برداشت کیا کرینگے۔ اور کچھ ایسے جو دوسرون کو تکلیف دیتے رہین گے اور بدی کا خاتمہ کبھی بھی پوری طرح سے نہ ہوسکے گا۔ بلکہ جس طرح شعلہ روشن رہتا ہے اسی طرح یہ ایک مسلسل کیفیت ہمارے تمدن مین بھی قائم رہے گی۔

(ٹیگور)

حسن ہمکو شیرین معلوم ہوتا ہے اسلئے کہ وہ ہماری زندگی کے ساتھ دیر تک قائم نہ رہنے والے سرود پر رقص کرتا ہے۔ علم گران بہا ہے اسلئے کہ ہمارے پاس اسکو مکمل کرنے کا وقت نہین ہے۔

(ٹیگور)

اتحاد مذاہب

(از جناب لالہ روشن لال صاحب بیرسٹرایٹ لا۔ لاہور)

تو برائے وصل کردن آمدی
نے برائے فصل کردن آمدی

ابتدائے آفرینش ہی سے بنی نوع انسان کے ہر طبقے نے خواہ وہ مغربی ہو یا مشرقی مذہب کی ضرورت محسوس کی ہے، اور اگر مذہب نہ ہوتا تو انسان جانور سے بھی بدتر ہوتا۔ چنانچہ جہاں مذہب کی روشنی نہیں پہونچی وہاں آدمی کو آدمی کھانے لگا۔ لیکن جیوں جیوں انسان مذہب کے راستے پر چلکر مہذب بنا دنیا سے ظلم وستم، خونخواری و بداخلاقی دُور ہوتی گئی اور اخوتِ انسانی پھیلنے لگی۔

دنیا کی پرانی سے پرانی مذہبی کتاب دیکھو یا نئی سے نئی مذہبی کتاب پڑھو۔ فروعات کے علاوہ اصولوں میں کوئی فرق نہ پاؤ گے۔ مگر اختصار کی غرض سے میں اس مضمون میں تمام مذاہب دنیا کا اصولی اتحاد دکھانے کے بجائے صرف ہندوستان کے مروجہ مذہبوں کی یگانگت دکھانے پر اکتفا کرتا ہوں۔ ہندوستان خلاصۂ جہان مشہور ہے، اس لئے اس کے مذاہب کو بھی اگر مذاہب دنیا کا خلاصہ کہا جائے تو بیجا نہ ہوگا۔ کیونکہ آج اسلام ہندوستان کے علاوہ عرب۔ فارس۔ افغانستان وٹرکی وغیرہ وغیرہ ممالک کا مذہب ہے۔ عیسائی مذہب بھی تمام دنیا میں پھیلا ہوا ہے۔ جین و بدھ مت اور یہودی مذہب کے پیرو بھی ہندوستان میں موجود ہیں۔ غرض صفحۂ ہستی کا مشکل سے کوئی مذہب ایسا ہوگا جو آج ہندوستان میں موجود نہ ہو۔ اس لئے اگر ان مذاہب میں اصولی اتحاد دکھایا جاوے کہ جو ہند میں رائج ہیں تو وہ ہمارے اغراض کے لئے کافی ہوگا۔ کہا جاتا ہے کہ دنیا کی سب سے پرانی مذہبی کتاب وید ہے۔ لیکن اگر کسی صاحب کو یہ تسلیم نہ ہو تو مجھے اسپر کوئی خاص اصرار نہیں ہے۔ لیکن جو صاحب اس پر اعتراض کریں وہ مہربانی کرکے یہ بتادیں کہ وہ کس مذہبی کتاب کو سب سے قدیم کتاب مانتے ہیں کیونکہ میں اپنے دعوے کے ثبوت میں اسی کو پیش کرونگا۔

چونکہ موجودہ واقفیت کے مطابق مجھے اس وقت تک ویدوں سے زیادہ پرانی کتاب معلوم نہیں اس لیئے میں ویدوں سے ہی شروع کرتا ہوں، کیونکہ

مذہب نہیں سکھاتا آپس میں بیر کرنا

اول سب سے ضروری اور اہم مسئلہ توحید ہے۔ چنانچہ میں اس بارے میں وید کا صرف ایک منتر لکھنا کافی سمجھتا ہوں۔ یہ یجروید کے چالیسویں ادھیائے کا مشہور منتر ہے اور ایش اپنشد میں بھی آٹھواں منتر ہے جسمیں خدا کی تعریف اس طرح بیان کی ہے۔

"وہ قادرِ مطلق۔ حادی کل۔ روشنی کا مرکز جسمانیت سے بری۔ پاک۔ حاضر و ناظر۔ خود اپنی قدرت سے ہویدا ہونے والا اور سب کے دلوں کا حال جاننے والا ہے۔ اسی قادر مطلق نے جملہ قوانینِ قدرت جن پر ہر شے اور ہر ایک ہستی عمل پیرا ہے ابتدا ہی سے قائم کر دیئے ہیں۔"

بعض اصحاب کا یہ خیال ہے کہ گو ویدوں میں وحدانیت ہے، مگر خداوند کریم کی جملہ خوبیاں عناصر کی صورت میں دکھلائی گئی ہیں۔ ہوا۔ پانی۔ آگ وغیرہ سب کو خدا تصور کیا گیا ہے۔ یہ اعتراض ہمارے مغربی بھائی ویدوں پر کرتے ہیں۔ لیکن اگر ویدوں کے منتر جن میں پیدائش عالم کا ذکر ہے غور سے پڑھے جائیں تو یہ وہم قطعاً دور ہو جاتا ہے۔ پرماتما ہی کو سورج۔ چاند اور تمام کائنات کا بنانیوالا ویدوں نے لکھا ہے اور اسکی توضیح سر نیراشور وترا وپنشد نے بہت عمدگی سے ایک استعارے کی صورت میں کر دی ہے جس کا منشا محض یہی معلوم ہوتا ہے کہ اگنی واندر وغیرہ الفاظ سے جو پرماتما کے لئے بھی استعمال کئے گئے ہیں کسی کو مغالطہ نہ ہو۔

روایت اس طرح پر ہے کہ اگنی دیوتا۔ برن دیوتا۔ اور وایو دیوتا کو مجسم ایک جلال جس طرح کہ حضرت موسیٰ کو کوہ طور پر نظر آیا تھا دکھائی دیا جس سے وہ سب حیران ہو گئے۔ اور اسکا راز دریافت کرنا چاہا۔ سب سے اول اگنی دیوتا تشریف لے گئے اور انھوں نے دریافت کیا کہ آپ کون ہیں۔ جواب ملا کہ اول آپ بتائیں کہ آپ جو سوال کرتے ہیں کون ہیں۔ جواب میں نہایت غرور سے اگنی دیوتا نے کہا کہ میں وہ طاقت ہوں کہ ایک آن واحد میں تمام کائنات کو جلا کر خاک کر دوں۔ مجھی سے دنیا کی روشنی و زندگی ہے۔ اُس نور نے ارشاد کیا کہ ایک تنکا گھاس کا جو وہاں پڑا تھا اُسکو جلا کر دکھائیے اور اپنی طاقت کا ثبوت پیش کیجئے۔ تحریر ہے کہ اگنی دیوتا نے اپنی ساری طاقت خرچ کر دی لیکن وہ تنکا نہ جلا۔ تب وہ شرمندہ ہو کر واپس آئے اور برُن دیوتا سے کہا کہ آپ جائیں میں تو حیران اور شرمندہ ہو کر واپس آگیا ہوں۔

برُن دیوتا جو پانی کی طاقت کا نام ہے اور وایو دیوتا جو ہوا کی طاقت کا نام ہے سب باری باری

شرمندہ ہو کر لوٹ آئے اور اپنا عجز تسلیم کیا اور مانا کہ یہ سب طاقت جو ہم میں ہے تیری ہی عطا کی ہوئی ہے۔

اسپر بھی شاید کوئی صاحب اعتراض کریں کہ ذات باری تعالیٰ کے لئے ویدمیں "واحد" کا لفظ آیا ہے یا نہیں اس کے جواب میں صرف اتنا کہدینا کافی ہوگا کہ زیادہ تر ویدمنتروں میں تعریف و توصیف وحمد باری ہی نظر آتی ہے لیکن یہاں پر ایک اور منتر بھی لکھدینا نامناسب نہ ہوگا۔ یہ منتر قُلْ هُوَ اللّٰهُ کی طرح مختصر بھی ہے۔ یہ رگ وید کے آٹھویں منڈل کے ساتویں سوکت وتیسرے ادھیا کا پہلا منتر ہے۔

"ہر نیہ گربھاہم ورت تاگرے بھوتسیہ جاتا پت ریک آسیت۔ سدا دھار پرتھویم دیامُتی مانگ کسمے دیوائے ہوشا بدھما"

हिरण्यगर्भः समवर्त्तताग्रे भूतस्य जातः पतिरेक आसीत ।
सदा धार पृथिवी ध्यामुतेमां कसमै देवाय ईवषविधेम

"اے منبع نور لایزال جس سے پہلے کوئی نہ تھا۔ تو ہی سب کا پیدا کرنیوالا ہے اور ایک ہے۔ بلاشبہ سب کا مالک ہے اور اس زمین و آسمان کا قائم رکھنے والا تو ہی ہے۔ ہم تیری عبادت کرتے ہیں۔ کیونکہ سرور موفور کا خزانہ بھی تو ہی ہے، اور تجھکو تہ دل سے سجدہ کرتے ہیں"

اسقدر تو وید کا ارشاد ہے۔ اب وید کے بعد مجھے توریت نظر آتی ہے۔ وہاں تو خدا کی وحدانیت کو صاف طور پر تسلیم کیا گیا ہے اور اس میں کسی شک و شبہ کی گنجایش نہیں ہے۔ اور انجیل میں حضرت مسیح نے خدا کی بھگتی کو ان الفاظ میں ادا کیا ہے کہ اپنے خدا کو پورے دل اور پوری روحانی طاقت سے پیار کرو۔ اور اپنی ہر قسم کی ساری طاقت اسی کی محبت میں لگادو۔ زیادہ وضاحت کے ساتھ آئتیں لکھی جائیں تو مضمون بہت طولانی ہو جائیگا۔ پارسی مذہب بہت کچھ وید کے موافق ہے جس کے بارے میں کئی کتابیں شائع ہو چکی ہیں سب سے آخری الہامی کتاب قرآن مجید ہے۔ لہذا یہاں پر اس آخری الہام کا ابتدائی الہام سے موازنہ کرنا کچھ بیجا نہ ہوگا۔ یجروید کے آخری منتر کا عربی ترجمہ قرآن مجید کی پہلی آیت میں نظر آتا ہے اور یہ فقط میرا ہی خیال نہیں ہے۔ بلکہ رائے بہادر ٹھاکر داس صاحب بھون کا بھی جو ویدوں کے اچھے ماہر ہیں۔ یہی خیال ہے اور الفاظ خود اس کے شاہد ہیں۔ آفتاب آمد دلیل آفتاب۔ بحث کی گنجایش ہی نہیں ہے۔ وید میں آریہ اُن لوگوں کو کہا گیا ہے جو راہ راست پر ہیں۔ یا جنھوں نے صراط مستقیم اختیار کیا ہے اور دستوادن کو کہا گیا ہے جو غلط راستہ پر دیدہ و دانستہ چلتے ہیں۔ اس کے مقابلے میں قرآن شریف میں بھی وید مقدس کی طرح مومن و کافر دو ہی تفریق کی گئی ہے اور جو الہام قرآن شریف سے پہلے آچکے ہیں۔ ان کے تسلیم کرنے کا حکم بھی موجود ہے۔

وَالَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ وَبِالْاٰخِرَةِ هُمْ يُوْقِنُوْنَ

کافروں کے جہاں اور نقص قرآن مجید نے بتلائے ہیں وہاں اون کو مفسد بھی کہا ہے اور ایسے مفسد جو یہ تسلیم نہیں کرتے کہ ہم مفسد ہیں۔ گو در اصل مفسد وہی ہیں۔ سورۃ البقر کی آیت یہ ہے:۔

اِذَا قِيْلَ لَهُمْ لَا تُفْسِدُوْا فِي الْاَرْضِ قَالُوْٓا اِنَّمَا نَحْنُ مُصْلِحُوْنَ اَلَآ اِنَّهُمْ هُمُ الْمُفْسِدُوْنَ وَلٰكِنْ لَّا يَشْعُرُوْنَ۔

اس سے آگے کلام ربانی میں ایک اور آیت ہے جس کو دل قبول کرتا ہے اور جسے ہر مسلمان بھائی کو جسے اتحاد سے اُنس ہے ہمیشہ یاد رکھنا چاہیئے وہ آیت یہ ہے:۔

اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَالَّذِيْنَ هَادُوْا وَالنَّصٰرٰى وَالصّٰبِـِٕيْنَ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ

ترجمہ اس کا صاف ہے:۔ اس آیت کی رو سے قرآن مجید میں خداوند تعالیٰ نے جس کا حکم ناطق ہے اور کبھی منسوخ نہیں ہو سکتا اتحاد مذاہب کا سبق سکھایا ہے۔ یعنی لوگ مسلمان ہوں یا یہودی یا عیسائی یا صابی ان میں سے جو ایک اللہ یا مالک پر اعتقاد رکھیں گے اور قیامت کے دن کو تسلیم کرینگے اور جنھوں نے اچھے کام کئے ہیں، ان سب کو خدا کی طرف سے اجر نیک ملیگا، اون کو نہ ڈر ہونا چاہیئے نہ غم۔ مثنوی معنوی میں کیا خوب لکھا ہے:۔

ہر نبی و ہر ولی را مسلکے است ۔۔۔ چونکہ تاحق می برد جملہ یکیست

اس جگہ صرف مشتے نمونہ از خروارے کا ذکر ہی ممکن ہے۔ اتحاد پسند طبیعتیں مولانا روم کی طرح روح مذہب کی طرف رخ کریں گے تو اون کو اتحاد کامل نظر آجائیگا۔

گر ز سر معرفت آگہ شوی ۔۔۔ لفظ بگذاری سوئے معنی روی

جس طرح قانون قدرت ابتدا سے اور ابتک بلا ردو بدل قائم ہے جس طرح سورج و چاند ٹھیک اپنے وقت پر نمودار ہوتے ہیں اوسی طرح الہام حق ابتدا سے انتہا تک ایک ہی ہے۔ کیونکہ وحدہٗ لاشریک کا حکم ہے کس کی مجال ہے کہ اس میں ترمیم و تنسیخ کر سکے۔ البتہ جہالت کا ابر بسا اوقات اس الہام کے روشن آفتاب کو چھپا دیتا ہے جس کے لئے اوتار۔ پیغمبر۔ نبی۔ ولی۔ رشی۔ منی آکر صرف اس جہالت کی تاریکی کو رفع کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور کامیاب ہوتے ہیں۔ کس کو انکار ہو سکتا ہے کہ حضرت محمد سے پہلے عرب کی کیا حالت تھی اور اون کے بعد کیا حالت ہو گئی۔ حضرت علی سے متبرک اشخاص پیدا ہوئے جن کی خوبیاں بیان سے باہر ہیں۔

مسلمان اصحاب و دیگر عیسائی و موسائی صاحبان کا یہ خیال ہے کہ ہندو مشرک ہیں لیکن اگر وہ ابوالفضل

کے مرتبہ آئین اکبری کو غور سے پڑھیں تو ان کو یقین کامل ہو جائیگا کہ یہ ایک ہی خدا کے ماننے والے ہیں۔ اب میں سب سے آخری ہندو مہاتما اور سنت گوسائیں تلسی داس جی کے چند خیالات جو رامائن میں درج ہیں پیش کر کے ان کا موازنہ شیخ سعدی و مولانا روم و حضرت حافظ سے کر کے اس مضمون کو ختم کرتا ہوں۔

گوسائیں تلسی داس جی کی وفات کو ابھی دو تین سو سال ہوئے ہیں۔ آپ ذات کے برہمن تھے لیکن ان کی دوستی خانخاناں اور دیگر مسلمانوں سے تھی حقیقت میں وہ صرف عاشقان خدا ہی کو زندہ و پاک سمجھتے تھے اور تعصب سے بالکل بری اور سچے ہندو مذہب کے معتقد تھے۔

مہاتما بدھ کی طرح گوسائیں تلسی داس جی کو بھی انسانوں کو گمراہی کا شکار دیکھکر بہت دکھ ہوا اور انھوں نے دیکھا کہ وید کو بھول جانے سے اور اوس کو غلط سمجھنے سے ہی یہ بھارت ورش ایک بری حالت میں ہو رہا ہے اور اسی لئے وید و پران و شاستر سب کا سہارا لیکر سری رام چندر جی کا جیون چرتر جنکو ہندو مریادا پرشوتم یعنی صحیح راستے پر چلنے والے کا خطاب دیتے ہیں رامائن کی صورت میں تصنیف کیا جسمیں دھرم کی اصلی صورت دکھائی۔ آپ نے نہ صرف ہمارے بلکہ ساری دنیا کی بہتری کے لئے سری رام چندر جی کے سبق آموز زندگی کے جو حالات اپنی مشہور عالم تصنیف رامائن میں پیش کئے ہیں ان پر سب مذاہب کا صاد و اتفاق ہے۔ اسلام عیسائی و موسوی مذاہب بھی سری رام چندر جی کے عمل پر عامل ہیں۔

آریوں میں سوسائٹی کے ساتھ برتاؤ اور ذاتی طرز عمل کے دو طریقے ہیں، ایک کو یم اور دوسرے کو نیم کہتے ہیں۔ یم کی تعریف یہ ہے کہ اہنسا یعنی ہر قسم کے آزار سے گریز جس میں دلآزاری بھی شامل ہے۔ ستیہ راست گوئی و راستبازی۔ استیہ۔ چوری نہ کرنا جس میں مکاری و دغابازی بھی شامل ہے۔ برہمچر یعنی نفس کشی و پاکبازی یعنی شہوت و نفس امارہ سے گریز و اپرے گرہ (अपरि गृह) یعنی حرص و ہوا و لالچ سے دور رہنا جو ملے اس میں حسب ضرورت خود لینا باقی دوسروں کا حق سمجھنا۔ یہ پانچ اصول سوسائٹی کے ساتھ برتاؤ کرنے کے ہیں۔ اگر ان پر کوئی عامل ہو تو ممکن نہیں کہ ہر دلعزیز نہ ہو

ذاتی عمل کے اصول یہی پانچ ہیں جنکو نیم (नयम) کہتے ہیں وہ یہ ہیں (۱) शौच شوچ یعنی ظاہری و باطنی پاکیزگی یا طہارت جسمانی و قلبی۔ (۲) سنتوش सन्तोश قناعت۔ (۳) تپ तप یعنی ریاضت۔ (۴) سوادھیائے یعنی स्वाध्याय اخلاقی و مذہبی کتب کا روزمرہ درس (۵) ईश्वर परिनिधान ایشور اپرندھان۔ یعنی ایک خدا پر بھروسہ و اعتقاد۔

اب دیکھئے اسلام و دیگر مذاہب میں بھی یہ اصول موجود ہیں۔ اہنسا کو لیجئے حافظ صاحب فرماتے ہیں

مباش در پئے آزار ہر چہ خواہی کن — کہ در طریقت ما ہیچ ازیں گناہے نیست

اس سے بھی زیادہ

دل بدست آور کہ حج اکبر است — از ہزاراں کعبہ یکدل بہتر است
کعبہ بنگاہے خلیل آذر است — دل گذرگاہے جلیل اکبر است
اگر نمازکنی طوف کعبۂ دل کن — کہ او خلیل بنا کرد و ایں خدا خود ساخت

ستیہ सत्य یعنی راستی وراستبازی

راستی موجب رضائے خداست — کس ندیدم کہ گم شد از رہ راست

استیہ असत्य چور و مکار کو کسی مذہب میں بھی کوئی اچھا نہیں سمجھتا ہے۔ اسلام میں تو چور کے ہاتھ ہی قلم کر دیے جاتے تھے۔ برہمچریہ (ब्रह्मचार्य) یعنی پاکبازی

مکن نفس امارہ را پیروی — کہ ناگہ گرفتار دوزخ شوی
مادر بتہا بت نفس شماست — زانکہ ایں بت مار و آں بت اژدہاست

اپریگرہ۔ قرآن مجید میں سورۂ بقر کی ابتدائی سورتوں میں صاف صاف بیان کیا گیا ہے کہ جو عمل نیک کرتے ہیں وہ جو اون کو ملتا ہے اوسکو راہ خدا میں دیتے ہیں

اب نیم لیجئے شوچ ع शौच

چوں طہارت نہ بود کعبہ و بتخانہ یکیست (حافظ)

سنتوش सन्तोश

قناعت تو انگر کند مرد را — خبر کن حریص جہاں گرد را (سعدی)

تپ तप

ولا ز نور ریاضت چو آگہی یابی — چو شمع خندہ زناں ترک سر توانی کرد (حافظ)

سوادیہائے स्वाध्याय

چو شمع از پے علم باید گداخت — کہ بے علم نتواں خدا را شناخت (سعدی)

ایشور پرنیدھان इश्वर परिनिधान

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ ۝ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ۝ مَالِکِ یَوْمِ الدِّیْنِ ۝ اِیَّاکَ نَعْبُدُ
وَاِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ ۝ اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ (قرآن مجید)

غرض جس قدر اس دریا میں غوطہ لگاؤ اور مذاہب کی روح کی طرف غور کرو تو سب بالاتفاق ایک زبان سے خلق خدا کی راحت و بہبودی کے کوشاں نظر آتے ہیں ؎

در ہر کہ بنگری لنجے از تو مبتلاست یکدل ندیدہ ام کہ عشقت خراب نیست

ایک مسلمان صاحب نے توبت پرستی کی اہلیت پر غور کر کے فرمایا ہے کہ :-

بتوں کو یہ کافر خدا جانتے ہیں خدا کو خدا جانے کیا مانتے ہیں

دوسرے صاحب فرماتے ہیں ؎

مسلماناں گر بدانستے کہ بت چیست بدانستی کہ دیں از بت پرستیست

ایک اور صاحب فرماتے ہیں ؎

توئی مقصود گر مشغول غیرم توئی معبود گر نزدیک و دیرم

غرض گورو نانک صاحب کے قول کے موافق کہ "اونچے چڑھکے جو دیکھا تو ہر گھر ایک ہی رکھا" مجھے تو مذاہب کا اتحاد اتنا واضح طور پر نظر آتا ہے کہ میں یہ کہنے کو تیار ہوں کہ ہر کہ شک آرد کافر گردد۔ لیکن ہر شخص کو اختیار باقی ہے کہ اچھی طرف راغب ہو یا بری طرف جیسا کہ گوشائیں تلسی داس جی نے فرمایا ہے :-

بھل انبھل جانت سب کوئی جو جیہی بھاؤ نیک تیہی ہوئی

یعنی خدا نے ہر شخص کو اسقدر عقل دی ہے کہ وہ نیک و بد سمجھ سکے۔ لیکن اگر کسی شخص کو برائی ہی اچھی معلوم ہوتی ہے تو شاید وہی اُس کے لئے اچھی ہو۔ لیکن میں تو حلم و اخلاق کی طرف اپنے ہندی بھائیوں کی توجہ مبذول کرتا ہوں کہ مذہب کی صحیح غرض مدنظر رکھکر تعصب سے بچو اور حلم کو اختیار کرو۔ کیونکہ

تیغ حلم از تیغ آہن تیز تر بل ز صد لشکر ظفر انگیز تر

کیا جس طرح ہمارا خدا ایک ہے اور مذہب خدا بھی ایک ہے، سب ہندی بھائی باوجود مختلف عقائد کے بھی ایک ہو جائیں تو

پھر دیکھئے بہار تو کیسی بہار ہو

روشن لال بیرسٹر

اصلاح قومی

(از پنڈت منوہر لال زتشی ایم۔ اے۔ آئی۔ ای۔ ایس۔ رکن ہندوستانی اکیڈمی صوبہ متحدہ)

آج کل ملک میں ہر طرف پولٹیکل مباحث کی گرم بازاری ہے، ہندوستانیوں کا جو پڑھا لکھا طبقہ ہے اور جس میں ملکی احساس پیدا ہو چلا ہے۔ وہ بوجوہات کئی ٹکڑوں میں تقسیم ہو گیا ہے۔ ہر گروہ کے علمبردار اپنی اپنی جماعت کو لیکر میدان میں آتے ہیں اور عوام کی تسخیر قلوب کی کوشش کرتے ہیں، دھواں دھار تقریریں ہوتی ہیں، اخباروں کے کالم سیاہ ہوتے ہیں۔ اصول کی بحث کم ہوتی ہے ذاتی حملے اور کمیونل قضیئے زیادہ ہوتے ہیں، اور اس قسم کے مجادلہ میں یہ بے بھی ٹھیک کیونکہ اصول کی بحث میں کچھ غور و خوض کی ضرورت ہوتی ہے، کچھ سوچنا پڑتا ہے، کچھ دماغ پر زور ڈالنا پڑتا ہے پھر بھی بحث روکھی پھیکی رہتی ہے، نہ اس میں نمک مرچ ہوتا ہے نہ گرما گرمی پیدا ہوتی ہے۔ ذاتی حملے اور کمیونل قضیوں میں یہ بڑی آسانی ہے کہ محض فقرہ بازی سے دلچسپی کا سامان فراہم ہو سکتا ہے۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ پچھلے پانچ سات برس میں چونکہ عوام کا دخل پولٹیکل معاملات میں زیادہ ہونے لگا ہے۔ پولٹیکل مباحثوں میں گالی گلوچ کا رواج زیادہ ہو گیا ہے، اور شاید ہونا بھی یہی چاہیئے تھا۔

ایک زمانہ تھا کہ جب پولٹیکل مباحثوں سے ہندوستان کا میدان خالی تھا۔ اٹھارھویں صدی میں جب مغربی روشنی کی شعاعیں ہندوستان پر پڑنے لگیں تو ہماری سوسائٹی کی حالت ایک منجمد سمندر کی سی تھی، مذہبی سوشیل پولٹیکل غرضکہ زندگی کے ہر شعبہ پر رسم و رواج کا قبضہ تھا، سلطنت ایک بوسیدہ ہڈیوں کا ڈھانچہ اور سوسائٹی قدیم وسوسوں اور باطل اوہام کا ایک انبار ڈھیر تھی۔ اعتقاد۔ توہمات اور تقلید ہمارے راہبر تھے جو کچھ ہوتا آیا ہے وہ ہمیشہ ہوتا جائے گا۔ جو بزرگوں نے کیا ہے وہی ہم کو بھی کرنا چاہیئے۔ اسی پر ساری زندگی کا دار و مدار تھا۔ یہ بات دماغ میں آتی ہی نہ تھی کہ مقررہ شاہراہ سے ہٹ کر چلنے کا کسی کو حق حاصل ہے۔ اس زمانہ میں جب نئی روشنی کے اثر سے متاثر ہو کر چند بزرگوں نے اصلاح کی فکر شروع کی تو ان کو سب سے پہلے اپنے سوشیل نظام میں عیوب نظر آئے۔ جن کی درستی ترقی کے واسطے لازمی قرار پائی۔ راجہ رام موہن رائے نے اس بات پر اصرار کیا کہ ایسٹ انڈیا کمپنی کی طرف سے جو نظام تعلیم مقرر کیا جائے اس میں محض علوم مشرقیہ کی تعلیم کافی نہ سمجھی جائے بلکہ انگریزی زبان اور مغربی علوم کی تعلیم ضرور شامل کی جائے۔ ستی کی رسم اس وقت شمالی ہندوستان میں شد و مد سے جاری تھی، زندہ بیویوں کو مردہ خاوندوں کے ساتھ جلانا ہندو مذہب کا جزو لاینفک سمجھا جاتا تھا

رام موہن رائے نے اس کی بھی مخالفت کی اور انگریزی مدبروں کی مدد سے وہ اپنی ان دونوں کوششوں میں کامیاب ہوئے۔ اصلاح مذہبی کے واسطے انھوں نے برہمو سماج قائم کی اور بنگال کے روشن خیالوں کا ایک گروہ اب تک ان کی تلقین کو مانتا ہے۔ ایشور چندر ودیا ساگر نے ودھوا وواہ کے واسطے کوشش کی۔ سوامی دیانند مذہبی اور سوشیل اصلاح کے بڑے حامی تھے۔ اور مغربی ہندوستان میں تلنگ اور رینیڈے ایسے عالی ماغوں کا یہی مذہب تھا۔ سرسید احمد خاں نے جب مسلمانوں کی اصلاح کی تحریک شروع کی تو انھوں نے بھی پہلے اپنے ہم مذہبوں کو توہمات اور تقلید کی قید سے آزاد کرنا چاہا، یہ دوسری بات ہے کہ ان کی تفسیر مقبول نہیں ہوئی، اور کچھ دنوں بعد انھوں نے اپنی کوشش کو عملاً تعلیم کے صیغہ میں محدود کر دیا۔ ان باتوں کے بیان کرنے سے میری غرض یہ ہے کہ پولیٹکل تحریک سے پہلے اور ایک عرصہ تک پولیٹکل تحریک کے ساتھ ساتھ مذہبی اور سوشیل اصلاح کی تحریک ہندوستان میں موجود تھی جس کی آواز اب پولیٹکل شور وغل میں کم سنائی دیتی ہے۔ مہاتما گاندھی تو اب بھی فرماتے ہیں کہ چرخا کاتو اور اچھوت ذاتوں کو اپنے برابر حقوق دو مگر ان کی یہ تلقین فی زمانہ ایک نیم جان عاشق کی آہ بے اثر سے زیادہ وقعت نہیں رکھتی۔

جس وقت ہندوستان میں مذہبی اور سوشیل اصلاح کا خیال پیدا ہوا اور پڑھے لکھے لوگوں کو اس بات کی فکر ہوئی کہ انسانی دماغ کو رسم ورواج کی غلامی سے آزاد کیا جائے اور اوہام پرستی کی بیخ کنی کی جائے تو اس وقت اصلاح کی بنیاد اخلاق کے اصول پر رکھی گئی، مثلاً عورتوں کو تعلیم دینا اور اُن کو پردہ کی قید سے آزاد کرنا اس واسطے مستحسن تھا کہ کسی انسان کو جاہل رکھنا یا گھر کی چار دیواری میں قید رکھنا انصاف کے اصول کے خلاف ہے۔ اچھوت ذاتوں کی تعلیم وترقی اس واسطے ضروری تھی کہ جو درجہ اُن کو ہندوؤں نے اپنے سوشیل نظام میں دے رکھا تھا اس کی بنیاد ظلم اور جبر پر تھی۔ اور اس جبر اور ظلم کو توڑنا ہر روشن خیال اور انصاف پسند شخص کا فرض تھا۔ ودیا ساگر نے جو سخت کوشش ودھوا بواہ کے واسطے کی اس کا سبب یہ تھا کہ بنگال میں ہندو بیواؤں پر جو مصائب نازل ہوتے تھے ان کو دیکھ کر وہ سخت بے چین تھے۔ اور اُن کا عقیدہ تھا کہ شاستروں میں بیوہ کی شادی کی ممانعت نہیں ہے اس واسطے وہ ودھوا بواہ کو رواج دیکر اُن کو ان مصائب سے آزاد کرنا اپنا فرض سمجھتے تھے۔ رفتہ رفتہ جب قومیت کا احساس پیدا ہوا اور دوسری ترقی یافتہ قوموں کے مقابلہ میں ہم کو اپنی حالت پست نظر آنے لگی، تب یہ خیال پیدا ہوا کہ ہمارے قبیح رسم ورواج ہماری قومی ذلت اور پستی کے ذمہ دار ہیں اور ہم نے یہ نتیجہ نکالا کہ اگر ہم بحیثیت قوم کے ترقی کرنا چاہتے ہیں تو ایسے رسوم کو دور کرنا اور ایسی قیود سے قوم کو آزاد کرنا ضروری ہے۔ عورتوں کو تعلیم دینا اور اُن کو آزاد کرنا محض اسی واسطے ہمارا فرض نہیں ہے کہ کسی

انسان کو جاہل رکھنا یا قید کرنا انصاف اور اخلاق کے خلاف ہے، بلکہ اس واسطے بھی کہ اتنے بڑے گروہ کی جہالت اور کمزوری ساری قوم کو ضعیف کرتی ہے۔ اور دوسری قوموں کے مقابلہ میں اس کو ذلیل ہونا پڑتا ہے۔ نیچ ذاتوں کو حقوق مساوی دینا صرف اسی واسطے ہمارا فرض نہیں ہے کہ وہ بھی انسان ہیں اور اُن کو ذلیل حالت میں رکھنا انصاف اور اخلاق کے اصول کے خلاف ہے بلکہ اس واسطے بھی کہ اگر ان کو تعلیم دی جائے مساوی حقوق دیے جائیں اور وہ گروہ ترقی کرنے لگے تو اس کی قوت سے ساری قوم کو تقویت ہوگی اور اس نئی قوت کے زور سے ہماری قوم دوسری قوموں کا مقابلہ کر سکے گی۔ یا اس کو یوں سمجھیے کہ اصلاح کا پہلا اصول محض اخلاقی تھا اور دوسرا اصول قومی ہے۔ پہلے ہم سوشیل اور مذہبی اصلاح اس واسطے چاہتے تھے کہ قبیح رسموں کو دور کرنا اور قوم کے افراد کو جہالت اور ذلت سے نکالنا اخلاقی فرض تھا۔ اب اس میں یہ اضافہ ہوا کہ قوم کے کسی گروہ پر ظلم و حیف روا رکھنا محض اس گروہ کے ساتھ ناانصافی نہیں ہے بلکہ اُس سے کل قوم کمزور ہوتی ہے اور دوسری ترقی یافتہ قوموں سے مقابلہ نہیں کر سکتی۔ وہ زمانہ گیا جب ہر ملک کے لوگ بجائے خود اپنی دنیا میں الگ رہتے تھے اور اپنی اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد الگ بنایا کرتے تھے۔ اب سائنس کے حیرت انگیز کرشموں نے ساری دنیا کو ایک کر دیا ہے۔ ہفتوں کا راستہ گھنٹوں میں طے ہوتا ہے۔ بجلی اور بھاپ کے زور سے انسان نے خدا کی خدائی کو تہ و بالا کر دیا ہے۔ اور خشکی اور تری سے گذر کر ہوا پر قادر ہوا چاہتا ہے۔ ایسی حالت میں کسی قوم کو گوشہ نشینی میں مفر نہیں۔ یا آگے بڑھو یا پیچھے ہٹو، اور دوسروں کو جو تم سے زیادہ خوش فکر جری اور قوی ہیں آگے بڑھنے دو۔ یا تو قوت حاصل کر کے مضبوط بنو یا دوسروں کے پیروں کے نیچے کچلے جاؤ۔ قوم کے اندر ایک فرد کا مقابلہ دوسرے فرد سے، اور دنیا میں ایک قوم کا مقابلہ دوسری قوم سے ہے۔ قوم افراد کا مجموعہ ہے اور یہ مجموعہ اسی قت قوی اور مضبوط ہو سکتا ہے جب اس کا ہر جزء قوی اور مضبوط ہو۔ پس ہر قوم کی کوشش یہ ہے کہ تعلیم اور تربیت کے ذریعہ سے اپنے افراد کو ذی ہوش، صاحب عقل اور جری بنا دے اور ان میں قومیت کا احساس پیدا کرے تاکہ ان میں ملکر کام کرنے کی قابلیت پیدا ہو اور مقابلہ کے وقت وہ سب ایک دل ہو کر اپنے حریفوں کا سامنا کر سکیں۔

میرا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ پولٹیکل جد و جہد بے سود ہے یا قوم کو اس کی طرف سے لاپرواہ ہو جانا چاہیئے اور ساری کوشش مذہبی اور سوشیل اصلاح میں صرف کرنی چاہیئے۔ میں ان میں نہیں ہوں جو کہتے ہیں کہ پہلے مذہبی اور سوشیل اصلاح ہو جائے، اُس کے بعد پولٹیکل اصلاح کا نام لیا جائے۔ پہلے ہر ہندوستانی فرشتہ بن لے اُس کے بعد عرش بریں سے پولٹیکل حقوق کی بارش ہوگی۔ میرا خیال ہے کہ قوم کی ترقی کے مختلف شعبے جسم انسان کے

اعضا سے مشابہ ہیں۔ اگر جسم صحیح ہے تو ہر عضو اپنا کام عمدہ طریقے پر کریگا ورنہ مشکل پیدا ہوگی۔ اگر دماغ ضعیف ہے تو اُس کا اثر دل پر ضرور پڑے گا۔ اور اگر جگر اپنا فعل نہیں کرتا تو خون صالح پیدا نہیں ہوگا۔ یہ ممکن نہیں کہ کوئی قوم مذہبی معاملات میں برہمنوں کی غلامی کو تمغائے شرافت سمجھے اور معاملات ملکی میں آزادی حاصل کرے یا کسی قوم کا سوشیل نظام ذات کی تفریق پر مبنی ہو اور وہ پولیٹکل دنیا میں ایک دل ہوکر اپنے حریف کا مقابلہ کرے۔ اسی طرح اگر تعلیم عمدہ چیز ہے تو عورت اور مرد دونوں کے واسطے ہے۔ اگر آزاد خیالی جائز ہے، تو مذہبی اور ملکی معاملات دونوں میں جائز ہے۔ اگر ہم میں قومیت کا احساس ہے تو اس کے ساتھ ذات کی تفریق قائم نہیں رہ سکتی۔ ہم سنتے ہیں کہ جنوبی افریقہ کے فرنگی ہمارے ہندوستانی بھائیوں کے ساتھ برا برتاؤ کرتے ہیں اُن کو اپنے سے کمتر سمجھتے ہیں، پولیٹکل حقوق نہیں شہروں کے باہر ان کے واسطے الگ بستیاں قائم کرتے ہیں۔ ٹرمیوے میں ان کے واسطے الگ درجے مقرر ہیں، اُن کو زمین خریدنے کی اجازت نہیں ہے۔ اور اسی طرح کی اور سختیاں کی جاتی ہیں۔ ہم جب ان باتوں کو سنتے ہیں تو ہم کو غصہ آتا ہے اور ہمارا غصہ بجا ہے مگر کوئی ہم سے یہ تو پوچھے کہ ہم نے اپنے یہاں کی نیچ یا اچھوت ذاتوں کے ساتھ کیسا سلوک کیا کیا جو کچھ ہمارے ساتھ ہو رہا ہے اس سے زیادہ ہم نے ان کے ساتھ نہیں کیا کیا جس طرح ہم ستائے جا رہے ہیں اس سے زیادہ ہم نے ان غریبوں کو نہیں ستایا۔ اس کے یہ معنی نہیں کہ ہم جنوبی افریقہ کے فرنگیوں کا جبر خاموشی کے ساتھ برداشت کریں۔ نہیں ہم کو اس کے خلاف کوشش کرنی چاہیئے اور ضرور کرنی چاہیئے۔ مگر اسی کے ساتھ اپنے گھر کی سدھار کی بھی فکر کرنی چاہیئے۔ ہم چاہتے ہیں کہ انگریز ہم کو آزادی دیں اور ہمارا یہ مطالبہ جائز ہے مگر ہم اپنے گھروں میں کس قدر آزادی دینے کو تیار ہیں۔ بڑے بڑے انگریزی خواں آکسفورڈ اور کیمبرج کے ڈگری یافتہ اس بات کو تو نہیں برداشت کر سکتے کہ بیوی گھر کے معاملات ہی میں ان سے مساوی حقوق کی دعویدار ہو۔ عورتوں کو پردہ سے نکالنے کا ایک خاص طبقہ میں رواج ہے مگر سچ یہ ہے کہ نوے فی صدی "روشن ضمیر" حضرات اس رواج کو اس واسطے قبول کرتے ہیں کہ ان کی سوسائٹی میں یہ فیشن میں داخل ہے اور بیوی کو موٹر پر بٹھا کر ساتھ ہوا کھلانا لوازم امارت میں سے ہے نہ کہ اس لئے کہ وہ اپنے یہاں عورتوں کو واقعی مساوی حقوق دینے چاہتے ہیں اور ان حقوق کے دینے سے جو کمی اُن کے اختیارات میں ہوگی اور اُس سے جو تکلیف ہوگی اس کو برداشت کرنے کو تیار ہیں۔

مدعا یہ ہے کہ ملک میں جو ہڑبونگ مچا ہوا ہے اس پر کبھی ٹھنڈے دل سے غور کیجئے۔ ایک چڑیا کا ٹولا ہے جس میں بھانت بھانت کے جانور بول رہے ہیں، ہر لیڈر اپنے زعم میں فرعون بے سامان اور ہر نوجوان بجائے خود شاخ زعفران ہے۔ نخوت کا یہ عالم ہے کہ اصول کی تو بحث ہے نہیں، بس کوشش یہ ہے کہ ہماری بات رہے چاہے قوم کا نفع ہو یا نقصان۔ پچھلے دس برس میں کروروں روپیہ چندہ ہوا۔ ہزاروں آدمیوں نے

ملکی قومی یا مذہبی جوش میں اپنا پیٹ کاٹکر روپیہ دیا۔ اب یہ ارشاد ہوتا ہے کہ اس کا حساب قیامت میں ہوگا اگر ہزاروں نہیں تو سیکڑوں مذہب کے جاں نثار اور دیش کے سیوک چندوں کی بدولت بن گئے۔ موروثی قرضے ادا ہوگئے۔ اب جب آپس میں اَن بَن ہوئی تو کہیں اس کا بھانڈا پھوٹا، لہٰذا عرض یہ کرنا ہے کہ پولیٹیکل جدوجہد کے ساتھ مذہبی اور سوشیل اصلاح نہایت ضروری ہے۔ اگر ہماری زندگی با اصول نہ ہوئی، اگر ہمارا کیرکٹر درست نہ ہوا، اگر ہم میں ایثار کی قابلیت نہ پیدا ہوئی اور مل کر کام کرنے کا سلیقہ نہ آیا تو سوراج کیسے ملے گا اور اگر ملے گا تو کے دن قائم رہے گا!

منوہر لال زُتشی

پرماتما ایک ہے صرف اسی کی پوجا کرنا چاہیئے دوسرے کی نہیں۔

جو سچ بولتا ہے پرماتما اس کے سر پر اپنا ہاتھ رکھدیتا ہے۔

جو پرماتما سے ڈرتا ہے اس کو کسی سے ڈرنے کی ضرورت نہیں

علم ایسی دولت ہے جس کو کوئی چور چرا نہیں سکتا ہے۔

سچ علم کا سب سے بڑا درجہ ہے۔

جو محنت نہیں کرتا ہے ہمیشہ غریب رہتا ہے۔

دولتمندی محنت کا پھل ہوتی ہے اور تکلیف اُس درخت کے کانٹے ہیں۔

جو چیز جیسی ہو اسکو ویسا ہی سمجھنا چاہیئے۔ ویسا ہی کہنا چاہیئے، ویسا ہی ماننا چاہیئے اور کسی کے ڈر سے وہ کام نہ کرنا چاہیئے جس کو اپنا ضمیر نہ مانتا ہو۔

جو لوگ تعصب کرتے ہیں ان کو سچائی کا کبھی پتہ نہ لگے گا۔ سچائی دیکھنا ہو تو تعصب چھوڑ دو۔

ہر ایک آدمی جیسا آپ ہوتا ہے ویسا ہی اوروں کو سمجھتا ہے۔

جہاں بھوگ وہاں روگ۔ جہاں پاپ وہاں سوگ — سوامی دیانند

آزادی نسوان

(از پنڈت کشن پرشاد صاحب کول بی۔ اے۔ رکن انجمن خدام ہند)

عورتون کو اعلےٰ تعلیم سے فیضیاب ہونے کا اسی طرح موقعہ کیون نہ دیا جائے جس طرح لڑکون کو اور مردون کو حاصل ہے ؟ زندگی کے سب سے اہم رشتہ جوڑنے (یعنی شادی کے معاملہ) مین یہ کافی سمجھا جاتا ہے کہ لڑکے کی رضامندی اور خوشی کا لحاظ کر لیا جائے اور بس۔ لڑکی کی رضامندی اور خوشی کا ہمین خیال بھی نہین آتا۔ کیا لڑکیان تعلیم حاصل کرنے اور سن شعور تک پہونچنے کے بعد اس طریق شادی کی اب زیادہ عرصہ تک پابند رہ سکتی ہین ؟ یا دوسرے الفاظ مین یون سمجھئے کہ لڑکیون کو تعلیم دینے۔ صغرسنی کی شادی کی رسم چھوڑنے اور پردہ اُٹھانے کے بعد پرانی رسوم شادی کا پابند رہنا کیا کوئی معنی رکھتا ہے ؟ نہ صرف یہی بلکہ شادی کے بعد میان بیوی کے تعلقات حاکم و محکوم کے موجودہ دستور کا بدلی ہوئی صورت حال مین قائم رکھنا کہان تک ممکن یا قرین انصاف ہوگا ؟ متاہل زندگی کے اُن مکروہات کو مدنظر رکھتے ہوئے جنکا سامنا ہماری قوم مین عورتون کی کافی تعداد کو ہوتا ہے۔ (اور بدلی ہوئی حالت مین ایسی مثالین روز افزون ہو رہی ہین) کیا طلاق کے طریق کو رائج کرنے سے گریز کرنا عقل کی بات یا آئین اخلاق کی حمایت ہے ؟ ہندو شاستروں کی رو سے عورت کسی حالت مین وراثت کی حقدار نہین ہو سکتی ہے۔ منو جی نے عورت کو سوسائٹی مین جو رتبہ دیا تھا اور جن اُصولون پر ہمارا نظام زندگی ترتیب دیا گیا تھا ان کے لحاظ سے ممکن ہے کہ یہ طریق عمل کسی وقت مناسب رہا ہو لیکن زمانہ حال کے حامیان اصلاح تمدن قوم کے سامنے جو معیار زندگی پیش کر رہے ہین اور انصاف اور آزادی کے جن اُصولون کی آج دُہائی دیجاتی ہے اُن کے لحاظ سے اس سوال پر غور فرما کر کہئے کہ عورت کیون وراثت کی حقدار نہین ہو سکتی اور اگر تعلیم و تربیت کے جوہر سے آراستہ عورتین قابلیت اور اہلیت رکھتی ہین تو کیا وجہ ہے کہ وہ وکالت۔ طبابت اور اس قسم کے دوسرے معزز پیشون مین داخل نہ ہون ؟ یا ملکی اور قومی کامون مین نمایان حصہ نہ لین ؟ یا انکو ووٹ دینے کا حق اور کونسل کی ممبری کا اعزاز نہ مل سکے ؟

یہ تمام سوالات ہین جو کسی نہ کسی شکل مین آئے دن فی زمانہ ہر تعلیم یافتہ سمجھدار شخص کے سامنے آتے ہین اور اُن پر غور کرنا لازمی ہوتا ہے۔ فرداً فرداً ہر سوال کا جواب مختلف طریقون سے دیا جاتا ہے اور بحث کے لیئے کافی دلائل ملجاتے ہین۔ لیکن اگر غور سے دیکھا جائے تو یہ تمام سوالات آزادی نسوان کے عنوان

کے تحت مین آجاتے ہین اور تمام اعتراضون کی تہ مین صرف دو ہی اعتراض ہوتے ہین یعنی اوّل یہ کہ ان باتون کا اثر قوم کے اخلاق پر عموماً اور عورتون کے اخلاق پر خصوصاً بہت خراب پڑیگا - دوئم یہ کہ قدرت نے مرد کو عورت سے برتر بنایا ہے اور عورتون مین یہ اہلیت نہین ہے کہ وہ زندگی کے تمام شعبون مین مردون کا مقابلہ کرسکین - آخرالذکر اعتراض اب پڑھے لکھے احباب کی جانب سے نہین کیا جاتا ہے یا کم از کم تمام مہذب دنیا کا ضمیر یہ تیار ہا ہے کہ اب اس اعتراض کی کوئی وقعت نہین رہی - لیکن اوّل الذکر اعتراض تمام معترضین کی گفتگو و دلائل کی تہ مین چھپا ہوا ملتا ہے - مین اسی کے متعلق اس مضمون مین وضاحت سے بحث کرنے کی جرأت کرونگا -

عورتون کی آزادی کے متعلق تمام مسئلے دو حصّون مین منقسم کئے جاسکتے ہین اوّل تو وہ جن کا تعلق عورتون کی خانگی زندگی یا زیادہ تر میان بیوی کے تعلقات سے ہے اور دوسرے وہ کہ جو اُس صورت مین پیدا ہوتے ہین جب عورتین گھر کی چار دیواری سے باہر نکلکر ملکی کاروبار مین حصّہ بٹانے اور قومی مجالس مین برابری کی دعویدار ہوتی ہین - زندگی کے ان ہر دو شعبون مین آزادی ایک دوسرے کے لیے لازم ملزوم ہے - یعنی عورتین گھر مین روزمرہ کی زندگی بھی اسوقت تک چین اور آزادی سے بسر نہین کرسکتین جب تک وہ اُن بیڑیون کو جو رواج اور قانونی دستور نے ان کے پاؤن مین ڈالدی ہین توڑ نہ سکین اور یہ اس وقت تک بہت مشکل ہے جبتک کہ عورتین ایک حد تک اپنے بسر اوقات کے لیے مردون کی دست نگری سے آزاد نہون اور ملکی کاروبار مین حصّہ لیکر اور قومی مجالس مین شریک ہوکر آئین و دستور حکومت پر کافی اثر ڈال نہ سکین تاکہ اُن کے حقوق و دعوے کا مردون کی خود غرضی اور ہٹ دھرمی کے بجائے انصاف کی ترازو مین تولنا ممکن ہو اور وہ اپنے خلاف موجودہ رسم و رواج اور قوانین کی ترمیم و تنسیخ نہ کراسکین ملکی کاروبار اور قومی مجالس مین بھی برابری کا مرتبہ حاصل کرنا اسوقت تک بہت مشکل ہے جبتک روزمرہ کی زندگی مین وہ مساوی درجہ حاصل نہ کرلین غرض یہ دونون مسئلے ایک دوسرے کے لازم و ملزوم ہین اور ایک کو دوسرے پر فوقیت اور اہمیت حاصل نہین ہے بلکہ دونون کا حل ہونا یکسان ضروری ہے تاہم راقم الحروف کی رائے مین وہ مسئلے جنکا تعلق روزمرہ معاشرت سے ہے نسبتاً زیادہ توجہ کے محتاج ہین - کیونکہ عورتون کے سیاسی حقوق کی چندان مخالفت نہین کیجاتی ہے بلکہ بعض صوبون کی کونسلون نے تو انھین ووٹ دینے کا حق بھی دیدیا ہے - لیکن اسکے برخلاف شادی بیاہ کے رسم و رواج بدلنے یا میان بیوی کے باہمی تعلقات کے رواج اور قانون کی ترمیم و تنسیخ کرنے اور عورتون کو روزمرہ زندگی مین مساوی حقوق دینے کا تذکرہ چھیڑیئے تو اکثر حامیان اصلاح بھی کانون پر ہاتھ رکھنے لگتے ہین - ہر صاحب خانہ کو یہ اندیشہ ہونے لگتا ہے

کہ کہین یہ سرکشی وبغاوت کی وبا سب سے پہلے انھین کے خانگی امن وامان مین خلل انداز نہ ہو انھین وجوہ سے یہ اصلاح زیادہ دشوار اور اہم ہے۔ لہذا ہماری توجہ کی زیادہ محتاج ہے۔

لڑکیون کے پڑھانے کا دستور اب عام ہوتا جاتا ہے۔ اور کسی تعلیم یافتہ شخص کو اس سے اختلاف کرنے کی جرأت نہین ہوتی تاہم لڑکیون کی تعلیم عموماً مدرسون کے ابتدائی اور متوسط درجون سے آگے نہین بڑھتی اور انھین اعلےٰ تعلیم دینے کی اکثر علانیہ مخالفت کیجاتی ہے اور طرح طرح کے حیلے وبہانے بتائے جاتے ہین لیکن درحقیقت اس کے تہہ مین بھی وہی ڈر ہے کہ اعلےٰ تعلیم کا لڑکیون کے اخلاق وآداب پر برا اثر پڑے گا۔ اکثر وہی لوگ جنھون نے خود اعلےٰ تعلیم پائی ہے۔ اور جو اپنے لڑکون کو اعلےٰ سے اعلےٰ تعلیم دینے کے لیے اپنے اوپر ہر طرح کی سختیان برداشت کرتے ہین۔ یہ سمجھتے ہین کہ لڑکیون پر اعلےٰ تعلیم کا اثر برعکس ہوگا۔ اگر یہ اعتراض کیا جاتا کہ لڑکیون کو مدرسہ مین داخل کردینے۔ یا ان کو صرف اس قدر پڑھا دینے سے کہ وہ دو چار فقرے انگریزی کے لکھ لین بعض حالتون مین ان مین نمایش پسندی کا عیب ہو جاتا ہے اور وہ خفیف حرکتین کرنے لگتی ہین۔ تو سمجھ مین آسکتا تھا۔ لیکن اس کے برخلاف اکثر دیکھنے مین آیا ہے کہ قوم کے ہونہار نوجوان اور خوشحال پسند خاوند جن کو چشم بددور سوشل رفتار مرہونے کا بھی دعوےٰ ہوتا ہے انھین بولتی چالتی گڑیون کو پسند کرتے ہین جن پر انگریزی ساخت کی مہر لگی ہوتی ہے اور جو اور سامان آرایش کے ساتھ ان کے گول کمرے اور کھانے کی میز کی زینت کو بڑھا سکتی ہین۔ لیکن ان پڑھی لکھی بیبیون سے جنھون نے حسن اتفاق سے یا اپنے والدین اولوالعزمی کے بدولت فیض تعلیم سے کچھ نفع اٹھایا ہے اور جنھین فرائض کے ساتھ اپنے حقوق کا بھی خیال پیدا ہوگیا ہے۔ عموماً احتراز کیا جاتا ہے اس سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ ابھی لوگ اس بات کو گوارا نہین کرسکتے ہین کہ عورتین بھی ان سے ہمسری کا دعوےٰ کرسکین۔

شادی بیاہ کے رسوم کو لیجیے یہ کوئی نئی بات نہین کہ اکثر مرد ایک بیوی مرجانے کے بعد دوسری شادی کرلیتے ہین ایسے لوگ بھی کم نہین ہین جنکو زندگی مین ایک سے زیادہ بیویون کے مرنے کا غم اٹھانا پڑتا ہے اور کئی بار شادی کی خوشی حاصل ہوتی ہے۔ تاہم کسی شخص کو ان کے پاکبازی پر شبہہ کرنے کی جرأت نہین ہوتی ایسے لوگون کی مثالین بھی ملتی ہین جو عمر کے لحاظ سے بوڑھے لیکن ہوس کے لحاظ سے جوان ہوتے ہین اور پچاس یا پچپن سال کی عمر مین کسی نابالغ لڑکی سے شادی کرلیتے ہین۔ ایسے لوگ ہمیشہ

نشانۂ مذاق بنائے جاتے ہین اور اب اس طریق کو احسن نہین سمجھا جاتا لیکن ان کے چال چلن پر کسی قسم کا دھبہ نہین لگتا۔ بعض ایسی مثالین بھی شاذونادر ملتی ہین جہان کسی بزرگ نے ایک بیوی کے حین حیات ہین دوسری شادی کرلی ہے۔ گو یہ حرکت معیوب ہے لیکن سوسائٹی سے اسکی کوئی سزا نہین ملتی ہے۔ اس اسکے برعکس عورتون کی مثال لیجئے گو بیواؤن کی شادی کم ازکم تین پشتون سے قانوناً جائز ہوگئی ہے۔ تاہم شریف خاندانون مین شاذونادر ہی کسی بیوہ کی شادی ہوتی ہے۔ اور عموماً وہ لوگ بھی جو اصلاح تمدن کے پلیٹ فارم سے ازدواج بیوگان کی حمایت کرتے رہے ہین۔ عملی حیثیت سے اس کیلئے تیار نہین ہوتے ہین بلکہ اگر آپ ان کے بیوہ لڑکی یا بہن کی شادی کا تذکرہ چھیڑیئے تو وہ سمجھین گے کہ آپ نکی توہین کر رہے ہین۔ بال بدھوا بواہ کی تحریک سے پھر بھی یک گونہ ہمدردی ظاہر کیجاتی ہے لیکن ان بیواؤن کی شادی جو سن بلوغ کو پہنچ چکی ہین یا جن کے دو ایک اولاد بھی ہین قطعی معیوب سمجھی جاتی ہے۔ ہماری موجودہ سوسائٹی مین ایسی عورتون کا چال چلن معیار اخلاق سے گرا ہوا سمجھا جاتا ہے۔ اور ایسی عورتون کے لیے جنہون نے اپنے خاوند کی بداعمالیون۔ بداطواریون۔ ظلم اور زیادتیون سے تنگ آکر طلاق کا رواج نہ ہونے کے وجہ سے کسی دوسرے شخص کا سہارا ڈھونڈھ لیا ہو سوسائٹی مین کوئی جگہ نہین۔ سوسائٹی نے اخلاق پرستی اور عصمت پروری کے بہانہ سے اُن معصومون پر بھی اپنا دروازہ بند کر رکھا ہے۔ جو کسی بداطوار شخص کے دغا و فریب و مظالم کا اتفاقیہ شکار ہو جاتی ہین۔ ایسے اتفاقی حادثون کے بعد اگر کوئی معصوم لڑکی شریفانہ طریقہ سے سوسائٹی مین اپنی زندگی بسر کرنا چاہے تو اسکے لیے بھی ہماری قوم مین کوئی گنجائش نہین ہے۔

عموماً انسان اپنے اعمال کے لیے اپنے معبود کے روبرو جوابدہ مانا جاتا ہے۔ لیکن ہماری سوسائٹی کا ڈھانچہ اس اُصول پر تیار کیا گیا ہے کہ عورتون کے معبود یقیناً مرد اور مردون کا معبود مجازاً خدا ہے مذہب کی رسمی پابندیون سے قطع نظر کرکے مردون کے روزمرہ طریق زندگی اور اعمال کو دیکھتے ہوئے کون شخص کہہ سکتا ہے کہ مرد اپنے تئین اپنے معبود کی درگاہ مین اپنے اعمال کا جوابدہ سمجھتے ہین۔ بخلاف اسکے ہر عورت اپنے خاوند کی حضور مین اپنے اعمال اور چال وچلن کی جوابدہ قرار دیگئی ہے اور اسکی جزا و سزا کا سوال بہشت و دوزخ کی اُمید بیم پر بھی نہین چھوڑا جاتا ہے۔ مردون اور عورتون کے لیے ہمارا معیار اخلاق قطعی جداگانہ ہے۔ کیا کسی آئین و اُصول اخلاق کی رو سے سچائی۔ ایمانداری۔ عصمت پروری اور پاکبازی کے دو معیار ہو سکتے ہین۔؟ ایک عورتون کے لیے دوسرا مردون کے لیے؟ آخر سوسائٹی کے دو ہی جزو تو ہین۔ عورتین اور مرد ایک کے اعمال و افعال کا دوسرے کے چال چلن اور طرز عمل پر اثر پڑنا لازمی ہے۔ ہم ایک کو اخلاقی پابندیون سے آزاد کرکے دوسرے کو عصمت پروری

اور پاکبازی کی بندشون مین کیسے جکڑ سکتے ہین؟ حقیقت یہ ہے کہ بحالت موجودہ ہماری سوسائٹی مین ہر وضع اور ہر قسم کی اخلاقی بدعنوانیون کی مثالین بکثرت ملتی ہین لیکن لوگ ہین کہ اس سے بیخبر ہین۔ تاہم رسم ورواج و قانون کی اصلاح کی بحث و مباحثہ کے وقت اخلاقی پاکدامنی اور عصمت پروری کی قسمین کھائی جاتی ہین۔ حقیقت حال یہ ہے کہ ہمکو اندیشہ رہتا ہے کہ ان اصلاحون کا ہمارے اُن حقوق مالکانہ پر کہ جو اس وقت مردون کو عورتون پر حاصل ہین مخالفانہ اثر پڑیگا۔ اس امر کے ثبوت مین کہ ہم عورتون کو بھی زر۔ زمین اور دوسری چیزون کی طرح ملکیت سمجھتے ہین۔ بیسیون مثالین اپنے یہان کے رواج اور قانون اور تاریخی روایات سے پیش کیجاسکتی ہین۔

شادی کی رسم کو لیجئے اہل ہنود مین شادی مین کنیادان کی رسم قطعی طور پر لازمی ہوتی ہے اور کوئی شادی اسکے بغیر تکمیل نہین پاسکتی۔ کنیادان بجز اسکے کہ سب دانون مین افضل سمجھا جاتا ہے اور سب دانون کی طرح ہے۔ اسکے معنی صرف یہ ہین کہ والدین لڑکی کو اپنے داماد کے نذر کرتے ہین یا دوسرے الفاظ مین لڑکی معہ تمام ساز وسامان کے لڑکے کو نذرانہ مین دیجاتی ہے۔ اور اُسی لمحہ سے شوہر کی ملکیت قرار پاتی ہے۔ عام بول چال مین اس خیال سے بیوی کو "عورت" اور شوہر کو "مالک" کا خطاب ملتا ہے۔ ہندو شاسترون مین استری دھرم کا معیار یہی ہے کہ وہ پتی سیوا کو سب فرائض پر ترجیح دے دراصل عورت کے لیے شوہر ہی اسکا خدا ہے۔ یہی خیال "پتی بھگوان" کے لفظون سے ظاہر ہوتا ہے۔

غرض اس سے انکار نہین کیا جاسکتا کہ قدیم ہندؤن کے نگاہ مین بیوی کی وقعت اور اسکی حقیقت ملکیت سے زیادہ نہ تھی۔

ستی کی رسم کو لیجئے خاوند کے مرنے کے بعد بیوی کو چتا پر زندہ جلنے کے لیے مجبور کیا جاتا تھا خواہ یہ رسم جذبۂ انسانی سے کیسی ہی خارج ہو لیکن ملکیت کی منطق کے لحاظ سے بالکل درست وجائز تھی۔ رفتہ رفتہ اس وحشیانہ بیرحمی کی رسم کو متبرک فرض کا رتبہ ملگیا جس سے بہت سی سادہ لوح لیکن باایمان بیویان بخوشی وخاطرستی ہوگئین۔ راقم الحروف اس سے بیخبر نہین ہے کہ ہماری قومی روایات مین ایسی مثالین بھی ملتی ہین جو اس تصوّر کا روشن پہلو دکھاتی ہین۔ مثلاً بعض عورتین پرانے زمانے کی تعلیم اور دماغی قابلیت کے لحاظ سے مردون کے ہم پلہ تھین۔ پردہ سے انھین کامل آزادی تھی۔ لڑکیان سوئمبر کے ذریعہ خود اپنے خاوند پسند کرتی تھین۔ عورتون کی آزادی کا زمانہ نہ صرف ہندوستان کی تاریخ مین بلکہ روما مصر بابل اور دوسری مغربی ولائیتون کی تاریخ مین بھی گذرا ہے۔ لیکن اس کی مثال بجنسہ ایسی ہے جیسے اندھیری رات مین گھڑی دو گھڑی کے لیے چاند اپنی جھلک دکھا جاتا ہے۔ اگر اس مسئلہ پر تاریخی حیثیت سے مفصّل

بحث کیجائے تو اس بیان کی پوری تصدیق ہوسکتی ہے کہ زمانہ قدیم مین عورت کی ملکیت ہونے کا خیال عالمگیر تھا اہل فرنگ اور عیسائیون مین بھی یہی خیال شادی کی رسوم کی تہ مین پایا جاتا ہے۔ عیسائیون مین شوہر اپنی بیوی کو انگشتری پہناتا تھا تو وہ قدمبوس ہوتی تھی بعدہٗ اس رسم مین یہ ترمیم ہوئی کہ مرد اپنے ہاتھ سے انگوٹھی گرا دیتا تھا اور عورت جھک کر اُسے اُٹھا لیتی تھی اور پہن لیتی تھی۔ اب مرد عورت کی انگلی مین انگوٹھی پہناتا ہے۔ بیوہ یون کے ستی ہونے کی مثالین مغرب کی تاریخ مین بھی ملتی ہین۔ انگلستان اور دوسرے مغربی ممالک مین آجتک یہ قانون ہے کہ اگر کسی بیاہتا بیوی کا کسی غیر مرد کے ساتھ ناجائز تعلق ثابت ہوجائے تو شوہر عدالت سے اس شخص سے تاوان لے سکتا ہے۔ اسکی تہ مین بھی یہی خیال ہے کہ بیوی شوہر کی ملکیت ہے اور اسی لیے غیر مرد کو اس ملکیت کے خراب کرنے کا تاوان دینا پڑتا ہے مگر اہل فرنگ اسارے مین اپنا سلوک رسم ورواج اور قانون بدلتے جاتے ہین اور ان کے یہان اب عورتون کا مرتبہ قطعی مرد کے مساوی ہوتا جاتا ہے۔ مگر ہمنے اپنے پُرانے خیالات اور قدیم رسمون کے بدلنے مین زیادہ ترقی نہین کی ہے۔ یہ سچ ہے کہ تعلیم و تہذیب نے ہمارے خیالات و جذبات کا رنگ بھی بظاہر بہت کچھ بدل دیا ہے۔ تاہم ہمارے خیالات اور جذبات کی تہ مین عورت کے محکوم ہونے کا خیال اب بھی اسی طرح جاگزین ہے جیسا کہ زمانہ قدیم مین تھا البتہ چونکہ دل کا چور بیباکانہ ہٹ دھرمی کا اعتراف کرنے سے باز رکھتا ہے۔ اسلئے ہم اس خیال کو آئین واُصول اخلاق کی آڑ مین ظاہر کرتے ہین اور گو اب عورتین ستی نہین ہوتی ہین تاہم ہواؤن کو عام طور پر شادی کرنے کی اجازت نہین ہے اور اگر وہ ہمکی جراءت بھی کرین تو سوسائٹی اسکو اچھی نگاہ سے نہین دیکھتی۔ کنیادان کے بغیر اب بھی شادی کی رسم ادا نہین ہوسکتی ہے۔ کنواری لڑکیون کے لیے عصمت پروری اور پاکدامنی کا خیال جان سے عزیز تر قرار دیا جاتا ہے۔ اگر آئین واُصول اخلاق کی حمایت و پیروی منظور ہے۔ تو کنوارے لڑکون مین بھی یہ مرچہ یہ اور پاکبازی کی قیداُسیقدر لازمی ہونی چاہیے۔ لیکن نہ وہ دنیادار لوگ جنکو اپنی لڑکی کے لیے شوہر کی تلاش ہوتی ہے اور نہ وہ سمجھدار لڑکی جو اپنے شادی کے معاملہ مین دخل دینے کی جراءت رکھتی ہے۔ کبھی اس لاطائل کوشش مین اپنا وقت رائیگان کرنا ضروری سمجھے گی کہ قوم کے نوجوانون کی گذشتہ زندگی کی باریک بینی سے جہان بین کرے بشرطیکہ ظاہرا چال چلن اچھا ہو۔ اگر بدقسمتی یا نادانی سے کوئی بدنصیب لڑکی بے بنیاد افواہون کا نشانہ بنگئی تو ہماری مہذب و پابند اخلاق سوسائٹی مین اس کا کہین ٹھکانا نہین۔ آخر اسکی تہ مین کیا خیال ہے۔ جس طرح زمین کی خوبی یہ ہے کہ زرخیز ہو۔ گھوڑے کی خوبی یہ ہے کہ اچھی نسل کا ہو۔ تلوار کا جوہر یہ ہے کہ آبدار ہو اسی طرح مردون کی نگاہ مین عورت کی سب مین بڑی خوبی یہ ہے کہ دوشیزہ ہو۔ اگر یہ نہین تو اسکی حیثیت داغی مال سے بہتر

نہین - اور داغی مال کا کوئی خریدار نہین ہوتا ہے غرض عورتون کی حیثیت مال و جائداد سے زیادہ نہین ہے غیر تعلیم یافتہ یا نیم تعلیم یافتہ لوگ جس طرح اپنے گھرون مین بیویون اور عورتون کے ساتھ سلوک کرتے ہین وہ محتاج بیان نہین تعلیم یافتہ گھرانون مین بھی عورتون کے برتاؤ مین جس قدامت پرستی کا دخل چلا آتا ہے وہ ہمارے لیے باعث ناز نہین - لیکن اسے قطع نظر کرکے ان تعلیم یافتہ احباب کو لیجیے جنہین چشم بد دور سوشل رفارمر ہونے کا دعوے ہے یا جو تازہ ولایت ہین - یہ لوگ لڑکیون کی تعلیم کے بڑے حامی اور دعویدار رہین تاکہ وہ کھانا اچھا پکا سکین - ان کو سینے پرونے کا سلیقہ آوے - حفظان صحت کے نئے طریقون کے مطابق بچّون کی پرورش کر سکین - اُمور خانہ داری کو سلیقہ سے انجام دے سکین - ان کو اسکی تمیز ہو کہ خاوند کے فرصت کے لمحون مین اسکی طبیعت بہلا سکین اور ضرورت کے وقت خط و کتابت مین اسکا ہاتھ بٹا سکین - رامائن اور مہابھارت پران کو پورا عبور ہو - سیتا اور دروپدی کی مثالین ہر وقت ان کے سامنے موجود رہین اسی کے ساتھ اگر ان کے صاحب گارڈن پارٹی مین شریک ہون یا سوشل کانفرنس کے پلیٹ فارم پر رونق افروز ہون تو ان مین اوڑھنے پہننے اور باہر نکلنے کا اسقدر سلیقہ بھی ہو کہ ہمارے سوشل رفارمر کی شان مین کسی طرح بٹہ نہ لگے - وہ اصحاب بھی جو مل اور مارلے - ہکسلے اور اسپنسر کے فلسفہ کی قسمین کھاتے ہین - شوہر پرستی کے پُرانے معیار مین کسی قسم کا فرق دیکھنا پسند نہین کرتے - بہرحال ہم عورتون کے تعلیم کی اسوجہ سے حمایت نہین کرتے ہین کہ ان کے دل و دماغ کی نشوونما ہو - اُن مین خودداری اولوالعزمی اور آزادی کے ارمان پیدا ہون - فرائض کے ساتھ اپنے حقوق کی بھی وہ حفاظت کر سکین - بلکہ ہم اسوجہ سے عورتون کی تعلیم کے معین و مددگار ہین کہ عیش پسندی کے پُرانے طریقے نئی تعلیم کی روشنی مین اب ہمین بھلے نہین معلوم ہوتے اور ہماری شان اس بات کا تقاضا نہین کرتی کہ ہمارا شمار دقیانوسی لوگون مین کیا جائے ورنہ حکومت کا چسکا - عیش پسندی کی عادت اور خودپرستی کی بُو ہم مین اب بھی ویسی ہی ہے کہ جیسے پہلے تھی -

غالباً کہا جائے کہ تصویر کا یہ رُخ حد سے زیادہ تاریک دکھایا گیا ہے - سوسائٹی مین کثیر التعداد خاوند ایسے ہین جو اپنی بیویون کو نہایت آرام و آسایش سے رکھتے ہین اور ان کی آرایش اور زیبائش پر کافی سے زیادہ صرف کرتے ہین - علالت کے وقت تندہی سے تیمارداری کرتے اور ہر طرح انکی خاطر و تواضع کرتے ہین - یہ سب صحیح ہے بلکہ اسپر اسقدر اور اضافہ کیا جا سکتا ہے کہ اکثر کمزور طبیعت خاوند اپنی نادان اور ہٹ دھرم بیویون کی ضد پوری کرنے کے لئے زندگی بھر کے اصولون سے بھی دست بردار ہو جاتے ہین - بہت سے شوہر اپنی بیویون سے سچّی محبّت بھی رکھتے ہین اور ہر طریق سے ان کے ساتھ

مساوات کا برتاؤ کرتے ہین بیشک یہ لوگ سچے حامیان اصلاح کہے جا سکتے ہین - مگر اسکے یہی معنی ہین کہ اور قومون اور ملکون کے طرح ہماری قوم مین بھی اگر سخت دل بداطوار اور ظالم خاوندون کی تعداد بہت کافی ہے - تو نرم دل نیک چلن اور اچھے شوہر بھی کچھ کم نہین ہین - اگر ایسا نہ ہوتا تو دنیا نہ صرف عورتون کے لیے بلکہ مردون کے لیے بھی دوزخ سے بدتر ہو جاتی - لیکن اس سے دلیل زیر بحث کی تردید نہین ہوتی کہ ہندوستانی سوسائٹی مین عورت کی حیثیت بہت کچھ محتاج اصلاح ہے اور اصلیت یہ ہے کہ عورتون کی آزادی کی مخالفت اسوجہ سے نہین کیجاتی کہ ہمکو خوف ہے کہ قوم کے اخلاق و چلن پر اسکا خراب اثر پڑے گا - بلکہ محض اسوجہ سے کیجاتی ہے کہ ہمکو خوف ہے اور جا خوف ہے کہ اگر عورتون کو اعلےٰ تعلیم دیگئی اور ان کی آزادی کی حمایت کی گئی تو پھر وہ ہمارے قابو و اختیار کے باہر ہو کر ہماری ملکیت ہونے سے قطعی منکر ہو جائین گی -

کشن پرشاد کول

مذہب کا نصف حصّہ انصاف ہے - جو انصاف کا طالب ہے اسے خود بھی انصاف کرنے کے لیے تیار رہنا چاہیئے -

(جرمن)

اگر آپ کی خوشی کے دن طولانی نہین ہوتے تو رنج کی گھڑیان بھی جلد گزر جاتی ہین -

"

رنج و راحت ایک دوسرے کے ہمسایہ ہین

"

خوشی صرف اُمیدون کی دولت نہین ہے -

(ھورس)

انصاف کا تقاضا یہ ہے کہ کسی آدمی کو نقصان نہ پہونچانا چاہیئے -

"

جب تک کہ آدمی اپنے بھائی یا ہمسایہ کے لیے وہی چیز پسند نہین کرتا ہے جو اپنے لیے پسند کرتا ہے اس کا ایمان کامل نہین ہوتا -

(پیغمبر اسلام)

ٹرکی

گذشتہ چند سال کے دوران میں ترکوں نے وطن پرستی کے ایسے بے نظیر کرشمے اہلِ نظر کے سامنے پیش کر دیئے ہیں اور اس مستعدی اور دلیری کے ساتھ قوم کے مردہ قالب میں تازہ روح پھونک دی کہ ٹرکی کی موجودہ حالت کا ایک بیک یقین کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ پچھلے ڈیڑھ سو برس کے اندر یورپ نے مادی ترقی کی انتہائی منزل پر پہنچ کر دنیا کے لیئے قومی ہستی کا ایک معیار قائم کر دیا اور اب وہی قوم زندہ سمجھی جائیگی مستحق ہے جو قومی کشمکش میں دولِ یورپ کی دست درازیوں سے اپنے آپ کو بچا سکے۔ ٹرکی ہو یا مصر عرب ہو خواہ ایران۔ ہندوستان ہو یا چین غرض سب غیر یورپین اقوام یورپین ممالک کے اس دعوے کی زد میں آچکے ہیں کہ غیر یورپین دنیا پر حکومت کرنے اور اس کے قدرتی وسائل سے نفع حاصل کرنیکا اختیار اور اقتدار صرف یورپین اقوام ہی کو حاصل ہے۔ ابھی زیادہ عرصہ نہیں گذرا کہ اہلِ جاپان کو انتہائی جدوجہد کے بعد اس معاملہ میں کامیابی حاصل ہوئی ہے چین اب بھی اسی کشمکش میں ہے۔ دیگر ممالک کی جدوجہد کی داستانیں بھی طول طویل ہیں لیکن ٹرکی نے ایک قلیل زمانہ میں یورپین اثر سے رہائی حاصل کر کی تمام دنیا کو حیرت میں ڈالدیا ہے

سنگ بنیاد

موجودہ جمہوریہ ترکی قدیم سلطنت عثمانیہ کا ایک نہایت ہی قلیل حصہ ہے۔ عثمانی سلطنت کے سنگ بنیاد کی تلاش کے لیے تیرہویں صدی عیسوی کی تواریخ پر ایک نظر ڈالنا ضروری ہے جب وسط ایشیا کے باشندوں کا ایک جتھا منگولین حملوں سے تنگ آکر مغربی اطراف میں جائے اقامت کی تلاش کرتے ہوئے سلطان علاؤالدین کی اجازت سے شہر انگورہ کی حوالی میں آباد ہو گیا تھا ان کے سرغنہ ارتناغول نے ۱۲۸۸ء میں وفات پائی اور عثمان کو اپنا جانشین چھوڑا۔ اس زمانہ میں مغربی ایشیا زیادہ تر خاندان سلجوک کے زیر حکومت تھا عثمان کی جنگی امداد سلجوکی فرمانرواؤں کے لیے بیش قیمت ثابت ہوئی۔ اس کے صلہ میں سلطان علاؤالدین کیقباد ثانی نے ان اطراف کی ملکیت عثمان کو بخش دی جس کو اس نے یونانیوں سے فتح کیا تھا۔ آخر تیرہویں صدی میں جبکہ سلطان علاؤالدین کے انتقال کے ساتھ سلجوکی سلطنت کا خاتمہ ہو گیا۔ عثمان نے بھی اپنی خود مختاری کا اعلان کر دیا اس طرح ۱۳۰۰ء سے سلطنت عثمانیہ کا آغاز شروع ہوا۔ رفتہ رفتہ عثمان کا اثر وسیع ہوتا گیا اور حدود سلطنت میں اضافہ ہوتا رہا حتیٰ کہ سلطنت عثمانیہ دنیا کی مشہور طاقتوں میں شمار

ہونے لگی اور ایک زمانہ ایسا آیا کہ اس کا جھنڈا موجودہ ترکی اور قسطنطنیہ کے علاوہ جزیرہ نما بلقان کے کثیر حصّہ پر۔ افریقہ کے شمالی صوبجات مصر اور لیبیا۔ عرب کے صوبجات۔ نجد۔ حجاز۔ عراق۔ سیریا اور فلسطین پر لہرا رہا تھا۔

عام طور پر ملکی نظام شخصی حکومت کے طرز پر تھا۔ سلطنت مختلف ولایتوں میں منقسم تھی جن کو اندرونی معاملات میں پوری پوری آزادی حاصل تھی اور دور افتادہ ولایتیں امور خارجہ میں بھی ایک حد تک آزاد تھیں یہاں تک کہ غیر طاقتوں سے صلح کرنے میں بھی مرکزی حکومت سے اجازت لینے کی ضرورت نہ سمجھتی تھیں۔ مگر مذہبی رشتۂ اتحاد مضبوط تھا۔ سلطنت کے ہر گوشہ میں مذہبی معاملات کے متعلق شیخ الاسلام کا فرمان قطعی طور پر قابلِ تعمیل تھا۔

آئینی جدّجہد

دیگر ممالک کے مانند ٹرکی میں بھی آئینی اصلاحات کی بارہا کوششیں ہوئیں اور مطلق العنان حکومت میں اصلاح کے اکثر شاہی وعدے بھی ہوئے۔ ان سب میں اہم ترین اعلان نومبر ۱۸۷۶ء کا ہے جس میں سلطان عبد الحمید ثانی نے رعایا کے حقوق کی حفاظت۔ مذہب اور پریس کی آزادی اور پارلیمنٹری طرز حکومت کے قائم کرنے کا وعدہ کیا تھا لیکن خوشی کے ساتھ اپنی قوت اور اختیار میں کب کمی ہوتی ہے۔ دو ہی برس کے اندر شخصی حکومت کا دور پھر شروع ہو گیا۔ رعایا میں بےچینی پھیلنے لگی اور فوج میں بغاوت کی ابتدا ہوئی۔ لیکن سلطنت شاہی اقتدار کے شکنجہ میں کچھ اس مضبوطی سے جکڑ گئی تھی کہ ایک مدت تک اس بےچینی کا نتیجہ ظاہر نہ ہوا۔ آخر کار ۱۹۰۸ء میں مشہور ترکی لیڈر انور بے کی رہنمائی میں ایک شورش نمودار ہوئی جس کے سامنے سلطان عبد الحمید کو سر جھکانا پڑا۔ پارلیمنٹ کو دعوت دی گئی اور آئینی دور کا پھر افتتاح ہوا۔ لیکن اس دوران میں خیالات نے تیز رفتاری کی چال اختیار کر لی تھی۔ اہلِ قوم معمولی اصلاحات پر قانع رہنے کو تیار نہ تھے۔ انھیں طرز حکومت میں انقلاب پیدا کرنا منظور تھا۔ سلطنت عثمانیہ کے مختلف شعبوں میں آزادی کے خیالات اور خود مختاری کی جو ہوا چل رہی تھی وہ قومی لیڈروں کو بےچین کیے ہوئے تھی۔ وہ چاہتے تھے کہ نظام حکومت میں ایسی تبدیلی پیدا کریں جو مغربی خیالات سے ملتی جلتی ہو۔ تاکہ غیر ٹرکش عنصر کا رشتہ ترکی تخت و تاج سے قائم رہ سکے۔ ان خیالات کی تہ میں وطن کی محبت کام کر رہی تھی۔ لیکن واقعات مابعد نے یہ ثابت کر دیا کہ ترکی لیڈر اس معاملہ میں غلطی پر تھے۔ ان کا یہ خیال غلط ثابت ہوا کہ اگر غیر ٹرکش عنصر کو مذہبی آزادی اور مغربی طرز حکومت کے قائم ہونے کا یقین ہو جائیگا تو وہ اپنی قدیم سلطنت کے سایۂ عاطفت سے انحراف نہ کریں گے جبکہ حکومت اور قوم کے درمیان آزادی کی جد و جہد ہو رہی تھی تو غیر ٹرکی عناصر نے بھی اس موقع کو اپنی آزادی اور خود مختاری کے اعلان کے لیے

مناسب سمجھا اور ترکی کی بیچارگی اور بے بسی دیکھ کر ہمسایوں نے بھی ترکش مقبوضات کو مالِ غنیمت سمجھکر اس میں حصّہ لینا شروع کر دیا۔

جنگ بلقان آسٹریا ہنگری نے بوسینا اور ہرزگووینا کا الحاق کر لیا جو ۱۸۷۸ء سے بین الاقوامی مندوب کی بنا پر اُس کے قبضہ میں تھا۔ بلغاریہ نے بھی عثمانیہ حکومت سے اپنی آزادی کا اعلان کر دیا۔ اٹلی نے شمالی افریقہ کے صوبجات طرابلس اور بن غازی پر قبضہ کر لیا۔ غرض ریاستہائے بلقان نے ان تمام یورپین صوبجات کو جو دریائے مرتضیٰ کے مغرب میں واقع تھے ترکش حلقہ سے آزاد کر لیا۔ ۱۳-۱۹۱۲ء کی جنگ بلقان اِن تمام واقعات کا نتیجہ تھی۔ ترکی کو اس جنگ میں انتہائی نقصانات برداشت کرنا پڑے۔ اور جس نقصان سے بچنے کے لیئے قومی جد وجہد ہو رہی تھی وہ تمام کوششوں کے باوجود بھی ترکی حکومت کو اُٹھانا پڑا۔

جنگ یورپ اس جنگ کے خوفناک نتائج سے چھٹکارا ملنے کی نوبت نہ آئی تھی کہ ترکی کو یورپ کی عالمگیر جنگ میں شریک ہونا پڑا۔ جدید ترکش پارٹی ہمیشہ سے روس کو ترکی کا دشمن سمجھتی تھی اتحادیوں کے ساتھ روس کی شرکت جنگ اور ترکی کے ساتھ برطانیہ کی مخالفانہ پالیسی نے آخرکار ترکی حکومت کو جرمنی کا ساتھ دینے پر آمادہ کر دیا اور تمام اسلامی دنیا کو اتحادیوں کے خلاف اُکسانے اور اُن کے خلاف جہاد کا اعلان کرنے کے لیے شیخ الاسلام سے فتویٰ بھی حاصل کر لیا گیا۔ اتحادیوں نے بھی سلطنت ترکی کو نیست و نابود کرنے اور اُس کو مالِ غنیمت کی طرح آپسمیں تقسیم کرنے کا تہیہ کر لیا۔ آپس میں خفیہ معاہدے ہونے لگے مارچ ۱۹۱۵ء میں برطانیہ روس اور فرانس کے درمیان ایک عہدنامہ ہوا جس کے بموجب ساحل باسفورس قسطنطنیہ اور بحیرۂ مارمورہ کے یورپین ساحل اور درہ دانیال کا مستحق روس کو قرار دیا گیا۔ اِس عہدنامے کے مطابق اسلامی متبرک مقامات ترکی سے چھین کر ایک خودمختار اسلامی سلطنت کے حوالے کیے جانے والے تھے چند روز بعد ایک اور عہدنامے پر دستخط ہوئے جس کے بموجب بحیرہ میڈیٹرینین پر اٹلی کا حق تسلیم کیا گیا۔ مئی ۱۹۱۶ء میں برطانیہ فرانس اور روس نے عرب میں ایک خودمختار اسلامی حکومت قائم کرنے کی کوشش کی۔ اس پولیٹیکل شطرنج میں برطانیہ کی آخری چال ایسی تھی کہ جس نے ترکش مدبران کا سارا قلعہ ڈھا دیا۔ ترکش لیڈران نے روس کو زیر کرنے کے لیئے ترکی زبان بولنے والے لوگوں کے ملکی اتحاد کی کوشش کی تھی اور چونکہ روس کے حدود سلطنت میں ایسے لوگوں کی آبادی زیادہ تھی لہذا یہ خیال تھا کہ روس کو اس تحریک سے بہت پریشانی ہوگی لیکن برطانیہ نے امیر مکہ کی رہنمائی میں حجاز میں مذہبی بنیاد پر ترکی کے خلاف شورش برپا کر دی۔ اس پارٹی کے خیال سے ترکی کی نوجوان پارٹی ملک و قوم کو لامذہب بنا رہی تھی۔ واقعہ کچھ

ہو لیکن شیخ الاسلام کا فتویٰ بیکار ہوگیا اور دیگر ملکوں کی اسلامی رعایا کا غیر مسلم حکمرانوں کے خلاف جہاد عمل مین نہ آسکا۔ بلکہ بالآخر خود ٹرکی کو مصر اور عرب سے دستکش ہونا پڑا۔ ۳۰ اکتوبر ۱۹۱۸ء کو التوائے جنگ کے معاہدہ پر ٹرکی نے انتہائی بیچارگی کی حالت مین دستخط کیئے۔ اُس وقت ترکی مدبران ہمت ہار چکے تھے اور ترکی سپاہی ہتھیار رکھ چکے تھے۔ ہر طرف مایوسی کا عالم طاری تھا۔ پولیٹیکل کرۂ ہوا پر سیاہ بادل چھائے ہوئے تھے حوصلہ افزا شعاعین کوسون دور تھین۔ قومی آزادی خواب مین بھی نظر نہ آتی تھی اہل مغرب عرصہ سے ٹرکی کو ایک ایسا مریض سمجھ رہے تھے جس کی زندگی مین ایک لاعلاج گھن لگ گیا ہے جو اس کے گوشت و استخوان کو کھائے جا رہا ہے اِن کا خیال تھا کہ وہ زمانہ نزدیک آرہا ہے جبکہ اس بیمار کی نبض ساکت ہوجائے گی اور اُس کی روح ہمیشہ کے لیے قفس عنصری سے پرواز کر جائیگی اِن کو اِس کی زندگی سے مایوسی تھی وہ اِس کے علاج کرنے کی فکر مین نہ تھے کیونکہ اس کا مرض لاعلاج تھا۔ البتہ اگر اُن کو کوئی فکر تھی تو صرف تقسیم ترکہ کی تھی اور اگر کوئی دقت تھی تو آپس مین حصہ بخرے کی دقت تھی۔

سیورز کا صلحنامہ آخر کار ۱۰ اگست ۱۹۲۰ء کو اتحادیون نے صلحنامہ سیورز کے نام سے ٹرکی کی قسمت کا فیصلہ تحریر کر دیا۔ جس کے ذریعہ سے سب سے زیادہ زرخیز حصّے ٹرکی کے ہاتھ سے چھین لیے گئے۔ صوبہ جات عرب مثلاً عراق۔ سیریا۔ فلسطین وغیرہ پر اتحادیون کی مندوبی حکومت قائم کی گئی۔ مشرقی حصص جس مین آرمینیا اور کردستان شامل ہین ٹرکی کے قبضہ سے نکالکر خود مختار بنا دیئے گئے۔ سمرنا اور اولیا اٹلی کے حصّہ مین آئے۔ بحیرہ مارمورا کے کنارے کا ایک بہت بڑا حصّہ اتحادیون کے کمیشن کے سپرد کر دیا گیا۔ مشرقی اور مغربی تھریس یونان کو اتحادیون کی امداد کے صلہ مین دیا گیا اِس طور سے صرف ایشیائے کوچک کا کم قیمت اور قلیل حصّہ اور قسطنطنیہ ٹرکی کے حصّہ مین باقی رہ گیا یہ نقشہ تھا اُس عمارت کا جو سلطنت عثمانیہ کے وسیع و یرانہ پر اتحادی انجینیران بنانا چاہتے تھے۔ اور امید کرتے تھے کہ مشرق قریب مین بدامنی اور بےچینی کا دور ختم ہوکر صلح اور امن کے دور کا آغاز ہوگا۔

مگر سیورز کا صلحنامہ پیغام امن کے بجائے زور آزمائی اور جنگ و جدل کی دعوت ثابت ہوا۔ جس روز اس صلحنامے پر دستخط ہوئے تمام حدود سلطنت مین ماتمی دن منایا گیا۔ تمام اخبارات سیاہ حاشیہ سے رنگے ہوئے تھے۔ شہرون مین ہڑتال تھی بازارین اور تماشہ گاہین بند تھین غرض قوم نے صلح کے دن کو ماتم کا دن قرار دیا اور اپنے دلی جذبات کا اظہار کرکے اس آنیوالے دن کا نقشہ اہلِ نظر کے سامنے کھینچ دیا جبکہ اس صلحنامے کی وقعت ردی کی ٹوکری مین پھینکے جانے

والے کاغذ سے زیادہ نہ ہوگی۔

یونان اور ٹرکی سمرنا گوانلی کے قبضہ میں جانا چاہیئے تھا لیکن اس معاہدہ کی تکمیل روس کی منظوری پر مبنی تھی چونکہ روس نے اُس کو منظور نہیں کیا اور صلح کانفرنس کے سامنے یونانی وکیلوں نے اپنے دعویٰ کی وکالت اس زور وشور کے ساتھ کی کہ سمرنا کے بارے میں یونان کا حق مرجح تسلیم کرلیا گیا اور اُس کو اختیار دیا گیا کہ وہ اُس پر قبضہ کرلے مئی ۱۹۱۹ء میں یونانی لشکر سمرنا کے ساحلوں پر وارد ہوگیا۔ اِس فوج کشی کے دوران میں اہلِ یونان ایسے ناجائز افعال اور مظالم کے مرتکب ہوئے جو ترکوں کے سینوں میں تیر کے مانند چبھتے تھے۔ عوام الناس کے دلوں میں "تنگ آمد بجنگ آمد" کے مصداق انتقام لینے اور مرنے مارنے کی ہوس پیدا ہوگئی۔ انتہائی قومی مصیبت پر حب وطن کے شعلے بھڑک اُٹھتے ہیں چنانچہ اِس واقعہ نے ٹرکی کی سوکھی کھیتی پر بارانِ رحمت کا کام کیا وطن کی حفاظت کے خیال نے دلوں میں حب وطن کا جوش پیدا کر دیا۔ قومی تحریک کی آگ کے لیے سمرنا کے واقعہ نے دیا سلائی کا کام دیا اور اس واقعہ کے چند ہی روز بعد سیورز کا صلحنامہ جو قومی ذلت کی انتہائی منزل تھی اس آگ کے شعلوں کو بھڑکانے والی ہوا کا کام دینے لگا۔

قومی تحریک ٹرکی میں کچھ عرصہ پیشتر ہی سے قومی تحریک قدم جما چکی تھی عین اُس وقت جب ٹرکی کی تواریخ میں نازک ترین موقع آگیا تھا اور اس مریضِ یورپ کے دم نکلنے کا انتظار کیا جارہا تھا اس نوجوان سپاہی نے جس کا نام دنیا کے برگزیدہ محبانِ وطن کی فہرست میں شامل ہوچکا ہے اس کے ٹوٹے پھوٹے انقلابی لشکر کی رہنمائی اپنے ہاتھ میں لی۔ جدید ٹرکش انقلاب کے وقت سے اب تک ترکی حکومت کے متعلق سارے واقعات اس بہادر اور جوانمرد سپاہی کی ذات بابرکات سے وابستہ ہیں۔ مصطفےٰ کمال بے ۱۸۸۰ء میں سالونیکا میں پیدا ہوا تھا۔ اِس کی تعلیم وتربیت فوجی آب وہوا میں اور اس کی نشوونما کارزار اور لشکر آرائی کے خیالات میں ہوئی۔ آخر کار بائیس سال کی عمر میں فوجی تعلیم کی ڈگری حاصل کرکے شاہی فوج میں بھرتی ہوگیا مگر مصطفےٰ کمال کی کامیابی کا راز محض اس کی فوجی تربیت نہ تھی۔ اِس کے دل میں فطری طور پر حوصلہ اور ہمت ہے۔ اس میں خداداد قابلیت تھی وطن کی محبت کا جوش اِس کے دل میں لہریں مار رہا تھا اور سب سے بڑی بات یہ تھی کہ قدرت کو کامیابی کا سہرا اس کے سر پر باندھنا منظور تھا۔ فوج میں بھرتی ہونے کے بعد جس معرکے میں شریک ہوا اپنے افسروں اور ہمرکاب سپاہیوں سے خراجِ تحسین وصول کیا اور درجہ بدرجہ ترقی کرتے ہوئے تھوڑے ہی عرصہ میں ٹرکی کے نامور فوجی افسروں میں شمار ہونے لگا

اکتوبر ۱۹۱۸ء کی التوائے جنگ کے بعد جبکہ ٹرکی کا قومی شیرازہ بکھرا ہوا تھا اور قسطنطنیہ میں اتحادی فوجوں کا قبضہ تھا مصطفےٰ کمال اپنے وطن کی بہترین خدمت انجام دینے کا موقعہ تلاش کر رہا تھا آخر کار اس نے وزیر جنگ کو اس امر پر راضی کر لیا کہ اس کو مشرقی ممالک کا انسپکٹر جنرل بنا دیا جائے اس طرح پر اس کو اس قلیل فوج کا (جو صلحنامہ التوائے جنگ کے بموجب ٹرکی کو اناطولیہ میں رکھنے کا اختیار تھا) سردار بنا دیا گیا۔ مصطفےٰ کمال نے یہ موقع قومی سپاہ کے تیار کرنے اور ٹرکی کو اغیار کے ظلم و ستم سے بچانے کے لیے غنیمت سمجھا۔ ابتدائی تیاریوں کے بعد اس کا پہلا کام جولائی ۱۹۱۹ء میں پہلی کانگریس کا انعقاد کرنا تھا جس نے جدید قومی سوسائٹی کی بنیاد ڈالی دوسری کانگریس اسی سال میں ماہ ستمبر میں منعقد ہوئی۔ اس اجلاس میں مصطفےٰ کمال کے زیر صدارت ایک ایگزیکٹو کمیٹی مقرر کی گئی جس کا صدر مقام انگورہ مقرر کیا گیا۔

جدید قومی پارٹی کا سکہ عوام الناس پر اس زور و شور کے ساتھ جمنے لگا اور خود مصطفےٰ کمال کی ہر دلعزیزی اس قدر عام ہوگئی کہ اکتوبر ۱۹۱۹ء کے پارلیمنٹری انتخاب میں اس کی پارٹی کے کثیر التعداد نمایندوں کو کامیابی حاصل ہوئی۔ انتخاب کے بعد ہی کمال پارٹی کا ایک جلسہ انگورہ میں منعقد ہوا۔ اس جلسہ میں ٹرکی کا مشہور قومی اعلان پاس کیا گیا جو ترکی کے موجودہ قومی تحریک کا بنیادی پتھر ہے تمام بیرونی خطروں اور آفتوں سے دار الحکومت ٹرکی قسطنطنیہ کی حفاظت۔ اندرونی نظام سلطنت میں اہل ملک کو پوری آزادی اور ٹرکی کے غیر ملکی مقبوضات کی آیندہ قسمت کا فیصلہ خود انھیں کے باشندوں کی رائے پر چھوڑ دیا یہ چند اصول تھے جن کی بنا پر یہ قومی اعلان مرتب کیا گیا تھا۔

اتحادیوں کی طرف سے یہ اشارہ ہوا کہ وہ اس ٹرکش اسمبلی کی ہستی اس وقت تسلیم کریں گے جبکہ اس کا اجلاس ٹرکی کے مسلمہ دار الحکومت قسطنطنیہ میں ہو چنانچہ پارلیمنٹ نے اس قومی اعلان کو اپنے قسطنطنیہ کے اجلاس منعقدہ ۲۸ جنوری ۱۹۲۰ء میں بھی منظور کیا اب قومی پارٹی کی کامیابی میں کوئی شک و شبہ باقی نہیں رہا لیکن اصلی کامیابی کے پہلے قومی تحریک کو ایک اور نقصان اٹھانا پڑا جس نے ترکوں کے غم و غصہ کو اور دوبالا کر دیا۔ ۱۶ مارچ ۱۹۲۰ء کو اتحادی فوجوں نے قسطنطنیہ پر قبضہ کر کے نہایت جبر و تشدد کے ساتھ خاص خاص قومی لیڈروں کو گرفتار کر لیا جس میں رؤف بے بھی شامل تھے۔ اب کمال پارٹی کے بقیہ ممبران پارلیمنٹ کی پریشانی کی انتہا نہ تھی جون انگورہ واپس آکر انھوں نے ٹوٹی پھوٹی پارلیمنٹ کا پہلا اجلاس تشکیل اسمبلی کے نام سے ۲۳ اپریل کو منعقد کر کے قومی اعلان کا بیخوفی کے ساتھ دوبارہ اعادہ کر دیا۔

اب ٹرکی مین دو حکومتین قائم ہوگئین۔ ایک قسطنطنیہ مین داماد فرید پاشا کی وزارت اور اتحادیون کی رفاقت مین دوسری انگورہ مین کمال پاشا کی صدارت اور قومی جماعت کے سایہ عاطفت مین۔ اگر کمال پارٹی اُس وقت بزدلی سے کام لیتی تو سلطنت ٹرکی کا ہمیشہ کے لیے خاتمہ ہوجاتا لیکن اتحادیون کے ظلم وستم نے اُن کے غم وغصہ کو تازہ کردیا اب اُن کے دلون مین نئی امنگ پیدا ہوگئی کہ یا تو آزادی حاصل ہو یا موت یہ صدا اُن کی زبان پر تھی نیشنل اسمبلی نے عثمانی عہد حکومت کی موقوفی کا اعلان کردیا۔ اور جدید وزارت کا انتخاب کرکے شروع ۱۹۲۱ء مین اِن تمام اختیارات کو جو سلطان ٹرکی کو بحیثیت والیِ ملک حاصل تھے اپنے ہاتھ مین لے لیے اور اس امر کا اعلان کردیا کہ بجز نیشنل اسمبلی کے اور کسی شخص یا جماعت کو ٹرکی کے متعلق کوئی انتظام معاہدہ یا اعلان جنگ کرنے کا اختیار نہین ہے۔ اب کمال پارٹی کیلئے یونانیون کو اُن کے بداعمالون کی سزا دینے کی نوبت آئی۔ اس نے اس فیصلہ کن جنگ کے لیے فوج اور اسلحہ مہیا کرنا شروع کردیا غریب اور مفلس سپاہی جن کے جسم پہ نہ کپڑا تھا اور نہ پانون مین جوتی قیدخانون سے نکلے ہوئے قیدی جن کا کوئی ذریعہ معاش نہ تھا اور وہ لوگ جن کو لوٹ مار اور غدّاری کا چسکا تھا غرض ہر قسم کے آدمی خوشی کیساتھ میدان کارزار میں جانے کیلئے تیار ہوگئے۔ یونان اور ٹرکی کی جنگ کے مفصل حالات لکھنے کا اس وقت موقع نہین ہے صرف اس قدر کہنا کافی ہے کہ اس قومی جوش وخروش نے یونان اور ان کے مددگار اتحادی افواج کو ایسی شکستِ فاش دی کہ اُن کو اپنا بوریا بندھنا باندھ کر ٹرکی کی سرزمین سے ہمیشہ کے لیے منھ کالا کرکے بھاگنا پڑا۔ غازی کمال پاشا کی فتح کا ڈنکا بجنے لگا اور صلح کانفرنس کو پھر دعوت دی گئی۔

لوزین کانفرنس یہ صلح کانفرنس جو لوزین کانفرنس کے نام سے موسوم ہے بین الاقوامی تواریخ مین ایک اہم واقعہ ہے اس مین ٹرکی اور دول یورپ کے درمیان صرف حدود سلطنت ہی کے معاملات قطعی طور پر طے نہین ہوئے بلکہ ان تنازعات کا بھی فیصلہ ہوگیا جو ٹرکی کی مادی اور تجارتی ترقی کے متعلق عرصۂ دراز سے چلے آتے تھے اور جو ٹرکی کی خودمختارانہ زندگی کے راستہ مین حائل تھے۔ ٹرکی صرف اناطولیہ ہی مین ایک خودمختار سلطنت تسلیم نہین کی گئی بلکہ مشرقی تھریس بھی جسمین قسطنطنیہ شامل ہے ٹرکی کو اس کے مطالبات کے مطابق حاصل ہوگیا غیر ملکی عدالتی اختیارات کا بھی خاتمہ ہوگیا۔ ملّت سسٹم جس کی بنا پر ٹرکی کے حدود کے اندر مختلف یورپین اقوام کو خاص انتظامی اختیارات حاصل تھے موقوف کردیا گیا غرض ٹرکی اپنے حدود کے اندر ایک خودمختار سلطنت ہوگئی اور اُس کو اپنی مملکت مین وہی رتبہ حاصل ہوگیا جو دیگر سلطنتون کو اپنے اپنے ممالک مین حاصل ہے۔

مگران تمام واقعات سے بھی زیادہ اہم ٹرکش لیڈران کے وہ کارنامے ہین جو سلطنت اور خلافت کے خیرباد کہنے کے متعلق ہین یونانیون پر فتح پاکر اور ان تمام امتحانات مین کامیاب ہوکر جو مغربی اقوام نے ٹرکی آزادی کے لیئے عائد کیے تھے قومی لیڈران کی ہمت اور حوصلہ کی انتہا نہ رہی وہ سلطان کو جن کی حیثیت محض ایک برطانوی قیدی کی رہ گئی تھی نظر حقارت سے دیکھنے لگے (سلطان ٹرکی نے قومی لیڈرون پر اتحادیون کے حملے کی بھی چشم پوشی کی تھی، اور جب لوزین کانفرنس کی پہلی نشست ہونے کو تھی اُس وقت انگورہ گورنمنٹ کو نہین بلکہ قسطنطنیہ کو شرکت کا نوید دیا گیا۔ انگورہ اسمبلی نے اس امر پر صرف غم وغصہ ہی کا اظہار نہین کیا۔ بلکہ یکم نومبر ۱۹۲۲ء کو اس امر کا اعلان کر دیا کہ ٹرکی کی حکومت اب کسی ایک شخص کے ہاتھون مین نہین بلکہ نیشنل اسمبلی مین محدود ہے اور خاندان عثمانیہ مین جو شخص اس عہدے کے قابل ہوگا وہ صرف خلیفہ کی جگہ پر منتخب کیا جائیگا۔ چند ہی روز بعد سلطان پر ملکی غداری کے الزام پر مقدمہ چلانے کی تجویز ہوئی آخر کار سلطان وحید الدین آفندی نے اپنے پسر اور چھ درباریون کے ساتھ پوشیدہ طور پر شاہی محل سے بھاگ کر برطانوی جہاز پر پناہ لی۔

اب قومی حکومت کو جمہوریت کے اعلان کا اچھا موقع مل گیا چنانچہ اس نے ۱۸ نومبر کو نیا خلیفہ منتخب کیا لیکن اُس کو اختیارات حکومت سپرد نہین کیے گئے۔ نئے خلیفہ کو خلافت کی کرسی پر بٹھلاتے وقت عربی زبان مین نہین بلکہ ترکی زبان مین دعا مانگی گئی رسمی دعاؤن کے وقت ترکی زبان کا استعمال نوجوان قوم کی اہم ارادون کی آواز بازگشت تھی اُنھون نے حکومت اور مملکت کے معاملات کو مذہبی امور سے علیحدہ رکھنے کا تہیہ کر لیا تھا۔ اب ان کی پولیٹکل منزل کے لیئے چراغ ہدایت کا کام دینے کے لیئے ناکافی ثابت ہوا۔ اہل ترکی اب قوم اور جمہوریت کا کلمہ پڑھنے لگے چنانچہ ۳ رمارچ ۱۹۲۴ء کو خلافت کی موقوفی کا بھی فرمان جاری ہوگیا اور خلیفہ عبد المجید آفندی بھی جن کو قوم ہی نے خلافت کی کرسی دی تھی قومی خیالات کی زد سے محفوظ نہ رہ سکے ان کو بھی گھر بار چھوڑ کر جلاوطن ہونا پڑا۔

آئین جدید مصطفےٰ کمال نے اپنی یکم مارچ ۱۹۲۴ء کی تقریر مین آیندہ نافذ ہونے والے آئین کا نقشہ کھینچ کر دکھلایا تھا۔ اس تقریر مین آپنے صاف الفاظ مین ظاہر کر دیا کہ ٹرکی مین اب جمہوریت اپنا قدم ہمیشہ کے لیے جما چکی ہے اور تمام ایسے قوانین اور قواعد کی پابندی ہونا لازمی ہے جن سے ٹرکش پبلک کی حفاظت ہوسکے۔ اُنھون نے ترکون کی تعلیم کا انتظام طرز جدید پر کرنے کی ضرورت ظاہر کی قدیم اسلامی طریقہ پر چلنے والے مدرسون اور مکتبون کی موقوفی کا مشورہ دیا۔ عدالتی اختیارات کے متعلق مذہبی اور غیر مذہبی امور مین تفریق مٹانے کی صلاح دی فوجی افسران کو اسمبلی سے علیحدہ رکھنے کی رائے دی۔ آخر کار انھین اصولون پر جمہوریہ ترکی کا آئین مرتب کیا گیا اور اسے اپریل ۱۹۲۴ء مین اسمبلی نے منظور کر دیا۔ جمہوریہ کی

محافظت کا یہان تک انتظام کیا گیا ہے کہ آئین مین ایک خاص دفعہ اس لیے رکھی گئی کہ موجودہ آئین کے اس دفعہ کی جس کا منشاء ٹرکی مین ریپبلک قائم رکھنا ہے کبھی کوئی ترمیم یا تنسیخ نہ ہو سکے گی۔ اس آئین کے بموجب جملہ اختیارات سلطنت لیجسلیٹو۔ ایگزیکٹیو اور جوڈیشل سب نیشنل اسمبلی کو دیے گئے ہین۔ نیشنل اسمبلی قوم کی منتخب جماعت ہے اور ٹرکی کے ہر ایک باشندے کو جس کی عمر اٹھارہ سال سے کم نہو انتخاب کا حق حاصل ہے مگر اسمبلی کی ممبری کے لیے تیس سال عمر کی قید ہے اور وہ لوگ جو ترکی زبان مین لکھ پڑھ نہین سکتے اسکی ممبری سے محروم رکھے گئے ہین اسمبلی چار سال کے لیے منتخب کی جاتی ہے اور جمہوریہ کے صدر کا انتخاب خود اسمبلی کرتی ہے پریسیڈنٹ کا انتخاب بھی چار سال کے لیے ہوتا ہے مگر بعد ختم میعاد اس کا دوبارہ انتخاب بھی ہو سکتا ہے اس چار سال کی میعاد کے اندر پریسیڈنٹ کو اسمبلی کی کارروائیون اور بحث و مباحثہ مین شرکت کا اختیار نہین ہے وہ ایگزیکٹو گورنمنٹ کے صدر کی حیثیت سے ملکی نظام کا ذمہ دار ہے اور اسے اپنے کابینیہ یعنی مجلس وزرا کے ممبران کی تقرری کا اختیار حاصل ہے ملک مختلف ولایتون مین تقسیم ہے ہر ولایت کا انتظام اس کی کونسل کے سپرد ہے۔ اور ہر ایک ولایت اندرونی نظام مین خود مختار ہے۔

پریسیڈنٹ کو اسمبلی کے پاس کیے ہوئے قانون کو مزید غور کے لیے واپس کرنے کا مجاز ہے مگر جس شکل مین اس کو اسمبلی دوبارہ پاس کر دیگی تو پریسیڈنٹ کے لیے اس قانون کے پاس ہونے کے دس یوم کے اندر اس کو جاری اور نافذ کرنا لازمی ہوگا۔ معمولاً ہر ایک ترکی باشندے کو تقریر اور مذہب کے متعلق پوری آزادی حاصل ہے۔ قانوناً پریس بھی آزاد ہے۔ کسی شخص کے جان و مال اور عزت پر حملہ کرنے کا کسی کو اختیار نہین ہے۔ ہان جنگ اور بدامنی کے موقعون پر پریسیڈنٹ کو مارشل لا جاری کرنے کا مجاز ہے۔

مصطفےٰ کمال پاشا

مگر اس سخت تر قانونی شکنجے کے باوجود جس کے ڈھالنے مین خود مصطفےٰ کمال کو بہت بڑی حد تک دخل رہا ہے ایک شخصیت ہے جو ٹرکی پر حکومت کر رہی ہے۔ غازی مصطفےٰ کمال نے عثمانیہ کھنڈر کو خاک مین ملا کر جدید بنیادون پر ریپبلک کی عالیشان عمارت کھڑی کر دی۔ اس نے ناقابل علاج یورپین مریض کے ساتھ ایسی مسیحائی کی کہ اس کو مرض سے ہی رہائی نہین ہوئی بلکہ اس کو ایسا توانا بنا دیا کہ آج وہ اپنے مضبوط اور تندرست ہمسایون کے ساتھ مصافحہ کر رہا ہے۔ ایسے شخص کے نسبت اہل ٹرکی کے دلون مین جس قدر عزت اور احترام ہو کم ہے۔ در اصل انھون نے ترکی مملکت ہی پر نہین بلکہ اپنے قلوب پر بھی حکومت کرنے کا اختیار کمال پاشا کو دیدیا ہے آج مصطفےٰ کمال

کی زبان سے نکلا ہوا لفظ قانون بن جاتا ہے۔ انھیں نظام ملکی میں سیاہ و سفید کرنے کا پورا پورا اختیار حاصل ہے کس کی مجال ہے کہ ذرا سر بھی ہلا سکے چشم زدن میں عظیم الشان پولیٹکل اور سوشل تبدیلیاں محض مصطفےٰ کمال کے اشاروں پر وقوع میں آجاتی ہیں اگرچہ ٹرکی میں شخصی حکومت کے دور کا خاتمہ غازی کمال پاشا کی تلوار سے ہوا تاہم اس شخصیت میں حکومت کی قوت و قابلیت ہے اس کے سامنے زار روس کی حکومت محض ایک کہانی معلوم ہوتی ہے۔ اس کا ایک لفظ ٹرکی کے بڑے سے بڑے اور معزز سے معزز شخص کو قید خانہ میں ڈال سکتا ہے۔ اس کے قلم کی ایک جنبش ٹرکی کی عورتوں کے منھ سے نقاب ہٹا دینے کے لیے کافی ثابت ہوئی۔ قدیم دستور اور رواجات طاق نسیان پر رکھ دیے گئے۔ لباس اور طرز رہائش میں حیرت انگیز تبدیلیاں پیدا ہوگئیں۔ طریقۂ تعلیم نے بھی طرز نو اختیار کر لیا۔ غرض مصطفےٰ کمال پاشا نے محض اپنی شخصیت کی بنا پر ترکی جیسے قدامت پسند ملک پر انقلاب کے لفظ کا پورا اطلاق کر کے دکھا دیا دنیا میں بہت سے انقلاب ہوئے۔ خونریزیاں ہوئیں اور نظام حکومت میں حیرت انگیز تبدیلیاں واقع ہوئیں لیکن جس سرعت کے ساتھ ٹرکی کا انقلاب کامیاب ہوا اس کی مثال شاید ہی دنیا کے کسی اور ملک میں مل سکے اور نہ روئے زمین پر کوئی ایسا مہنگا گزرا ہے جس نے اپنی زندگی میں کسی عظیم الشان تحریک کی ابتدا کی ہو اور اس قدر جلد اس کو اپنی کوششوں کا ثمرہ مل گیا ہو ان باتوں پر غور کر کے اگر مصطفےٰ کمال پاشا کو عظمت اور کامیابی کی حیرت انگیز تصویر کہا جائے تو بیجا نہ ہوگا۔

انتت پرشاد نگم

انسانیت جبوقت تک زندہ ہے ضمیر کی ہدایتوں پر کاربند رہتی ہے لیکن جب وہ ایک قالب بے روح ہو کر محض ایک مشین بنجاتی ہے۔ اُسوقت وہ ضمیر کی ہدایات کے دسترس سے باہر ہو جاتی ہے۔ ایسی صورت میں اسمیں نشو و نما کی قوت باقی نہیں رہتی ہے بلکہ صرف اضافہ کی خواہش رہ جاتی ہے۔ اور اسکی تعمیری کوششیں محض خارجی ہوتی ہیں جن کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ کوئی کوئی سبب جو بظاہر بہت خفیف ہوتا ہے ہماری تعمیر کو جنبش دیدیتا ہے۔ اور ہماری عظیم الشان عمارت ڈگمگا کر زمین پر آرہتی ہے

برطانوی نوآبادیان

از پروفیسر سری رام شرما۔ ایم۔ اے۔ ایم آر۔ اے۔ ایس

بین الاقوامی قانون مین آج کل ایک سوال بڑی اہمیت حاصل کر رہا ہے یہان تک کہ دنیا کے دیگر ممالک کا تعلق ہے وہ سلطنت برطانیہ کو بہ حیثیت مجموعی ایک سلطنت تسلیم کرتے ہین۔ لیکن سلطنت برطانیہ مین اسوقت کئی قومین شامل ہین۔ چند ممالک اور چند اقوام جنکو اب ڈومنین کے نام سے پکارا جاتا ہے ایسے ہین جن کی بین الاقوامی حیثیت کا تعین ان کے حقوق اور ذمہ داریون کا فیصلہ بین الاقوامی قانون دانون کے لیے ایک ٹیڑھا سوال بن رہا ہے۔ ایک طرف تو وہ سلطنت برطانیہ کے جزو ہین اور لازماً خود مختار ممالک کی حیثیت سے ان کی ہستی تسلیم نہین کیجا سکتی ہے دوسری طرف انھین نہ صرف اپنے اپنے علاقون کے انتظام کے لیے مکمل اختیارات ملے ہوئے ہین۔ بلکہ خارجی معاملات مین بھی انکو پوری آزادی و خود مختاری حاصل ہے۔ بین الاقوامی مباحث سے قطع نظر سیاسی نقطہ خیال سے ہم ہندوستانیون کے لیئے ان نوآبادیون کی صحیح حیثیت کا معلوم کرنا نہ صرف دلچسپ بلکہ مفید مطلب ہوگا۔ کیونکہ عام طور پر جس سوراجیہ کا ہم برطانیہ سے مطالبہ کر رہے ہین وہ بھی برطانیہ کی نوآبادیون ہی کا رتبہ ہے۔

قبل اسکے کہ ان نوآبادیون کی بین الاقوامی حیثیت پر غور کیا جائے یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ خود مختار ممالک کے خصوصیات بیان کردی جائین۔ چنانچہ ان کی سب سے بڑی صفت "آزادی" ہے۔ کوئی ملک اسوقت تک آزاد نہین سمجھا جا سکتا ہے جبتک کہ اُسے اپنے حدود کے اندر پیدا ہونے والے مسائل کے متعلق سیاہ و سفید کا پورا پورا اختیار حاصل نہ ہو۔ اس آزادی و خود مختاری کے ظاہری نشانات یہ ہین (۱) ممالک غیر مین اپنے سفیر بھیجنا (۲) دیگر سلطنتون کے سفیرون کو اپنے ملک مین آنے کی اجازت دینا۔ (۳) بین الاقوامی معاملات کے مشورہ مین شریک رہنا (۴) اور بین الاقوامی معاہدون پر دستخط کرنے کا حقدار ہونا ان سب علامات کی اہمیت افغانستان کی قدیم و جدید تاریخ کے مطالعہ سے ہو سکتی ہے۔ سنہ ۱۹۱۹ء تک افغانستان کا دنیا کے خود مختار ممالک مین شمار تو ضرور تھا۔ لیکن اُسے مندرجہ بالا حقوق مین سے کوئی بھی حاصل نہ تھا۔ اسلیئے بین الاقوامی

قانون کے رو سے افغانستان کو اسوقت تک خودمختار ملک کا درجہ حاصل نہین تھا درحقیقت یہانتک نوبت پہنچگئی تھی کہ ۱۸۵۷ء مین جب روس اور انگلستان کے درمیان ایک معاہدے کے سلسلے مین افغانستان کے متعلق چند سوالات اُٹھے جو روس کے محاصل سے تعلق رکھتے تھے تو انھین امیر افغانستان سے مشورہ کئے بغیر طے کرلیا گیا۔ مگر ۱۹۱۹ء کے بعد سے صورت حالات بدلگئی ہے اور اقتدار سفیر تمام ممالک دنیا مین موجود ہین اور اکثر دول یورپ کے سفیر افغانستان مین بھی موجود ہین۔ افغانستان دیگر ممالک غیر سے صلح وجنگ کے متعلق بلاواسطہ کسی دیگر سلطنت کے گفت وشنید کرسکتا ہے۔ غرض آجکل افغانستان مکمل طور پر ایک آزاد و خودمختار ملک ہوگیا ہے۔

اب برٹش نوآبادیون کو لیجئے ان کے اندرونی انتظامات دیکھئے ان پر غور کیجئے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ تمام اندرونی معاملات اور ملکی مسائل مین اب یہ محض برائے نام برطانیہ عظمےٰ کی ماتحت رہ گئی ہین کئی سال سے ان تمام نوآبادیون مین مکمل خودمختاری کی جدوجہد ہورہی تھی۔ چنانچہ گذشتہ امپیریل کانفرنس کے اجلاس مین یہ جدوجہد کامیاب ہوئی چنانچہ ان نوآبادیون پر حکومت برطانیہ کا اب بہت کم اقتدار باقی رہ گیا ہے مثلاً برطانیہ کی ماتحتی کا سب سے بڑا جُوا گورنر جنرل کی صورت مین موجود تھا جسکو اندرونی معاملات مین بھی دخل دینے کے اختیارات تھے۔ برطانیہ عظمےٰ کے وزراء اور نوآبادیون کی برسراقتدار جماعت کے درمیان تمام نامہ وپیام اسی کی توسط سے ہوتا تھا۔ گورنر جنرل کو مجلس ہائے واضع آئین وقوانین کے پاس شدہ کسی قانون کا نفاذ ملتوی رکھنے اور حکومت برطانیہ کو اسنے منظور کرنے کا مشورہ دینے کا حق حاصل تھا۔ یہ اختیار استعمال تو شاذونادر ہی کیا جاتا تھا لیکن اسکی موجودگی مین ممالک کسی طرح خودمختار نہین سمجھے جاسکتے تھے۔ دوسری طرف لندن کی پریوی کونسل ان نوآبادیون کے مقدمات کی آخری اپیلین سنتی تھی۔ مگر گذشتہ امپیریل کانفرنس نے ان دونون باتون کو بےمعنی بنادیا۔ چنانچہ اب نوآبادیون کے گورنر جنرل کی حیثیت بجینہ وہی رہ گئی ہے جو شاہ انگلستان کی انگلستان مین ہے۔ یعنی اب گورنر جنرل کو نوآبادیون کے وزرائے سلطنت کے فیصلون کو منظور کرنا پڑیگا۔ نامہ وپیام کے متعلق بھی یہ طے ہوگیا ہے کہ مختلف نوآبادیان آپس مین اور برطانیہ عظمےٰ کے ساتھ اپنے اپنے وزیراعظم کے ذریعے خط وکتابت کرسکتی ہین البتہ جسطرح انگلستان مین بادشاہ وقت کو تمام سرکاری کاغذات دیکھنے کا حق حاصل ہے اسی طرح نوآبادیون کے گورنر جنرل کو بھی سارے نامہ وپیام اور گفت وشنید کی خبر ملتی رہے گی۔ غرض نوآبادیون مین اب گورنر جنرل کی حیثیت برطانیہ عظمےٰ کے سفیر کی رہگئی ہے گو دربارون اور رسمی موقعون پر انھین بادشاہ کے قائم مقام کا رتبہ حاصل ہوگا۔ پریوی کونسل کی اپیلون کے متعلق بھی یہی طے ہوتے ہوئے معلوم ہوتا ہے کہ ان نزاعون کے علاوہ جن کا تعلق بنیادی آئین حکومت سے ہو

دوسرے مقدمات کو پریوی کونسل تک جانے کی اجازت ہی نہ دیجائے گی اس ترقی و تبدیلی کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ اب شاہ انگلستان پورے طور پر کنیڈا جنوبی افریقہ آسٹریلیا اور آئرلینڈ کے بادشاہ ہوگئے ہین اور ان تمام ملکون مین جو حکومتین قائم ہین وہ بھی اب بادشاہ سلامت کی حکومتین کہلائینگی اس تبدیلی کو دو تین ذریعون سے عملی جامہ پہنایا گیا ہے۔ بادشاہ سلامت کا القاب بھی اب تبدیل ہوگیا ہے۔ پہلے وہ شاہ انگلستان اور والی نوآبادیات تھے۔ مگر اب وہ سلطنت برطانیہ اور نوآبادی ہائے انگلستان دونون کے یکسان بادشاہ ہین۔

گذشتہ ماہ انگلستان مین نئے سکہ مضروب ہونے شروع ہوئے ہین چنانچہ اُن پر بھی یہ تبدیلی واضح طور پر ظاہر کردی گئی ہے۔ لیکن اسبارے مین سب سے زیادہ اہم اعلان اسوقت ہوا تھا جب پچھلی امپیریل کانفرنس کے خاتمے پر بادشاہ سلامت نے سلطنت کے وزرائے اعظم کے نام پیغام بھیجا تھا جسمین یہ ذکر تھا کہ جس طرح مسٹر بالڈون برطانیہ عظمےٰ مین بادشاہ سلامت کے وزیر اعظم ہین اُسی طرح جنوبی افریقہ مین مسٹر ہرزوگ بادشاہ کے وزیر اعظم ہین جس طرح برطانیہ عظمےٰ کے معاملات مین بادشاہ سلامت کو مسٹر بالڈون کا مشورہ تسلیم کرنا پڑتا ہے۔ اسیطرح جنوبی افریقہ کے معاملات مین مسٹر ہرزوگ کا مشورہ قطعی ہوگا۔ مسٹر بالڈون کو جنوبی افریقہ آئرلینڈ کی فری اسٹیٹ آسٹریلیا یا کینیڈا کے اندرونی معاملات مین بادشاہ سلامت کو مشورہ دینے کا اختیار نہ ہوگا اور اگر کبھی کسی معاملہ مین کسی نوآبادی کی گورنمنٹ اور حکومت انگلستان کے درمیان کوئی اُلجھن پڑجائے تو اسکا فیصلہ اسی طرح باہمی نامہ و پیام سے ہوگا جیسا کہ دو خود مختار ممالک کے مابین نزاعی اُمور کا باہمی خط و کتابت سے ہوتا ہے بہرحال اس پیغام مین یہ امر واضح کردیا گیا تھا کہ حکومت انگلستان کو نوآبادیون کے معاملات پر کوئی فوقیت حاصل نہ ہوگی۔

یہان تک تو گھر کا معاملہ تھا۔ روس۔ فرانس۔ جرمنی یا ریاستہائے متحدہ امریکہ پر ان گھریلو انتظامات کا کوئی اثر نہین پڑتا ہے۔ جس طرح امریکہ کی مختلف ریاستون کے باہمی تعلقات یا مرکزی حکومت سے تعلقات کا سوال باقی ممالک کے لیے زیادہ دلچسپی کا باعث نہین ہے۔ اسی طرح برطانیہ عظمےٰ کا یہ نجی معاملہ ہے کہ وہ اپنی عظیم القدر سلطنت کے اندرونی انتظام کا بندوبست کرتی ہے۔ لیکن جیسے ہی یہ جدید نظام عمل سلطنت کے خارجی پالیسی پر اثر انداز ہونے لگتا ہے ویسے ہی اسکا اثر دُور دُور پہونچنے لگتا ہے۔ گذشتہ امپیریل کانفرنس لندن مین سالہا سال کی سیاسی جدوجہد کا نتیجہ عملی شکل مین نمودار ہوگیا۔ کسی ملک کی خود مختاری کی ظاہری علامتین جو ہم اس مضمون کے ابتدا مین بیان کرچکے ہین ان سب مدون مین رفتہ رفتہ ترقی ہورہی تھی لیکن ابھی تک جو کچھ ہوا تھا وہ باہمی سمجھوتہ اور پولٹیکل مراعات کے طور پر ہوا تھا۔ امپیریل کانفرنس کے انعقاد نے اب ان سمجھوتون کو مراعات کے دائرہ سے نکالکر قانون کے احاطہ مین داخل کردیا ہے۔ سب سے پہلے تجارتی

معاہدون کے متعلق جھگڑا شروع ہوا تھا اور ۱۸۸۵ء مین یہ قرار پایا تھا کہ کوئی تجارتی عہدنامہ جو برطانیہ عظمےٰ کی حکومت کیطرف سے باقی ملکون کے ساتھ کیا جائے اسکی پابندی نوآبادیون پر اسوقت تک لازمی نہ ہوگی جب تک کہ وہ اسے منظور نہ کرلین ۱۸۹۵ء مین اس بارے مین چند مزید تبدیلیان کی گئین اور نوآبادیون کو تجارتی معاملات کے متعلق دوسرے ملکون سے نامہ و پیام کرنے مین آسانیان پیدا کر دی گئین ۔ ۱۳-۱۹۱۲ء مین دو ایک بین الاقوامی کانفرنسون مین نوآبادیون کے نمایندون کو بھی مدعو کیا گیا ۔ بات یہ تھی کہ برطانیہ عظمےٰ ان کانفرنسون کے فیصلون کو تمام برٹش سلطنت سے منظور کرانے کی ذمہ داری لینے کے لیے تیار نہ تھا اسلیئے اگر برٹش نوآبادیون کے قاید تمام بلائے نہ جاتے تو یہ کانفرنسین ان معاملات مین کوئی ایسا فیصلہ نہ کرسکتین جو ان نوآبادیون پر بھی حاوی ہوسکتا لیکن آسٹریلیا ۔ کینڈا اور جنوبی افریقہ دنیا کے ایک بڑے حصہ کو گھیرے ہوئے ہین اسلیئے ان کی شمولیت کے بغیر یہ کانفرنس اپنے مقاصد مین ناکامیاب ہوتی اسلیئے محض حکمت عملی کے خیال سے نوآبادیون کو بھی ان کانفرنسون مین شامل ہونے کی دعوت دیگئی ۔

اسکے بعد جنگ عظیم کا موقعہ آیا ۔ چنانچہ اس موقعہ پر برطانیہ نے اعلان جنگ کرتے وقت اپنی نوآبادیون سے صلاح و مشورہ نہین لیا اور جن معاہدون کی رو سے برطانیہ کو جنگ مین داخل ہونا پڑا اُن کے طے کرتے وقت بھی نوآبادیون کو اطلاع نہین دی گئی تھی ۔ خیر لڑائی تو شروع ہو ہی گئی اور نوآبادیون سے بھی لازمی طور پر جنگ مین ہر قسم کی امداد دی گئی لیکن اس کے بعد جب ۱۹۱۷ء مین امپیریل کانفرنس کا انعقاد ہوا تو ایک امپیریل وار کیبنٹ بنائی گئی جسمین جنرل اسمٹس بھی شامل کئے گئے ۔ لڑائی کے خاتمے پر جب وارسلیز کا عہدنامہ مرتب ہونے لگا ۔ تو ہر ایک نوآبادی کے نمایندے بھی برطانوی وفدمین شامل کئے گئے اور جب ورسلیز کا یہ صلحنامہ طے ہوگیا تو اسپر نوآبادیون کے نمایندون نے بھی دستخط کئے علاوہ برین جب اس عہدنامہ کے تتمہ کے طور پر انجمن بین الاقوام قائم کی گئی تو ہندوستان اور انگلستان کی سب نوآبادیان بھی اس کی ممبر قرار دی گئین ۔ غور طلب بات یہ ہے کہ ہندوستان کینڈا ۔ جنوبی افریقہ ۔ آسٹریلیا اور آئرش فری اسٹیٹ کے سوائے انجمن الاقوام کے باقی سب ممبران خود مختار ممالک ہین ۔ قدرتی طور پر ان ممالک کی حیثیت بھی قریب قریب خود مختار ممالک کے برابر ہوگئی اس سلسلہ مین یہ ذکر کرنا بھی ضروری ہے کہ یہ رتبہ بڑے جھگڑے کے بعد نوآبادیون کے لیے حاصل کیا گیا تھا ۔ دوسرے ممالک برٹش نوآبادیون کے دعوی ہمسری تسلیم کرنے کو تیار نہ تھے ۔ اور یہ جھگڑا ابھی تھا کہ اسی طریقے سے سلطنت برطانیہ کو انجمن بین الاقوام مین دیگر ممالک کے مقابلے مین زیادہ نمائندگی ملجائیگی لیکن ان تمام باتون کے باوجود نوآبادیات کو انجمن بین الاقوام مین جگہ مل ہی گئی پچھلے سات سال کی کارروائی اس امر کی شاہد ہے کہ کئی معاملات مین نوآبادیون کے نمایندون نے برطانیہ عظمےٰ کے نمائندون سے

اپنا اختلاف رائے ظاہر کرنے مین کوئی دریغ نہین کیا لیکن نومبر ۱۹۲۷ء مین اس بارے مین ایک اور بڑی اور اہم کارروائی ہوئی - انجمن الاقوام کی سب سے مقتدر جماعت اس کی کونسل ہے جسکے سامنے دنیا کے صلح وجنگ کے سوالات ہوتے رہتے ہین - اس کونسل کے نہبر دو طرح کے ہین بعض اقوام ممالک اتنے عظیم ومقتدر ہین کہ ان کے لیئے اس کونسل مین مستقل جگہ نکالی گئی ہے مثلاً انگلستان، فرانس - جرمنی - اٹلی اور جاپان یہ سب اس کونسل مین مستقل طور سے شامل ہین لیکن کچھ جگہین انتخاب کے ذریعے پر کیجاتی ہین - چنانچہ اسمرتبہ کینیڈا بھی اس کونسل کے ممبری کا امیدوار تھا اور وہ اپنی کوشش مین کامیاب بھی ہوگیا ہے - دوران انتخاب مین کینیڈا کے نائندون نے ببانگ دہل کہدیا تھا کہ وہ کونسل مین برطانیہ عظمےٰ کی طاقت بڑھانے کے لیے نہین جارہے ہین بلکہ حسب موقعہ وہ اسکے برخلاف ووٹ دینے کے لیے بھی تیار ہین گے - غرضکہ اب یہ نوآبادی بین الاقوامی جلسہ مشاورت کی سب سے بڑی مجلس مین شامل ہوگئی ہے -

اس سلسلے مین ایک اور بات بھی قابل غور ہے - ۱۹۲۲ء مین حکومت انگلستان اور آئرلینڈ کی عارضی حکومت جمہوریہ کے نمایندون کے درمیان آئرلینڈ کے ہوم رول کے متعلق گفت وشنید ہوئی جسکے بنا پر دونون ملکون مین ایک باہمی عہدنامہ ہوگیا جسکے رو سے آئرلینڈ کے شمالی علاقہ چھوڑکر باقی تمام رقبے مین ایک فری اسٹیٹ قائم ہوئی اور جب آئرلینڈ کی حکومت کو انجمن بین الاقوام کی رکنیت ملی تو آئرش نمایندون نے اس عہدنامہ کو انجمن الاقوام کے دفتر مین حفاظت وسند کے طریق سے رکھادیا اسطرح عہدنامون کی یادداشت رکھنے کا سلسلہ بھی قائم ہوگیا تاکہ کوئی ملک ان عہدنامون سے منکر نہ ہوسکے - اگر کسی فریق کے طرف سے ان عہدنامون کی خلاف ورزی ہو تو انجمن بین الاقوام فوراً اسکے خلاف کارروائی کرسکتی ہے بہرحال انجمن کے دفتر مین اس عہدنامے کے فائل کرنے کا یہی مطلب ہے کہ آئرلینڈ اور انگلستان کے تعلقات محض انگلستان کے مرضی پر منحصر نہین ہے بلکہ ان تعلقات کو ٹھیک رکھنے کے لیے ایک بین الاقوامی ضمانت بھی موجود ہے - اسطرح سلطنت برطانیہ کے گھریلو معاملات مین بھی دوسری اقوام کو دخل دینے کا موقعہ مل گیا ہے -

اب رہا سفیر بھیجنے یا سفیر رکھنے کا معاملہ اسکے متعلق بھی کئی سال سے کارروائی ہورہی تھی کینیڈا کا سفیر امریکہ مین تعینات ہے - ۱۹۲۴ء سے آئرلینڈ کے نمایندہ کو بھی وہان رہنے کی اجازت ہے - ابھی تک اور کسی نوآبادی نے اپنا سفیر خاص تعینات کرنا ضروری نہین سمجھا لیکن یہ اصول منظور ہوچکا ہے - کہ ہر ایک نوآبادی اس معاملہ مین خود مختار ہے - اب اسبارے مین صرف ایک جھگڑا باقی رہ گیا ہے اور وہ یہ کہ جن ممالک مین یہ سفیر بھیجے جاتے ہین وہان کی حکومت بین الاقوامی قانون کے مطابق خود مختار ممالک کے صرف ایک ہی سفیر اپنے ہان رکھ سکتی ہے - اسلیئے ان نوآبادیون کے سفیرون کی حیثیت کے متعلق اکثر بحثین پیدا ہوجاتی ہین -

اسلئے ابھی تک یہ سفیر شاہ انگلستان کے نمایندون کی حیثیت سے تعینات ہوتے ہین اور برطانیہ کے سفرکی موجودگی مین نوآبادیون کے سفیر اسکے اسسٹنٹ کے طور پر سمجھے جاتے ہین اور انھین کوئی خودمختارانہ حیثیت حاصل نہین ہوتی اسی طرح عہدنامون کے متعلق بھی کبھی کبھی جھگڑا پیدا ہوجاتا ہے۔ مثلاً ۱۹۲۳ء مین جب کینیڈا اور امریکہ کے درمیان ماہی گیری کے متعلق ایک عہدنامہ ہوا تو امریکہ نے اس عہدنامے کو اسی شرط پر منظور کیا تھا کہ اس عہدنامہ کو انگلستان خود اپنے اور امریکہ کے درمیان معاہدے کی حیثیت سے تسلیم کرے۔

ایک نیا شگوفہ انگلستان مین ان نوآبادیون کے سفیرون کا قیام ہے۔ انگلستان کے نمائندے تو نوآبادیون مین گورنر جنرل کی حیثیت سے موجود رہتے ہین لیکن پچھلی امپیریل کانفرنس مین یہ بھی طے ہوگیا ہے کہ نوآبادیان بھی انگلستان مین اپنے سفیر رکھ سکتی ہین۔ چنانچہ اسبارے مین کینیڈا نے پیشقدمی کی ہے اور ایک رکن وزارت کو انگلستان مین بطور سفیر کے بھیجدیا ہے۔

اِن سارے واقعات کو سامنے رکھتے ہوئے یہ کہا جاسکتا ہے کہ برٹش نوآبادیون کی حیثیت اب قریب قریب خودمختار ممالک کی سی ہوگئی ہے۔ برطانیہ عظمےٰ کے ساتھ تو وہ مختلف ملکی فوائد اور گذشتہ تعلقات کی یادگار کے بناپر وابستہ ہین جبطرح سے فرانس یا اٹلی براعظم یورپ کے دیگر ممالک کے ساتھ عہدوپیمان کرکے ان سے اپنے دوستانہ تعلقات پیدا کرلیتے ہین اسی طرح برطانیہ عظمےٰ کے ساتھ بھی اسکی مختلف نوآبادیان اتحادانہ طریق سے شامل وشریک ہین۔

سریرام شرما

حکومتون پر زندہ ہستیون کا اطلاق نہین ہوسکتا۔ وہ محض نظامات قوت ہین اسی وجہ سے ان کی مادی خصوصیات سب جگہ یکسان ہوتی ہین اور اگر کچھ فرق بھی ہوتا ہے تو وہ صرف مدارج کا فرق ہوتا ہے۔ اگر اتفاقات زمانہ سے انسانی شخصیت کو نشوونما پانے اور برگ وبار پیدا کرنے کا موقعہ ملگیا تو حکومت کی گرفت ڈھیلی ہوجاتی ہے۔ اور قوم کو مکمل حیات کا موقعہ ملجاتا ہے۔ لیکن جبتک مادی نظامات کی جکڑبندی مکمل رہتی ہے حکومت ہی کا بول بالا رہتا ہے۔ غرض قومون کی زندہ روح اور حکومت منضبط کے درمیان ہمیشہ ایک کشمکش جاری رہتی ہے۔

ٹیگور

مُطالعۂ شاعری

(از مولوی حامد حسن قادری لکچرار سینٹ جانس کالج آگرہ)

شاعری کا مستقبل نہایت عظیم الشان ہے۔ اسلیے کہ شاعری اپنے بلند مقاصد اور اعلیٰ غرض وغایت کی وجہ سے بلاشبہ اس قابل ہے کہ مرورِ ایام و امتدادِ زمانہ کے ساتھ نسلِ انسانی اس کے اندر یقینی امن و آرام حاصل کر سکے۔ دنیا میں کوئی مسلک و مذہب نہیں جو آسیبِ تزلزل سے محفوظ ہو۔ کوئی مسلم اُصول نہیں جو موردِ اعتراض نہ ہوں، کوئی قابلِ تسلیم روایات ایسی نہیں جو محلِ تردید نہ ہوں۔ مذاہب کسی مفروضہ واقعہ پر قائم ہوتے ہیں۔ واقعہ کی تردید کر دی جائے تو مذہب بھی پایۂ ثبات و ثبوت سے گر جاتا ہے۔ لیکن شاعری کے لیے تخیل ہی سب کچھ ہے۔ شاعری اپنے جذبات کو تخیل سے وابستہ کرتی ہے۔ تخیل ہی اسکا واقعہ ہے۔

مطالعۂ شاعری کے دوران میں خواہ ہم ان متفرق چشموں میں سے جن سے شاعری کا بحرِ ذخّار مرکب ہے کسی ایک چشمہ پر سے گذریں یا تمام چشموں کو عبور کرنا چاہیں ہر حالت میں ایک ہی خیال ہمارا راہ نما ہونا چاہیئے یعنی شاعری کا تصور ہمارے ذہن میں نہایت اعلیٰ ہونا چاہیئے اس سے بہتر جیسا ابتک لوگوں کے ذہن میں رہا ہے عموماً جو اغراض و مقاصد شاعری سے منسوب کیے جاتے ہیں شاعری کو ان سے بہتر اغراض و مقاصد کا حامل تصور کرنا چاہیئے۔ جسقدر زیادہ غور کیا جائے گا اسی قدر زیادہ وثوق کے ساتھ ثابت ہوگا کہ معمائے حیات کی عقدہ کشائی۔ قلوب کی تسکین اور سرمایۂ حیات کی تلاش و جستجو کے لیے شاعری کی طرف رجوع کرنا لازم ہے۔ شاعری کے بغیر تمام علوم و سائنس نامکمل نظر آئینگے، اور اکثر مذاہب اور علومِ حکمیہ شاعری کے لیے جگہ خالی کر کے رخصت ہو جائینگے کیا خوب کہا گیا ہے کہ

"شاعری تمام علوم کے چہرہ کا پُر جذبہ انداز ہے۔"

اور حقیقت میں چہرہ کیا چیز ہے اگر اس سے جذبات کا اظہار نہ ہو۔ یہ مقولہ بھی کسقدر لطیف و صحیح ہے۔ کہ

"شاعری علوم کی روحِ رواں اور جوہرِ لطیف ہے۔"

مذاہب اور اُنکے واقعات اور شہادتیں جو ذہنِ عوام کی تکیہ گاہ ہیں۔ فلسفہ اور اسکے دلائل جو علت و نتائج اور ذات متناہی و غیر متناہی کے بحث و اثبات میں صرف کی جاتی ہیں اس سے زیادہ وقعت نہیں رکھتیں جو جسم کے مقابلہ

میں سایہ کو، بیداری کے مقابلہ میں خواب کو، حقیقی علم ویقین کے مقابلہ میں علم کی عقل فریب نمایش کو حاصل ہے، وہ دن آنیوالا ہے جب ہم ان چیزوں پر اعتماد کرنے اور انکو درست سمجھنے کی وجہ سے اپنی عقلو پر تعجب کرینگے۔ اور جسقدر ہم کو ان کی ناپائیداری کا زیادہ علم ویقین ہوتا جائیگا، اسی قدر ہم اس "روح رواں اور جوہر لطیف" کی زیادہ قدر کرینگے، جسے شاعری نے ہمارے سامنے پیش کیا ہے۔

لیکن اگر ہم شاعری کے اغراض ومقاصد اسقدر بلند قائم کرتے ہیں، تو شاعری کا معیار بھی زیادہ بلند وبرتر مقرر کرنا پڑے گا۔ اور اس بارے میں ہماری رائے وفیصلہ نہایت سخت ہونا چاہیے۔ سینٹ بیو بیان کرتا ہے کہ ایک مرتبہ نپولین کے سامنے کسی شخص کو فریبی دریاکار کہا گیا۔ نپولین نے کہا "اسکی ریاکاری کا کیا ٹھکانا ہے لیکن ریاکاری کہاں نہیں پائی جاتی؟" سینٹ بیو نے جواب دیا کہ "بیشک سیاسیات میں فن حکومت میں یہ کہنا صحیح ہے۔ لیکن عالم تخئیل میں آرٹ میں، وہ عظمت وشان اور وہ عزت جاوید جو میں ریاکاری کو دخل نہیں۔ ان چیزوں میں انسان کا شرف "اعزاز غیر متزلزل وغیر منفک ہے"۔ کیا خوب جواب ہے۔ ہم کو اسی کو اپنے پیش نظر رکھنا چاہیئے۔ شاعری تخئیل اور آرٹ کا مجموعہ ہے۔ اسمیں عظمت حقیقی اور عزت جاوید موجود ہے جہاں ریا ونمایش کا گزر نہیں۔ ریاکاری اور نمایش ظاہری اعلیٰ اور ادنیٰ۔ کامل وغیر کامل۔ صادق وغیر صادق۔ کے درمیان تفریق وامتیاز کو محو وباطل کردیتی ہے۔ جہاں یہ امتیاز اُٹھ جائے سمجھ لینا چاہیئے کہ یہ دانستہ ونادانستہ ریاکاری ہی کا کارنامہ ہے۔ اور سب سے زیادہ شاعری میں اس فرق ومراتب کا قائم نہ رکھنا ناجائز ہے۔ اسلئے کہ شاعری میں اعلیٰ وادنیٰ۔ کامل وغیر کامل صادق وغیر صادق کا امتیاز نہایت اہمیت رکھتا ہے۔ اور یہ اہمیت شاعری کے اعلیٰ مقاصد کے سبب سے ہے۔ اس حیثیت سے شاعری (صداقت وحسن شعری کے قوانین تنقید کے ماتحت) تنقید حیات بشری اور تبصرۂ وجود انسانی کی اہلیت رکھتی ہے اور جیسا ہم پہلے کہہ چکے ہیں اس قابل ہے کہ امتداد زمانہ کے ساتھ ساتھ اور دیگر ذرائع کی ناکامی کے بعد نسل انسانی شاعری کے اندر تسکین وراحت۔ اعتماد واطمینان حاصل کرسکے۔ لیکن اس اعتماد وتسکین کی قوت کا انحصار تنقید حیات کی قوت پر ہے۔ اور تنقید حیات اسی قدر قوی وصحیح ہوگی جسقدر وہ شاعری جو تنقید حیات کی اہلیت رکھتی ہے زیادہ اعلیٰ، زیادہ کامل اور زیادہ صادق ہوگی۔

ہمکو جس چیز کی ضرورت ہے وہ محض شاعری نہیں بلکہ بہترین شاعری ہے۔ بہترین شاعری ہر چیز سے زیادہ ہماری تعمیر سیرت۔ تکمیل حیات۔ اور نشاط روح کی قدرت رکھتی ہے۔ شاعری کے بہترین عناصر واجزا، کا روشن تر اور عمیق تر احساس اور اس سے حاصل ہونیوالی تقویت ومسرت کا شعور سب سے قیمتی نفع ہے جو مطالعۂ شاعری سے حاصل ہوسکتا ہے۔ لیکن اسکے ساتھ ہی مطالعۂ شاعری کے دوران میں اسکا قوی احتمال موجود ہے کہ ہم اپنے حقیقی نفع سے بے خبر ہوجائیں اور اسکی جستجو سے قاصر رہیں۔ اسلیے نہایت ضروری ہے کہ شاعری کا مطالعہ کرتے وقت

یہی خیال پیش نظر رکھیں اور ہمیشہ اسی کی طرف رجوع کرتے رہیں۔

بے شبہہ مطالعۂ شاعری کے دوران میں بہترین شاعری اور اسکی تقویت و مسرت کا احساس ہی ہمارے مدنظر رہنا چاہیئے۔ غرض جو کچھ بھی ہم مطالعہ کریں اسکے متعلق اندازہ و رائے قائم کرنے میں یہی خیال غالب رہنا چاہیئے۔ لیکن اسمیں ہماری ذرا سی غفلت سے دو قسم کے مخالفوں سے مغلوب ہونیکا احتمال رہتا ہے۔ اوّل تاریخی دوم ذاتی یہ دونوں ایک ہی نوع کے مغالطے ہیں۔ کوئی شاعر یا کوئی نظم یا تو تاریخی حیثیت سے ہماری نظر میں وقیع ہوسکتی ہے یا ذاتیات کی بنا پر۔ زبان، تخیل اور شاعری کی رفتار ترقی کا مطالعہ نہایت دلچسپ ہوتا ہے۔ اور ہم کسی شاعر کے کلام کو راہ ترقی کا ایک زینہ اور ایک منزل تصور کرکے اسکو شاعری کا وہ درجہ دیدیتے ہیں جو فی الحقیقت اس سے منسوب نہیں ہوسکتا۔ ہم اسکی تنقید کرتے وقت مبالغہ آمیز الفاظ استعمال کرتے ہیں اور اسکی حیثیت سے بڑھکر اسکا اندازہ قائم کرلیتے ہیں۔ اسطرح ہمارے شاعرانہ فیصلہ میں وہ مغالطہ پیدا ہوجاتا ہے۔ جسکو مغالطۂ تاریخی کہہ سکتے ہیں۔ اسی طرح ایک شاعر یا ایک نظم ہمارے ذاتی تعلقات کی بنا پر ہمارے لیے قابل وقعت ہوسکتی ہے۔ ہمارے ذاتی تعلقات، ہمارا میلان طبع ہمارے حالات خصوصی ایک دوسرے شاعر کے کلام کی طرف ہمارے اندازہ و رائے کو مائل کرسکتے ہیں۔ اور ہم اسکو وہ شاعرانہ اہمیت دے سکتے ہیں جو فی الحقیقت اسکے اندر موجود نہیں۔ اور اسکی وجہ یہ ہوسکتی ہے کہ وہ شاعر یا اس کا کلام ہماری ذات کے لیے کوئی اہمیت رکھتا ہے یا کوئی اہمیت رکھ چکا ہے۔ یہاں بھی ہم افراط سے کام لیکر مبالغہ کے ساتھ اسکی تحسین کرتے ہیں۔ اور اس طرح اپنے شاعرانہ فیصلہ میں دوسرے مغالطہ کو راہ دیتے ہیں جسکو مغالطۂ ذاتی کہہ سکتے ہیں

یہ دونوں مغالطے نظری ہیں۔ قدرتی طور پر ایک شخص شاعری کی تاریخ و ترقی کا مطالعہ کرتے وقت سوچنے لگتا ہے کہ بعض شعرا جو کسی زمانے میں بہت مشہور و ممتاز تھے۔ اب کیوں گمنام ہوگئے ہیں وہ اس امر کو ابنائے زمانہ کی قدردانی و غفلت پر محمول کرتا ہے اور اپنے دل میں کہتا ہے کہ یہ لوگ محض نادانی سے ایک شاعر کو پس پشت ڈال کر بلا کسی وجہ خاص دوسرے کو سامنے لے آتے ہیں۔

اس شخص کے جواب میں اور شعرائے قدیم کی کورانہ ستایش و پرستش کی مخالفت میں ایک نقاد کہتا ہے کہ "وہ سحاب عظمت جو کسی قدیم شاعر پر چھایا ہوا ہے ادبیات و شاعری کے مستقبل کے لیے ایسا ہی خطرناک ہے جیسا تاریخ شعر و ادب کے مقاصد و تدوین و ترتیب کے لیے سدّ راہ ہے۔ یہ سحاب عظمت فرضی و غیر موجہ ترجیح کے سوا اور کچھ ہمارے سامنے نہیں آنے دیتا۔ یہ حلقۂ نور اصلی چہرے کو ہماری نگاہوں سے چھپا دیتا ہے۔ اور جس مقام پر ایک انسان ہونا چاہیئے وہاں ایک مجسمہ ایک بُت نظر آتا ہے۔ اور شاعر کی سعی و محنت، کد و کاوش۔ اسکی خامیوں اور غلطیوں پر پردہ ڈالکر ہم سے مطالعہ کا نہیں بلکہ تعظیم و تحسین کا مطالبہ کیا جاتا ہے۔ سب سے بڑھ کر ایک موثر شعر و ادب کے لیے یہ قدامت پرستی ناقابل قبول ہے۔ اسلیے کہ یہ جذبۂ پرستش و ستایش اس قدیم شاعر کو اسکے زمانہ اور اسکی اصلی زندگی سے دور ہٹا دیتا ہے۔

تاریخی تعلقات کو منقطع کر دیتا ہے۔ اور اسکے متعلق تنقید کو ناجائز قرار دیتا ہے۔ اب ہمارے سامنے ایک انسان نہیں بلکہ ایک دیوتا ہوتا ہے جو اپنے مکمل و ناقابل تنقید کلیات دو دواوین کے درمیان تخت عظمت و جلال پر متمکن ہے۔ اور فن شعر کا ایک طالب شائق جسکو یہ کلیات اور دیوان ایسے حجابات سطوت و جلالت کے اندر سے دکھائے جاتے ہیں مشکل سے یقین کر سکتا ہے کہ یہ الہام روحی سے کچھ کم مرتبہ رکھتے ہونگے۔"

اس تقریر کے روشن و موثر ہونے میں شبہہ نہیں۔ تاہم فرق مراتب کو نظر انداز کرنا خلاف انصاف ہے۔ شاعر یا اسکے کلام کے اصلی معیار اور حقیقی مرتبہ کو دیکھنا چاہیئے اس پر اسکے عظمت کا انحصار ہے۔ اسکو جو رتبہ دیا جاتا ہے اگر اسکی صداقت مشکوک و مشتبہ ہے تو پرکھ لینا چاہیئے۔ اگر غلط ہے تو قطعی رد کر دینا چاہیئے۔ لیکن اگر صحیح و درست ہے اور اگر اسکا کلام واقعی بہترین اور اعلیٰ پایہ کا ہے تو پھر ہمارا فرض ہے کہ اسکو تسلیم کریں اور نہایت تعمق نگاہ و دقت نظر کے ساتھ اسکا مطالعہ کریں۔ اسکی تحسین کریں۔ اس سے لطف اندوز ہوں۔ اور اس کلام اور اس سے کم رتبہ کلام کے درمیان جو فرق ہے اس کا اندازہ کریں اور اسکو ہمیشہ پیش نظر رکھیں۔ یہی طریقہ صحیح و مفید ہے۔ اور مطالعۂ شاعری کا بڑا فائدہ یہی ہے۔ جو چیز اس سے مانع ہو۔ جو امر اس میں سدّ راہ ہو وہ یقیناً مضر ہے۔ شعرائے متقدمین کا مطالعہ دیدۂ وا اور چشم بینا کے ساتھ کرنا چاہیے۔ اور احتیاط رکھنی چاہیئے کہ حسن عقیدت یا ضعیف الاعتقادی چشم بصیرت کو محروم بصارت نہ کر دے۔ ہم کو احساس ہونا چاہیئے کہ کسی شاعر کا کلام کس مقام پر معیار سے گر گیا ہے۔ کہاں وہ صف اوّل سے پیچھے ہٹ گیا ہے۔ اور ایسی حالت میں وہی قیمت لگانی چاہیئے جو اس جنس کی نوعیت کے حسب حال ہے لیکن اس قسم کی تنقید بذاتہ چنداں مفید نہیں۔ اسکا بڑا فائدہ صرف یہ ہے کہ بہترین کلام اور اعلیٰ معیار کا روشن احساس اور اسکے ساتھ زیادہ عمیق دلچسپی پیدا ہو جاتی ہے۔ اور اگر یہ مقصود نہ ہو تو پھر کسی قدیم و مستند شاعر کی جگر کاوی۔ و کامیابی۔ اسکی ناکامی و خامی کی تلاش و تفتیش کرنا۔ اسکے زمانے۔ اسکی زندگی اور اسکے تاریخی تعلق کو تحقیق کرنا ادبی عیاشی سے زیادہ کچھ نہیں۔

جسوقت ہم شعرائے متقدمین کا مطالعہ کرتے ہیں تو اندازۂ تاریخی ہمارے فیصلہ اور طرز تنقید پر موثر ہوتا ہے اور جب متاخرین یا معاصرین سے بحث کرتے ہیں تو ہم اندازۂ ذاتی سے متاثر ہو جاتے ہیں حقیقت یہ ہے کہ ان بات کے دریافت کرنیکے لیے کہ کونسی شاعری اور کسکا کلام واقعی بہترین قسم اور اعلیٰ پایہ کا ہے۔ بہترین تدبیر یہ ہے کہ شعرا رکامل اور اساتذہ مستند کا بہترین انتخاب ہمارے پیش نظر اور اشعار برزبان رہیں۔ اور دوسروں کے کلام کو اسی کسوٹی پر پرکھیں یہ ضرور نہیں کہ ہر کلام اس کامل المعیار کلام سے بالکل مشابہ ہی ہو۔ اس سے مختلف بھی ہو سکتا ہے۔ لیکن اگر ہم کو ملکہ و مہارت پیدا ہو جائے گی۔ ذوق سلیم حاصل ہو جائے گا۔ معیار شاعری ذہن میں محفوظ ہو جائے گا تو ہم ہر کلام کو اسی کسوٹی پر کس کر دریافت کر سکیں گے کہ اس میں شاعری کا بہترین عنصر موجود ہے یا نہیں اور ہے تو کسقدر ہے۔ اس

کام کے لیے مختصر انتخاب۔ چھوٹی سی نظم یا غزل۔ چند اشعار بلکہ صرف ایک شعر بھی کافی ہو سکتا ہے۔
ہم سرسری انتخاب سے چند مثالیں پیش کرتے ہیں۔ کسی کا شعر ہے۔

دامانِ نگہ تنگ و گلِ حسنِ تو بسیار نظارہ زجنبیدن مژگاں گلہ دارد

یہ ایک واقعہ اور ایک تجربہ ہے جو ہر اہل دل اور صاحب نظر کو پیش آیا ہوگا۔ حسن بیان کی تعریف نہیں ہو سکتی،

نہ چناں گرفتہ جاں بمیان جان شیریں (نظیری) کہ تواں ترا وجاں را زہم امتیاز کردن

اظہار محبت اور نہایت عشق کی اس سے زیادہ دلنشیں مثال ملنی مشکل ہے۔

یک چشم زدن غافل ازاں ماہ نباشی شاید کہ نگاہے کند آگاہ نباشی

معشوق دوسری طرف متوجہ ہے۔ عاشق محو دیدار ہے اور منتظر کہ ادھر بھی ایک نظر دیکھ لیں۔ نظر سے نظر ملجائے، ممکن ہے نظروں ہی نظروں میں اظہار حال کا موقع مل جائے۔ ممکن ہے ہماری حالت زار دیکھ کر ہی انکو رحم آجائے۔ اتفاق سے ایک لمحہ کے لیے عاشق کی نظر اُدھر سے ہٹ جاتی ہے۔ اسی لمحہ میں اتفاق سے معشوق کی نظر عاشق کی طرف پھرتی ہے یا وہ خود اسی موقع کا منتظر تھا اور بالقصد اسی لمحہ میں عاشق پر نظر ڈالتا ہے۔ لیکن اب جو عاشق کی نگاہ پلٹتی ہے تو وہی سابق حالت موجود ہے۔ یہ شعر حقیقت پر بھی ایسا ہی صادق ہے جیسا مجاز پر۔ انوار الٰہی اور توجہ مرشد کے حاصل کرنے کے لیے بھی رجوع کامل و حضور تام شرط ہے۔

بضاعتے بکف آور کہ ترسمت فردا (عرفی) بجوے فشانی پیشانی حیا بخشند

علوے ہمت و ترغیب عمل کی کسقدر بلند مثال ہے کہ شاعر عرق انفعال کے ذریعہ سے مغفرت حاصل کرنے کو پست ہمتی کا مترادف سمجھتا ہے اور اس ذلت سے بچنے کے لیے عمل کی ترغیب دیتا ہے۔

ہفت دوزخ درنہادِ شرمساری مضمر است (غالب) انتقام است اینکہ با مجرم مداوا کردہ ٔ

اس شعر میں نفسیات انسانی پر کتنی عمیق نظر ڈالی گئی ہے اور عذاب شرمساری کو کتنے موثر پیرایہ میں بیان کیا ہے۔

شب امید بہ از روز عید می گذرد (نظیری) کہ آشنا بہ تمنائے آشنا خفت است

یہ شعر لذت عشق و کیف محبت کا ایسا صحیح و واقعی بیان ہے کہ ممکن نہیں ذوق سلیم بیخود نہ ہو جائے۔ ایک شاعر عاشق کے دل پر اس شعر کے پڑھتے ہی "شب امید" چھا جاتی ہے جو "بہ از روز عید" نظر آتی ہے۔ اور یہ محسوس ہونے لگتا ہے کہ "آشنا بہ تمنائے آشنا خفت است"

حسنِ تخیل و شعر سازی کی یہ بھی خوب مثال ہے:۔

مُغاں کہ دانۂ انگور را بآب می سازند ستارہ می شکنند آفتاب می سازند

شراب کو آفتاب کہنا کیا کیا معنے رکھتا ہے! خوشرنگی۔ حرارت روح افزائی۔ حیات بخشی اور سب سے زیادہ عظمت و شان

جسکو ستارہ کے تقابل نے آسمان پر پہونچا دیا۔

امیر مینائی نے شراب سے تلوار پیدا کی ہے۔

انگور میں تھی یہ مئے پانی کی چار بوندیں جس دن سے کھچ گئی ہے تلوار ہو گئی ہے،

یہ امیر کے رنگ کا نہایت اعلیٰ شعر اور انکے چند نشتروں میں سے ایک نشتر ہے۔

دل کی آبادی کی اس حد ہے خرابی، کہ نپوچھ (میر تقی) جانا جاتا ہے کہ اس راہ سے لشکر نکلا

دل کی ویرانی کا مختصر سا بیان ہو کہ "اس راہ سے لشکر نکلا" لیکن بڑی سے بڑی تفصیل اسکے اندر موجود ہے۔ آگ لگنے سے بھی آبادی تباہ ہو جاتی ہے۔ سیلاب بھی یہی کام کرتا ہو۔ لیکن اس تباہی سے زیادہ دردناک اور عبرت خیز سین لشکر نکل جانے سے ہوتا ہے۔

ہوگا کسی دیوار کے سایہ میں پڑا میر (میر تقی) کیا کام محبت سے اس آرام طلب کو

میر کی فدائیت کا تو یہ حال کہ بزم دوست میں نہیں پہونچ سکتا تو دوست کے دیوار کے نیچے ہی پڑا ہے۔ اور اس پر طعنہ کہ "کسی دیوار کے سایہ میں پڑا ہوگا۔ کیا کام محبت سے اس آرام طلب کو! اس بلاغت کا جواب نہیں۔

خواجہ میر درد کا یہ قطعہ دیکھئے۔ ناتجربہ کار عاشق اوّلیں احساس محبت کے بعد کیا کہتا ہے۔

آتش عشق قہر آفت ہے، ایک بجلی سی آن پڑتی ہے،
آخر الامر آہ کیا ہوگا؟ کچھ تمہارے بھی دھیان پڑتی ہے؟

اس شعر کے درد کو دیکھئے:۔

میرے احوال پر نہ ہنس اتنا (درد) یوں بھی اے مہربان پڑتی ہے،

مصحفی کا شعر ہو:۔

شاہد رہیو تو اے شب ہجر جھپکی نہیں آنکھ مصحفی کی،

شب ہجر سے تخاطب نے عجیب درد و اثر پیدا کر دیا ہے۔

ان اشعار میں رفعت تخیل ملاحظہ ہو۔

ہنگامہ زبونیِ ہمت ہے انفعال غالب حاصل نہ کیجے دہر سے عبرت ہی کیوں نہو
مٹتا ہے خوف فرصت ہستی کا غم کوئی " عمر عزیز صرف عبادت ہی کیوں نہ ہو
شرم اک ادائے ناز ہے اپنے ہی سے سہی " ہیں کتنے بے حجاب کہ یوں ہیں حجاب میں
ہے غیب غیب جسکو سمجھتے ہیں ہم شہود " ہیں خواب میں ہنوز جو جاگے ہیں خواب میں

اگر ذوق سلیم اور احساس صحیح موجود ہو تو یہ چند اشعار بھی اس امر کے لیے کافی ہیں کہ شاعری کے متعلق صحیح رائے

اور درست فیصلہ میں ہماری اعانت کرسکیں اور غلط رائے قائم کرنے سے محفوظ رکھ سکیں۔ یہ نمونے باہم ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہیں۔ ہر ایک میں ایک علیحدہ خیال ہے۔ ہر ایک کا طرز ادا جداگانہ۔ لیکن سب کی قدر مشترک یہ ہے کہ سب کے اندر بہترین حسنِ شعریت موجود ہے۔ اگر ان اشعار کے عناصر نظم و محاسن شعر کو ذہن نشین کر لیا جائے تو یہ ملکہ پیدا ہو جائیگا کہ جو نظم جو شعر ہمارے سامنے رکھ دیا جائے ہم دریافت کرسکیں کہ اسکے اندر بہترین اوصاف شاعری کسقدر موجود اور کسقدر مفقود ہیں۔ نقادان سخن معیار شاعری کو الفاظ میں بیان کرنے کی کوشش کرتے ہیں لیکن بہترین صورت یہی ہے کہ مثالیں پیش کردی جائیں۔ اعلیٰ شاعری کے نمونے دکھائے جائیں اور کہا جائے کہ بہترین اوصاف شاعری یہ ہیں جو اس کلام میں موجود ہیں۔ ان اوصاف کا شعور و احساس نقاد کی نثر سے اسقدر قوی و صحیح نہیں ہوسکتا جتنا شاعر کی نظم سے ہو سکتا ہے۔

حامد حسن قادری

اگر ہمارے سامنے کسی شخص کی مصیبت کا حال دردانگیز لفظوں میں بیان کیا جائے تو اس واقعہ کے ادراک کے ساتھ ہم پر ایک اثر طاری ہوگا۔ اس قسم کے اثروں کا نام جذبات یا احساسات ہے اور جو چیز ان جذبات اور احساسات کو برانگیختہ کرسکتی ہو وہی شاعری ہے۔ منطقی حیثیت سے شاعری کلام کی وہ قسم ہے جس سے جذبات انسانی برانگیختہ ہوں اور اسکے مخاطب حاضرین نہ ہوں بلکہ انسان خود اپنا آپ مخاطب ہو اسیکا نام شاعری ہے۔

شعر کا طبیعت پر اثر کرنا ایک فطری بات ہے۔ شعر دراصل دو چیزوں کا نام ہے۔ مصوری اور موسیقی اور یہ دونوں چیزیں فطرۃً انسان کے دل پر اثر کرتی ہیں۔

ارسطو کے نزدیک شعر ایک قسم کی مصوری اور نقالی ہے۔ فرق یہ ہے مصور صرف مادی اشیاء کی تصویر کھینچ سکتا ہے، بخلاف اسکے شاعر ہر قسم کے خیالات۔ جذبات اور احساسات کی تصویر کھینچ سکتا ہے۔

شبلی نعمانی

مشاغل دنیوی میں انہماک کے سبب سے جو قوتیں سو جاتی ہیں شعر انکو جگاتا ہے اور ہمارے بچپن کے اُن خالص اور پاک جذبات کو جو لوث غرض کے داغ سے منزہ اور مبرّا تھے۔ پھر تر و تازہ کرتا ہے۔

ماخوذ

شاعری کیا ہے؟ دلی جذبات کا اظہار ہے۔ دل اگر بیکار ہے تو شاعری بیکار ہے۔

صفی

علم تاریخ

از سید فضل الرحمان صاحب بی اے ایل ایل بی وکیل

اگر ہم زمانہ کی مسلم تقسیم ماضی وحال ومستقبل کے لحاظ سے انسانی حالات پر غور کرین تو معلوم ہوگا کہ انسان اپنے ماضی کا مرہون منت، زمانہ حال کا نمونہ۔ اور اپنے مستقبل کا ذمہ دار ہے۔

انسان کا مستقبل کیا ہوگا یہ فن پیشین گوئی مین داخل ہے۔ زمانہ ماضی نے ہم پر کیا اثر کیا۔ یہ تاریخ ہے۔ اگر یہ حقیقت ہمارے ذہن نشین ہوجائے کہ ہم جو کچھ بھی ہین اپنے ماضی کا نتیجہ ہین تو علم تاریخ ہمارے لیئے ایک دلکش اور مفید ترین اکتساب ہوجاتا ہے۔ مشکل یہ ہوتی ہے کہ اگر ہم صرف اپنی ہی زندگی کے پچاس برس پیشتر کے واقعات پر نظر ڈالین تو اوس زمانہ کے جذبات اور خواہشات کا ٹھیک اوسی وقت کے حالات کے ماتحت تصور کرنا ایک دشوار امر ہوجاتا ہے۔ اور اس سے زیادہ دشواری اوس وقت پیش آتی ہے جب ہم اپنے اسلاف کی حالت کا مطالعہ کرنے بیٹھتے ہین اسی مشکل کا حل کرنا ماہرین تاریخ کا کام ہے اگر غور سے دیکھیئے تو علم تاریخ کی حقیقت یہی ہے کہ وہ اس کائنات ارضی کے زمانہ ابتدائی کے واقعات وحالات کو نظم وترتیب کیساتھ جمع کرتی ہے اور پھر اونکو مطالعہ کے لیے منتشر اور پراگندہ تفصیلات سے اخذ کرکے مرتب شکل مین پیش کرتی ہے۔

تاریخ کی ترتیب وتدوین مین جو دوسری مشکل پیش آتی ہے وہ یہ ہے کہ اسکا ماخذ کوئی ایک سلسلۂ واقعات نہیں ہوا کرتا ہے بلکہ متعدد اور مختلف ذرائع سے نتائج اخذ کرکے یکجا کیے جاتے ہین۔ موجودہ حالت انسانی کیونکر پیدا ہوئی یہ صرف کسی ایک عنوان کے تاثرات کا نتیجہ نہین ہین۔ مثلاً محض سیاسیات کا نہین، بلکہ اقتصادیات، معاشرت۔ مذہب فنون لطیفہ وغیرہ ان سب نے ملکر انسان کی موجودہ حالت پیدا کردی ہے۔

اس لیے ایک تاریخ نویس کو انسانی زندگی کے ان تمام شعبون پر نظر رکھنا پڑتی ہے۔ اس سے زیادہ ایک اور دشواری اس راہ مین یہ ہے کہ سب سے ابتدائی دور کے واقعات ایسے زبانی روایات دور از کار اور بعید از قیاس قصّون اور افسانون مین اوجھے ہوتے ہین کہ اس خارزار مین سے پھولون کا چننا اور اس بحر ذخار مین سے موتیون کا نکالنا نہایت مشکل ہوتا ہے ماہرین علم تاریخ فی الحقیقت اپنی کوششون مین ناکامیاب رہتے، اگر علمائے طبقات الارض وآثار الصنادید اور دیگر ماہرین انکی امداد نہ کرتے۔ درحقیقت زمین کے ۹ طبقات کی نوعیت اور اُنکے تغیر وتبدل ہی سے انسان کے

اس ابتدائی وجود کا پتہ لگتا ہے جب وہ اس ستارہ مین ظاہر ہوا جسکو ہم زمین کہتے ہین۔ اسی طرح قدیم ممالک مثلاً مصر بابل اور ہندوستان کی ابتدائی تہذیب اور تمدن کے حالات اُسوقت معلوم ہوئے جب ماہرین علم آثار نے وہان کے کتبون کے حروف پڑھکر ہمکو انسے واقف کیا۔

تاریخ کے مطالعہ کرنے والون کو سب سے پہلے یہ امر ذہن نشین کر لینا چاہیئے کہ تاریخ ہر زمانہ مین ایک زندہ اور متحرک ہستی تھی یعنی ہر شخص اپنے وقت مین اپنے خیال ویقین کے مطابق زندگی کے مقصد واغراض کے حصول مین کوشان اور ساعی تھا۔ زمانہ گذشتہ پر نظر ڈالنے سے واضح ہوجائیگا کہ جسطرح آج کل ہم اپنے روزمرّہ کے مشاغل اور ضروریات مین منہمک ہین اسی طرح اوسوقت کے لوگ بھی اپنے اپنے کامون مین مصروف تھے۔ اگر ہماری نظر محدود ہو اور ہم اپنے مکانون کی چاردیواریون مین گھرے ہوئے ہین تو اسکے یہ معنی نہین کہ اس دنیا کا باقی ماندہ حصہ بیکار ہو یا ہم سے پہلے کا زمانہ بیکار اور ہیچ تھا۔ شکسپیر کا قول کہ دنیا تھیٹر کا ایک سٹیج ہے اور ہم نفی ایکٹر ہین۔ غالب کے اس شعر کی طرح،

"بازیچۂ اطفال ہے دنیا مرے آگے ہوتا ہے شب و روز تماشہ مرے آگے"

محض شاعرانہ تخیل ہے۔ کیونکہ گذشتہ واقعات یا بقیہ حصۂ عالم کا ہمارے کریکٹر پر اثر پذیر ہونا ایک حقیقت نفس الامری ہے۔ بلکہ یون کہنا چاہیئے کہ زمانہ حال، زمانہ ماضی کا آئینہ ہے۔

قبل اسکے کہ ہم اس مضمون کے متعلق اور کچھ لکھین، ناظرین زمانہ کی توجہ لفظ تاریخ کی طرف مبذول کرانا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ لفظ تاریخ دو مختلف معنون مین استعمال ہوا کرتا ہے۔ کبھی تو اسی لفظ کے معنی وہ تاریخ ہوتی ہے جو ضبط تحریر مین آچکی ہو، مثلاً جب ہم کہتے ہین کہ فلان واقعہ قبل تاریخ ہوا تھا یا زمانہ قبل تاریخ کے الفاظ استعمال کرتے ہین تو یہان ہمارا مقصود وہ تاریخ ہوتی ہے جو لکھی جاچکی ہے۔ لیکن لفظ تاریخ کے حقیقی معنی واقعات عالم کا مطالعہ اور اونکو ایک رشتہ مین مرتب کرنا ہین۔

کسی وقت مین مورخین کے ذرائع علم محض وہ واقعات تھے جو ضبط تحریر مین آچکے تھے اُنکی نظرین اسی حد تک محدود تھین، وہ اُن ذرائع سے قطعی بے خبر تھے جن سے اب ہمکو علمائے آثار وغیرہ نے روشناس کردیا ہے۔ اب ہمکو معلوم ہوگیا ہے کہ روئے زمین مین جہاں پر بھی کسیوقت انسانی آبادی تھی وہاں اوس مکمل تاریخ کے لیے پورا سرمایۂ مادّی شکل مین موجود اور محفوظ ہے۔ ضرورت صرف اتنی ہے کہ تحقیق وتلاش کے بعد یہ سرمایہ کتاب کی صورت مین لایا جاوے۔ یہ ہی نہین بلکہ انسان کے اس کرۂ ارض پر آنے سے قبل یعنی دس لاکھ برس پہلے کے چٹانون کے مطالعہ نے اوسوقت کے جانداروں کی شکل وصورت سے بھی آشنا کردیا ہے۔ اور آگے چلیئے۔ یہ بھی معلوم ہوگیا ہے کہ ہماری زمین۔ اور یہ چاند اور سورج کسطرح ایک کرۂ آتشین سے جو بڑی تیزی سے گردش کر رہا تھا۔ لگ ہوکر اب ہماری آرام وآسائش بلکہ ہماری حیات ارضی مین ممد ومعاون ہین۔

اس تبدیلی کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ علم تاریخ اب اکتسابات انسانی کا ایک وسیع عجائب خانہ یا فطرت انسانی کا ایک دلکش مرقع ہوگیا ہے اور ہر شخص اپنے اپنے مذاق کے مطابق اس مرقع یا عجائب خانہ سے لطف اندوز ہو سکتا ہے۔ مثلاً ایک شخص کو صرف انسانی جذبات اور خیالات کا تفحص کرنا ہے۔ اوسکو افعال و اعمال انسانی سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ یعنی اوسکو مدبرین سیاست یا ماہرین جنگ سے واسطہ نہیں ہے وہ صرف فلسفیون اور شاعرون کے حالات جاننا چاہتا ہے۔ ایک اور شخص ہے جو صرف تاریخ مذہب کے تدریجی نشو و ارتقاء کا مطالعہ کرنا چاہتا ہے۔ ایک تیسرا شخص محض فنون لطیفہ سے دلچسپی رکھتا ہے۔ وغیرہ۔ اسلیے ایک مکمل تاریخ مین جملہ شعبہ جات انسانی کے بدو و ارتقا اور اونکی موجودہ حالت کا بیان ہونا لازمی ہے۔

تاریخ کے مطالعہ کرنیوالوں کا یہ فرض ہونا چاہیئے کہ وہ اپنے دماغ مین تناسب وقت و زمانہ کا شعور و ذوق پیدا کرین، اعمال و ترقیات انسانی کو اوسی زمانہ کے حالات کے لحاظ سے دیکھین، جب وہ رونما ہوئین نہ کہ اپنے وقت کے اور اپنے گرد و پیش کے حالات سے کسی گذشتہ زمانہ کے واقعات پر نظر ڈالین۔ اسی طرح اون اسباب اور حادثات کو جو فی الحقیقت کسی نتیجہ کے پیدا کرنے مین اثر پذیر ہوئے۔ اون سے الگ کرنا ہوگا جو صرف نظر فریب تھے۔ اور اس نتیجہ کے پیدا کرنے مین اونکو کوئی دسترس نہ تھا۔

اس مختصر مضمون مین ہم اسوقت اس بحث مین نہین پڑنا چاہتے کہ آیا الفاظ "ترقیات انسانی" بامعنی الفاظ ہین۔ یا فی الحقیقت انکے کوئی معنے نہین ہین۔ بالفاظ دیگر آیا نوع انسانی بحیثیت مجموعی کسی ایک نصب العین کی طرف بڑھ رہی ہے۔ اور اگر ایسا ہے تو وہ مقصد وحید کیا ہے جسپر کسی آنے والے زمانہ مین تمام نوع انسان متحد ہو جائیگی۔ اور نہ اس بحث کو چھیڑنا چاہتے ہین کہ آیا انسان نے صرف مادی ترقی کی ہے یا روحانی اور اخلاقی بھی۔

ہمکو صرف یہ دکھانا مقصود ہے کہ نسل انسانی شروع سے اسوقت تک ایک اٹل اور غیر متغیر قانون انقلاب کے ماتحت ہے، یعنی انسان پر اوسکے حالات گرد و پیش اُسکے مقام بود و باش آب و ہوا اور دیگر حالات کا اثر پڑتا ہے۔

ہمکو معلوم ہے کہ انسان چونکہ زمین کا باشندہ ہے اسلیے اوسکے ذرائع کے اثرات اوسکی سیرت اور صحت پر گہرا اثر ڈالتے ہیں۔ جن مقامات پر انسان اپنے خورونوش کا سامان آسانی سے مہیا کر سکتا تھا۔ اونھیں مقامات پر انسان کو تہذیب و تمدن کے ابتدائی مراحل طے کرنے کی فرصت بھی ملی تھی۔ مثلاً مشرق کی سرسبز وادیان، جیسے وادی نیل، وادی دریائے گنگ فرات و دجلہ جہاں قدرت نے انسانی ضروریات کی چیزین کثرت سے مہیا کر دی تھین وہ ہی مقامات سولیزیشن کے ابتدائی گہوارہ تھے۔ اسکے برعکس مغرب کی خشک اور بنجر زمینیں جنھین قومونکا اوس زمانہ مین مسکن تھیں۔ اسی طرح شمالی قطعات ارضی ہیں جہاں قدرت اپنی پیداوار کے متعلق بخل سے کام لیتی ہے، انسان کو ماتھے کے پسینہ سے اپنا رزق پیدا کرنا پڑتا ہے۔ اسی لیے اس کوشش کا نتیجہ۔ استقلال۔ ایجادات و اختراعات و کفایت شعاری و جفاکشی ہوا کرتے ہیں،

اور پھر جب ان مقامات کی آبادی بڑھ جاتی ہے تو یہ زائد حصۂ آبادی دوسرے مقامات کی طرف نکل جاتی ہے۔ کثرت آبادی کی یہ آمد و رفت مشرقی ممالک میں نظر نہیں آتی کیونکہ یہاں انسانی ضروریات کم ہیں اور آسانی کے ساتھ ملجاتی ہیں مگر قدرت اپنی سخاوت اور فیض رسانی میں بہت ہی مخیر ہے۔

الغرض علم تاریخ ایک ایسا علم ہوگیا ہے جس سے انسان کی فراست اور دانشمندی میں اضافہ ہوکر وہ زمانہ موجودہ کے مقابلہ کے لیے بہترین طریقہ پر طیار ہوتا ہے۔ اور موجودہ مسائل کے حل کرنے میں اوسکو ایسی آسانیاں میسّر آگئی ہیں جو اس سے پہلے کبھی نہ تھیں۔ جب ایک تاریخ کا پڑھنے والا گذشتہ قوموں کے عروج و زوال اور آلام و مصائب سے واقف ہوجاتا ہے۔ تو اوسکی دماغی تربیت اوسکو اس قابل کردیتی ہے کہ فتح و شکست۔ رنج و مسرّت۔ سبب اور نتیجہ کا صحیح احساس کرسکے۔ مگر ہمارے اسکولوں میں جو تاریخ پڑھائی جاتی ہے کیا وہ ہمارے طلبا کو کسی قابل بناسکتی ہے؟

فضل الرحمان

وہ ملک خوش نصیب ہے، جسکے پاس ماضی کی کوئی تاریخ نہیں ہے۔

فرانسیسی ضرب المثل

تاریخ اکثر اپنے واقعات دہراتی رہتی ہے۔

تاریخ بنی نوع انسان کے جرائم۔ حماقت اور بدنصیبوں کی مفصل داستان ہے۔

گبن

ایک خوشگوار آیندہ شام کے بعد کی صبح اکثر افسوسناک ہوتی ہے۔

ڈکن

خوشی کے بعد رنج اور رنج کے بعد خوشی یہی دنیا کا دستور ہے۔

تامل

مسرت جوڑا پیدا ہوئی ہے۔ جب کبھی ہمکو اپنی خوشی میں دوسروں کو بھی شریک کرنا چاہیئے

برٹن

ہر زندگی کی ایک خاص مسرت ہوتی ہے اور ہر مسرت کا ایک خاص قانون بھی ہوتا ہے۔

ڈکن

اُردو ادب اور ظرافت نگاری

(از سید محمد عبدالقادر صاحب سروری - ایم - اے - ایل ایل - بی -)

(۱)

اردو ادب میں لطیف اور سادہ ظرافت کی جس کو انگریزی زبان میں "لائٹ ہیومر" Light Humour کہتے ہیں بڑی کمی ہے۔ اُردو زبان میں ایک مخصوص طرز تحریر اور فن کی حیثیت سے ظرافت کبھی رائج نہ ہوسکی ادب لطیف کے نام سے جو چیز آج تک پیش ہو رہی ہے وہ درحقیقت اصلیت سے بہت دور ہے۔ جن خیالات کا ان میں اظہار ہوتا ہے ان کو زیادہ سے زیادہ تخیلات کہنا زیادہ موزوں ہوگا۔ کیونکہ عملی زندگی سے ان کو کسی قسم کا تعلق نظر نہیں آتا۔ حالانکہ ادبیات کا کوئی شعبہ بھی حیات انسانی سے اس قدر بے تعلق نہونا چاہیئے جیسا کہ ہمارے یہاں تصور کرلیا گیا ہے۔

اس لطیف صنف ادب کی تخلیق کے لئے اردو زبان کی پیدائش کا زمانہ موزوں نہیں ہوسکتا تھا کیونکہ ہر زبان میں یہ زمانہ ابتدائی خیالات کا ہوا کرتا ہے۔ لیکن اس کے گذر جانے کے بعد بھی ہر شعبۂ ادب میں نمایاں ترقی کے آثار نمودار ہونے کے باوجود اس فن اور اس قسم کی تحریروں کی طرف زیادہ توجہ نہیں دی گئی۔

ظریفانہ ادب کی پیدائش محض اس غرض سے نہیں ہوتی کہ لوگ اسکو پڑھکر مسرور ہولیں اور بس۔ اور اس کے بعد اس کے اثرات دلوں سے اس طرح مٹ جائیں گویا کچھ سنا ہی نہ تھا۔ ایسا سمجھ لینا غلطی ہے اعلیٰ ظریفانہ تحریریں ہر زبان میں وہی رتبہ حاصل کرلیتی ہیں جو اسکی شاعری یا افسانوں کو حاصل ہے۔ یہ بڑی حد تک ادب اور زبان کی خدمت بھی کرتی ہیں۔ لیکن ادنیٰ قسم کا مذاق ادبیات کے لئے باعث ننگ ہوتا ہے۔ اگر کسی زبان کے ادب کو ہم ایک جسم سے تشبیہ دے سکیں تو اس کی سادہ ظریفانہ تحریریں اس کی روح رواں کہلانے کی مستحق ہیں جن سے ادب میں لطافت اور زندگی کی ایک لہر پیدا ہوجاتی ہے۔ اس سے بڑھکر یہ کہ اس

قسم کی تحریریں بڑی حد تک ملک اور قوم کے مجموعی تمدن و معاشرت کی اصلاح کرنے میں مدد دیتی ہیں۔ بلکہ عموماً ان کا وجود بھی اسی وقت ہوتا ہے جب کسی احساس والے کی نظروں میں قوم کی زندگی کا کوئی نہ کوئی پہلو کھٹک جاتا ہے اور اون کی مذمت لوگوں کے دل نشین کرنے کی غرض سے تخریبی نہیں بلکہ تعمیری پالیسی کے ساتھ اس کو ایک ہلکے ظریفانہ رنگ میں اس طرح پیش کرتا ہے کہ لوگ اس کو پڑھکر ہنستے ہیں اور اُسے بُرا بھی سمجھنے لگتے ہیں۔ اور ساتھ ہی ساتھ جس چیز کی ہنسی اڑائی گئی ہے اُس سے کنارہ کشی بھی اختیار کرتے جاتے ہیں۔ اس طرز تحریر میں دلآزاری۔ تعصب یا نفرت کا اظہار نہ ہونا چاہیئے۔ اڈیسن نے اسی طرح کی تحریروں سے انگریزوں کی بہت سی چھوٹی چھوٹی خامیوں کو دُور کرنے میں نمایاں کامیابی حاصل کی تھی۔

یہ ممکن ہے کہ کوئی نظام اصلاح نہایت سنجیدگی کے ساتھ پیش کیا جائے لیکن تجربہ شاہد ہے کہ اس سے کچھ بنتا بگڑتا نہیں، اول تو عام لوگ ہر سنجیدہ مضمون کو دلچسپی سے پڑھنے کی زحمت ہی گوارا نہیں کرسکتے اور اگر پڑھ بھی لیتے ہیں تو لکھنے والے کے خیالات اُن کے دماغوں میں باقی نہیں رہ سکتے۔ اسی لئے قوم کی خامکاریوں، اُس کی بیہودہ رسومات اور فضول رواجات اور دوسرے معاشرتی اور سیاسی برائیوں کو عام لوگوں کے سامنے اُبھار کر دکھانے کا ایک اچھا ذریعہ یہ بھی سمجھا گیا ہے کہ ان امور کو ظریفانہ رنگ میں پیش کیا جائے۔ یہ چیز شکر لپٹی ہوئی کونین ہے۔

دنیا میں بہت کم لوگ ایسے ہونگے جو عمدہ مذاق سے لطف اندوز نہ ہوتے ہوں۔ لیکن اعلیٰ پایہ کی ظریفانہ تحریریں اس شخص کے لئے جس کی زندگی کی مصروف ساعتوں میں سے بہت کم وقت سیر و تفریح کے لئے نکل سکتا ہو "زندگی کا وقفہ" ہوتی ہیں۔ اور اسے "دم لیکر آگے چلنے پر مستعد" بنا دیتی ہیں۔

(۲)

اردو میں اسکاٹ[1]۔ جانسن۔ کارلائل اور برک تو مل سکتے ہیں۔ لیکن سولفٹ، اڈیسن اور والٹیر کا ملنا مشکل ہے۔ اس کی وجہ شاید یہ ہو کہ اُردو ادب کو اس طرف توجہ کرنے کی مہلت ہی نہیں ملی۔ قدیم اخلاقی تعلیمات نے اسلاف کے مزاجوں کو اس قدر سنجیدہ اور وضعدار بنا دیا تھا کہ ان کے نزدیک ہر قسم کی ظرافت، چھچھورپن اور بیجا تمسخر کی مترادف تھی، اور اسی لئے وہ اسے نہایت ذلیل سمجھتے تھے۔ میر تقی میرؔ نے آخر ایک دن جرأت کے پوچھنے پر کہہ ہی دیا تھا کہ ان کی شاعری "چوما چاٹی" سے زیادہ

[1] انگریزی زبان کے مشہور مصنفوں اور انشاپردازوں کے نام ہیں۔

وقعت نہیں رکھتی۔ اگر رنگین۔ انشا۔ جان صاحب وغیرہ اُن کے پاس جاتے تو ضرور بھانڈ کے خطاب سے سرفراز ہوتے۔ میر تقی میر گویا اپنے زمانے کے سنجیدہ طبقہ کی نمایندگی کر رہے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ایسی فضا کے درمیان لطیف اور ظریف تحریروں کے میدان میں اتر کر کون ہدفِ ملامت بننا گوارا کر سکتا تھا۔ اِس میدان میں اُترنے والے کے لئے اپنی حیاتِ ادبی کو خطرہ میں ڈالنے کا اندیشہ تھا پھر کسی کو ایسی غیر معمولی جرأت کرنے کی ضرورت ہی کیا تھی؟

(۳)

اس میں شک نہیں کہ ظرافت سے مسرور ہونا انسان کی سرشت میں داخل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ تمام مشکلات کے باوجود کہیں کہیں اردو ادب میں بھی اس جذبہ کے آثار اور علامتیں نظر آجاتی ہیں اور اس کا اظہار مختلف مقامات میں مختلف صورتوں میں ہمارے سامنے پیش ہوتا ہے۔ کہیں اسکی نوعیت محض تمسخر اور کہیں استہزا اور دل آزاری کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔ چنانچہ اردو شاعری کی ہجویات اس کی عمدہ مثال ہیں۔

سودا قصیدے کی طرح ہجو کے بھی بادشاہ تھے۔ جب کبھی کسی سے ناراض ہو جاتے یا اُن کو کوئی چھیڑ دیتا تو فوراً مقابل پر برس پڑتے۔ غصہ میں انسان اپنے آپے سے باہر ہو جاتا ہے، یہ بھی بھلے اور بُرے کی تمیز ہی اُٹھا دیتے تھے حتیٰ کہ خوش کلامی پر بھی اُتر آتے تھے۔ اول تو ہجو خود ہی ایک دل آزار اور گندی چیز ہے، اُس پر گالیاں خدا کی پناہ!

میر نے بھی اپنے زمانے کی پیروی کی، لیکن ان کے سنجیدہ مذاق نے انھیں اکثر روک تھام کی بندشوں میں رکھا۔ ان کی ہجوئیں زیادہ تر ایسی ہیں جو اپنے گھر کے کتے بلی یا خود اپنے مکان وغیرہ پر لکھی گئی ہیں۔ ستانے والے پر وہ بھی بُری طرح برستے تھے[1]۔ تاہم سودا کی طرح گالی گلوچ سے اپنی زبان گندی نکرتے تھے۔ بہرحال زمانے کے اقتضا نے ان کو بھی ہجو نگاری سے پیچھا چھڑانے نہیں دیا۔

سودا اور میر کے معاصرین میں ہر ایک کی یہی حالت تھی، صرف ذاتی شرافت اور دنائت کے لحاظ سے مدارج میں فرق پڑ گیا ہے۔ ہجو نگاری اس زمانے کی ضروریات میں داخل ہو گئی تھی۔ اور ہر صنفِ نظم کی طرح اس پر بھی طبع آزمائی ضروری سمجھی جاتی تھی۔ اگر کوئی اور نہ مل سکے تو خود اپنے گھر ہی کی بُرائی میں سہی۔ لیکن کلیات میں ہجو کے نمونوں کا ہونا ضروری تھا۔ غرض قدما کے پاس اس صنفِ ادب

---

[1] ملاحظہ ہو "مثنوی در ہجو اکول"

میں جو کچھ ہے وہ ہجویں ہیں، جن کا غور سے مطالعہ کیا جائے تو اُن میں بعض بعض ٹکڑے ایسے بھی دستیاب ہو سکیں گے جو اگلے زمانے کی ظرافت کے نمونے کہے جا سکتے ہیں۔ مثال کے طور پر ہم یہاں سودا کی اس نظم کی طرف اشارہ کرتے ہیں جس میں وہ جنگ میں شریک ہونے سے سپاہیوں کا پس و پیش بیان کرتے ہیں۔ یہ اشعار درحقیقت اُن کے زمانہ کی فوج، سپاہیانہ زندگی اور جنگ کے بہترین نقشے کہلا سکتے ہیں۔ گھوڑے کی ہجو کے چند شعر یہاں نقل کئے جاتے ہیں۔

.....؟ گھوڑا کہیں ہے ایک۔ سو اتنا خراب و خوار
نہ دانہ و نہ کاہ نہ تیمار نہ سئیس، رکھتا ہو جیسے "اسپ گلی" طفل شیر خوار

قصاب پوچھتا ہے مجھے کب کرو گے یاد امیدوار ہم بھی ہیں، کہتے ہیں یوں چمار

دیکھے ہے جب وہ توبڑہ و تھان کی طرف کھودے ہے اپنے سم سے کنوئیں ٹاپیں مار مار

مانند اسپ خانۂ شطرنج اپنے پاؤں جز دست غیر کے نہیں چلتا ہے زینہار

اک دن گیا تھا مانگنے یہ گھوڑا برات میں دولھا جو بیاہنے کو چلا اُس پہ ہو سوار
سبزے سے خط سیاہ۔ سیاہ سے ہوا سفید تھا سرو سا جو قد سو ہوا شاخ بار دار
پہونچا غرض عروس کے گھر تک وہ "نوجواں" شیخوخیت کے درجے سے کر اس طرف گذار

جس شکل سے سوار تھا اس دن میں کیا کہوں دشمن کو بھی خدا نکرے یوں ذلیل و خوار
چابک تھے دونوں ہاتھ میں، پکڑے تھا منہ بہ منہ تک تک سے باشنہ کے مرے پاؤں تھے فگار
آگے سے توبڑہ اسے دکھلائے تھا ئیس پیچھے نقیب ہانکے تھا لاٹھی سے مار مار
..... اکثر مدبروں میں سے کہتے تھے یہ پکار
پہیئے اسے لگاؤ کہ تا ہووے یہ رواں یا بادبان باندھ۔ پون کے دو اختیار

گھوڑا تھا بسکہ لاغر و لسپت و ضعیف و خشک کرتا تھا یوں خفیف مجھے وقتِ کارزار
جاتا تھا جب پٹ کے میں اس کو حریف پر دوڑوں تھا اپنے پاؤں سے جوں طفل نو سوار

اسی طرح میر کی ہجو یہ نظم جو ایک "پُرخور" کے لئے لکھی گئی ہے۔ خاص طور سے قابل ملاحظہ ہے۔ اس کے شکم کی تعریف ان الفاظ میں کی گئی ہے۔ "صد منی دیگ ہے شکم اس کا" اور

"تو ندکا لی جو کھول جاوے لیٹ آہنی ہے تنور اُس کا پیٹ"

اس کے بعد اُس کے موٹاپے کے متعلق چند شعر لکھے ہیں، اور اس کا نقشہ دکھایا ہے کہ جب وہ بازار میں نکلتا تھا تو "بازاریوں" کی حالت اس کے ڈر سے کس قدر ابتر ہو جاتی تھی۔ سب لوگوں کی یہ حالت تھی کہ ہر ایک

کرتے ہیں سودوں کی خبرداری
کنجڑے ڈھانکے ہیں ساگ پات اپنا تکے ہے بنئے داؤ گھات اپنا
کہ مبادا ادھر کو آجاوے سودے یکسو، ہمیں نہ کھا جاوے

اینٹ پتھر بھی کھا گذر جاوے الغرض پیٹ اپنا بھر جاوے

یہ شخص ایک روز میر صاحب کا مہمان ہوا۔ دسترخوان پر اُس کی حالت ملاحظہ ہو:۔

چار من کا جو واں کا قلیہ تھا "دہ منی دیگ" بیچ دلیا تھا
روٹیاں کس قدر؟ بتاؤں میں جس کو دو چار سال کھاؤں میں
تھی ابھی روٹیوں کی چیٹ کی چیٹ میں رہا کہتا کھا گیا وہ سمیٹ
کھانا کوئی اور کیا کہے اُس کا سارے منہ دیکھتے رہے اس کا

جب مرے گا وہ پیٹ کا بھوگی روح توشہ کی روٹی میں ہوگی
کھانے کی بو جو ناک میں بیٹھے مرگیا ہوئے تو بھی اُٹھ بیٹھے
عقل بابر اگرچہ کرتی نہیں وہ مرے بھوک اسکی مرتی نہیں
بھوکا اس کا جو جی نکل جاوے گور میں بھی کفن نگل جاوے

غرض ڈھونڈنے سے ابھی بہت سی مثالیں اور بھی ملیں گی۔ یہ سرسری نظر میں انتخاب کرکے پیش

کی گئی ہیں۔

(۴)

رنگین۔ جرأت۔ انشا اور جان صاحب نے تو زٹلیات کی اُدھم مچادی۔ ان سب میں انشا کی طبیعت زیادہ صلاحیت پسند نظر آتی ہے۔ لیکن کچھ تو طبیعت کی شدت اور بگڑے ماحول نے انکی تحریروں کو انتہائیت کے مذموم نقطہ تک پہونچا دیا۔ اور کچھ روشن خیال طبقہ کی بے توجہی نے ان زباندانوں کے اس خاص ملکہ کو راہ راست پر لانے میں کوتاہی کی۔ جس طرح غالب کے معاصرین نے اُن کی مشکل گوئی کی عادت ان سے چھڑائی اور اُن کو صحیح راستہ پر لے آئے۔ اسی طرح اگر سنجیدہ طبیعتیں انشا وغیرہ کو بھی راہِ راست پر لانا چاہتیں اور اس کے لئے کچھ کوشش کرتیں تو کیا تعجب تھا کہ وہ ایک بہتر ادب کی تخلیق کر سکتے۔ بہرحال اس کو قسمت کی ستم ظریفی سمجھنا چاہیئے کہ جو چیز انشا کی ہر فن قابلیت کے لئے ایک بدنما داغ بن رہی ہے وہی درحقیقت اُن کی اصلی متاع اور وہی ان کا خاص جوہر تھا۔ جرأت، انشا وغیرہ کی انتہا پسندی نے ان کے پیرو شعرا کو اس درجہ سے بھی نیچے گرا دیا جس پر یہ خود تھے اسی لئے اُردو ادبیات میں "زٹلیاٹ" کا خاصہ لٹریچر پیدا ہوگیا۔

ملکی فارغ البالی اور خوش حالی کا زمانہ عموماً لطیف ادب کی پیدائش کا زمانہ ہوا کرتا ہے۔ اس دور کے اچھی یا بُری طرح گذر جانے کے بعد فطری رفتار کے ساتھ ادب کے اس شعبہ میں پھر ترقی کا ہونا ایک دشوار امر ہوجاتا ہے۔ اردو ادب میں دہلی کے قلعۂ معلی کے آسودہ حال دور اور اس کے بعد لکھنؤ کے "لکھ لٹ" نواب کی بخششوں کے زمانے کے بعد سے پھر شاعری کا وہ رنگ جم ہی نہ سکا۔ نہ اہل فن ایک جا جمع ہوسکے، اور نہ شاعری کے وہ چرچے قائم ہوسکے۔ ان صحبتوں کے ختم ہوتے ہوتے خود فارغ البالی کا زمانہ بھی ختم ہوگیا۔ لکھنؤ سے بھاگ کر کچھ اہل علم وفن رامپور میں جمع ہوئے۔ اور انھیں کا باقی ماندہ حصہ حیدرآباد میں بھی آرہا۔ جہاں ان کے حوصلہ سے زیادہ ان کی قدر کی گئی، لیکن اگلے نقشے پھر نہ جم سکے۔

قدیم شاعری کے چند آخری نمونے جو غالب۔ ذوق اور مومن کی شکل میں باقی رہ گئے تھے اُن میں غالب خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ ان کی سرشت میں ایک اعلیٰ ظرافت مضمر تھی۔ اُردو نظم اور خصوصاً غزل جذبات اور احساسات کی بعینہٖ نقل اتارنے کا کبھی ذریعہ نہ بن سکی۔ اسی لئے غالب کی شاعری سے ان کے اس خاص ولولہ کا بہت کم پتہ چلتا ہے۔ البتہ ان کے خطوط (جن

کے فطری طریقہ پر لکھے جانے کے وہ حامی تھے) ان کی طبیعت کے بڑے اچھے مظہر ہیں۔ سب سے بڑھکر یہ کہ اس "حیوان ظریف" کے سوانح نگار حالی کے قلم نے بہت سے سنجیدہ ظرافت کے نمونے اسکی "یادگار" میں جمع کر دیئے ہیں۔ ذوق کی سنجیدہ طبیعت اور ان کا علم وفضل اور اسی طرح مومن کا حد سے بڑھا ہوا احساس خودداری، اُن کے اس جذبہ کے اظہار کا مانع تھا۔ حالی اور آزاد میں اول الذکر نے قوم اور اس کی اصلاح کا بیڑا اٹھایا، رہے آزاد ان کی شاعری بیحد محدود ہے۔ اسلئے ہماری بحث سے خارج۔ لیکن ان کے نثر کے کارناموں میں "آبحیات" ایک خاص ظریفانہ اسلوب بیان کا نمونہ ہے۔ جو آزاد ہی کا پیدا کردہ تھا۔ اور آزاد پر ہی ختم ہوگیا۔ نثر نگاروں کی پوری فہرست یہاں پیش کرنا اس لئے منظور نہیں کہ ان میں ہمارے مقصد کے اندر بہت کم نظر آتے ہیں۔

(۵)

اس سرسری نظر بازگشت سے اس امر کا کم از کم اندازہ ہوگیا ہوگا کہ سادہ ظرافت کی اُردو زبان میں کس قدر کمی ہے۔ اور کیا اسباب اس کے ایک فن کے طور پر رائج ہونے کے مانع رہے اُردو ادب میں جو کچھ ظرافت کی سرحد میں آسکتا ہے وہ سب کچھ کہلا سکتا ہے، لیکن اس کو سادہ ظرافت نہیں کہہ سکتے۔ کیونکہ ان تمام نمونوں میں قوم کے کردار پر کوئی بھی براہ راست اثر انداز نہیں ہوتا۔

زمانۂ حال کے شعرا میں اکبر الہ آبادی ہی ایسے شاعر ہیں جو ہمارے معیار پر ٹھیک اترتے ہیں۔ انھوں نے شعر کو ظریفانہ لباس پہنایا، اس کا صحیح مخاطب ہندوستان کے مسلمانوں کو بنایا۔ اشعار کی شکل وشمائل ایسی بنائی کہ ہر شخص ان کو پڑھتا ہے اور یہ جاننے کے باوجود کہ اس کے اندر جو لطیف حملہ ہے اس کا وہ خود ہی مخاطب ہے اس سے خوش ہوتا ہے۔ حالی نے بھی قوم کی اصلاح کرنی چاہی لیکن جو کام حالی قوم کو رُلا رُلا کر لینا چاہتے تھے اکبر نے وہی کام اُسے ہنسا ہنسا کر لیا۔ مقصد دونوں کا ایک تھا لیکن وسائل میں فرق ملاحظہ ہو!

حال کے نثر نگاروں میں لکھنؤ میں منشی سجاد حسین صاحب نے ایک باضابطہ ادارہ قائم کرکے اودھ پنچ میں سیاسی و معاشرتی مسائل پر ظریفانہ انداز میں تنقید و تعریض کا نہایت دلچسپ سلسلہ قائم کر دیا ہے۔

موجودہ اہل قلم میں ملا زموزی، مرحوم عظمت اللہ خاں، مسٹر "پطرس" رشید احمد صدیقی اور مرزا فرحت اللہ بیگ قابل ذکر اصحاب ہیں۔ ملا زموزی کی تحریروں میں ایک خاص بے تکلفی ہوتی ہے

مشرقی ادب پر واقعۂ کربلا کا اثر

ایک بڑے ادیب صوفی اور شاعر کا قول ہے کہ "دنیا خود ایک شاعر ہے" غور کیا جائے تو یہ فقرہ ادب شاعری کی روح ہے۔ دنیا کے ہر ذرہ میں لاکھوں شاعرانہ خیال جگمگا رہے ہیں اسکا ہر منظر ادب پرور اور ہر واقعہ نظم آفرین ہے۔ "بس جہان شاعر بود چون دیگران"

جو مضمون کسی شاعر یا ادیب کے حجلۂ دماغ سے بن سنور کر نکلتا ہے۔ اسکا مخزن دو مواخذ دو میں سے ایک چیز ہوتا ہے۔ یا تو دنیا کے کسی مناظر یا واقعہ سے وہ خیال لیا گیا ہے جسکا تعلق ظاہری پانچ حواس سے ہے یا ذہن و ذکا، دلی جذبات و احساسات اور مناظر وغیرہ سے متاثر ہونے والی تخیل کی مدد سے کوئی خیالی تصویر اتاری گئی ہے۔

دنیا کے مناظر سے بہت سی تشبیہات اور استعارے وغیرہ پیدا کئے گئے، جو موقع اور محل سے اور مضامین کے ساتھ ملاکر شمشیر تخیل پر صیقل کے کام آئے اور کبھی تشبیہات وغیرہ سے مضامین پیدا کئے گئے مثلاً زمانہ کی نیرنگیوں کو معشوق کی طبیعت سے ملتا جلتا دیکھکر شاعر نے عاشق کی زبان سے کہلوا دیا کہ

گشتہ ہم بھی تری نیرنگی کے ہیں یار رہے — اور زمانہ کی طرح رنگ بدلنے والے

شبنم کے قطروں سے آنسو بنائے اور پھولوں کے کھلنے سے تبسم پیدا کرکے آتش نے یہ شعر لکھا۔

ہنستے ہیں گل کی طرح اہل جہان کیا آتش — مثل شبنم گئے اس باغ سے مہمان رو کر

شب ہجر میں چاند دیکھکر تنا ہوئی کہ

کبھی وہ چاند کا ٹکڑا ادھر بھی آنکلے — ذرا تو دیکھ منجم مرے ستارے دن

عالم وحشت میں دریا و صحرا جدھر نظر گئی اک شور اٹھا۔

ہمارے دیدہ و دل کا تماشا دیکھتے جاؤ — وہ دریا دیکھتے جاؤ یہ صحرا دیکھتے جاؤ

دشت و باغ میں جانکلے تو یہ کہتے ہوئے گھر آئے۔

یکے بر لالہ پا کوبد کہ ہے رنگ مے دارد
یکے از گل بوئے جد آید کہ وہ وہ بوئے یار آید

ذہنی واندرونی جذبات واحساسات وقوت متخیلہ سے بھی مضامین پیدا ہوتے اور تشبیہ واستعارہ سے چمکائے جاتے ہین شاعر کا خیال ایک ایسا خاموش اور سریع السیر سیّاح اور جاسوس ہوتا ہے جو اسیطرح (جیسے شہد کی مکھی باغون اور جنگلون کے پھول پھول اور پتی پتی سے رس لاکر شہد تیار کرتی ہے) مناظر قدرت اور ذی روح یا غیر ذی روح کی اندرونی کیفیات وغیرہ کے جوہر اوڑا لاتا ہے اور اسکو اسطرح سنوار کر منظر عام پر لاتا ہے کہ دیکھنے والے سر دھنتے ہین۔ خیال کبھی ایک تصویر خیالی کے آراستہ کرنے مین بال سے باریک راہون سے اسقدر جلدی جلدی گزرتا ہے کہ خود شاعر اسکی چلی ہوئی راہون کو بھولتا جاتا ہے اور اسکو یاد نہین رہتا کہ کہان سے کیا سامان فراہم کرکے اس نے اپنے خیالات کی زندہ جاوید تصویر تیار کی ہے۔ کبھی کسی بات یا صورت کا نقش واثر حافظہ مین محفوظ رہ جاتا ہے اور شاعر یہ بھول جاتا ہے کہ وہ اثر کہان سے پیدا ہوا اور نظم کے وقت بلا علم واطلاع اس محفوظ ذخیرے سے غیبی مدد ملتی ہے۔ یہ شاعری کا معنوی ماخذ ہے۔

یہ دو صورتین ہین جو ادب کی کائنات کی چلتی پھرتی تصویرین ہین۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ واقعہ کربلا نے ادب وشاعری کو اپنے فیض روحانی سے ان دو صورتون کے پردہ مین کیا فائدہ پہونچایا۔

پہلی صورت کا جلوہ دیکھنا ہو تو غزلون مین تشبیہ واستعارہ کے طور پر کربلا اور اسکے تحت مین اکثر واقعات متعلقہ کو دیکھئے جس سے ظاہر ہوگا کہ واقعہ کربلا اور لفظ کربلا کو خود ادب مین تشبیہات واستعارات کے طور پر کئی کئی عنوان سے استعمال کیا گیا ہے۔ مثلاً کربلا کے مہمانون پر کئی روز آب ودانہ بند تھا۔ جانور اور وحش وطیور دریا سے پانی پیتے تھے مگر غریب الوطن فدائیان حق (جنمین چھ مہینہ کا بچہ بھی تھا۔) پانی ایسے قدرت کے عام چشمۂ فیض سے محروم رہے۔ اس خیال کو غزل مین بطور تشبیہ کے ایک شاعر نے اسطرح نظم کیا ہے کہ اس سے زیادہ اثر اور زور پیدا کرنے والی تشبیہ خیال مین نہین آسکتی۔

قفس مین بند ہین ہم، ہم پہ آب ودانہ بند
یہ گھر ترا ہے کہ صحرائے کربلا صیاد

میدان کربلا کے کشت وخون کے خیال سے اشعار ذیل لکھے گئے ہین۔

(سودا) انعام نامہ برسہے وان درجۂ شہادت — تیری گلی ستمگر صحرائے کربلا ہے
(ضاحک) گیا نہ زندہ پھرا کوئے یار سے کوئی — گلی صنم کی عزیزو یہ کربلا ٹھہری
ان کا کوچہ ہے زمین کربلا — جو گیا اس کی شہادت ہوگئی
ترے کوچہ مین لاکھون بیگنہ مارے گئے قاتل — جسے سمجھے تھے کعبہ کربلا کی وہ زمین نکلی
(غنی) خام گویان بسکہ می سازند معنی ہا شہید — شد زمین شعر آخر چون زمین کربلا

(حافظ) انچہ جان عاشقان از دستِ ہجرت می کند کس ندیدہ در جہان جز کشتگانِ کربلا

کشتون کے خون سے زمین کربلا لالہ زار ہوگئی تھی عرفی نے اسی کیفیت کو قلمبند فرمایا ہے۔

(عرفی) در چمنہائے محبت ہر قدم چون کربلا از نسیم عشوہ فرشِ ارغوان انداختہ

ایک اردو شاعر نے بے گور و کفن کشتگان کربلا کی یاد کرکے یہ شعر لکھا ہے کہ

کہین تھے کشتگانِ کربلائے عشق کے لاشے بگولون نے بھی اٹھ اٹھ کر نہ میت جنکی کفنائی

سرزمین کربلا مین اور بھی واقعات غم پیش آئے ہین چنانچہ اثر کا یہ شعر اسی خیال کو ظاہر کر رہا ہے۔

(اثر) دل ستم زدہ بھی کربلا کا مقتل ہے کبھی بلاؤن سے خالی یہ سرزمین نہ رہی

اسی طرح صدہا تشبیہات اور استعارات کی مثالین دیجا سکتی ہین لیکن یہان پر بخوف طوالت قطع نظر کیجاتی ہین۔ عربی کی صرف ایک اور مثال لکھی جاتی ہے جو کتاب دروس البلاغت مولفہ خفنی ناصف محمد دیاب سلطان محمد مصطفےٰ سے لی گئی ہے۔

يَا سَيِّدًا هَازَ لُطَفَّالُهُ الْبَرَايَا عَبِيدُ

(ترجمہ) اے وہ سردار جو جامع الطاف ہے اور اُسکے غلام تمام مخلوقات

اَنْتَ الْحُسَيْنُ وَلٰكِنْ جَفَاكَ فِينَا يَزِيدُ

(ترجمہ) تم حسین ہو لیکن تمہارا ظلم میرے باب مین زیادہ ہوتا جاتا ہے

(دوسرے معنی) تم حسینؑ ہو لیکن تمہارا ظلم ہمارے باب مین یزید ہے

واقعات کربلا سے پیدا ہونے والی تشبیہہ و استعارہ کی بھی بہت سی مثالین موجود ہین مثلاً اہل حرم اور فرزند حسین کو جن کو بیمار کربلا۔ عابد بیمار وغیرہ لقب سے یاد کیا گیا ہے۔ اسیر کرکے پُرخار راہون سے دربار شام اور پھر زندان مین لانے کے واقعہ کیطرف شعرین اشارہ ہے۔

پھنس گیا دل گیسوؤن کے دام مین ہائے سیدؑ کی اسیری شام مین

چنانچہ یہی واقعات اس شعر کا بھی ماخذ ہین۔

کبھی ہین قیدی گلچین کبھی سرِ بازار برنگِ آلِ نبی کھا رہے ہین چکر پھول

اسی طرح اشعار ذیل مین بھی انھین واقعات و حادثات کی طرف اشارہ ہے۔

ہین عید بھی ہے محرم کا عشرہ گلے غیر کو وہ لگائے ہوئے ہین

دل ایسے شوخ کو مومن نے دیدیا کہ وہ ہے محبِّ حسینؑ کا دل رکھے ہے شمر کا سا

در کھلا جب کربلائے عشق کا اہل دل کرتے ہوئے ماتم گئے

---

* یہ رسم اور مضارع دونون ہے۔

دل ہے روانہ گیسوئے جانان کے شوق مین — مرد غریب راہرو ملکِ شام ہے
اُٹھ گیا کون کہ ہے گھر مرا ماتم خانہ — اور سیہ پوش ہے یہ سایۂ دیوار جُدا
مردمِ دیدہ تر اور رو کے جب کرتے تھے ذکر — اشک جو تھا دانۂ تسبیح خاک پاک تھا
اسلئے شیشہ مین رکھا تھا حفاظت سے اسے — چاہنے والے کی یہ خاک ہے برباد نہو

(خسرو) بر در بے نیاز یت صد چو حسینؑ کربلا — تشنہ باند و رگزرتا بہ زلال کے رسد
روتی ہین آرزوئین ماتم ہے حسرتون مین — آجاؤ تم بھی دلمین بزمِ عزا سمجھکر
(غالب) بزم تراشمع و گل خنگی بوتراب — سازترا زیر و بم واقعۂ کربلا

اِس طرح مضامین کا اچھا خاصا ذخیرہ اہلِ ادب کو ہاتھ آگیا ہے۔ اگر واقعہ کربلا نہ ہوتا تو خاکِ کربلا سے تسبیح نہ بنتی اور مٹی کی تسبیح نہ ہوتی تو غزل مین یہ تخیل اور مضمون جو ذیل کے اس شعر مین ہے پیدا ہونے کا کیا امکان تھا۔

خاک اپنی سبحۂ بنگئ دستِ یار مین — شکر خدا کہ ہم بھی اب آئے شمار مین

قیامت کے دن حسینؑ مظلوم اپنے شش ماہہ بچہ کی لاش کو اپنے ہی ہاتھون پر لیکر محشر مین انصاف کے لیئے تشریف لائینگے۔ عزیز لکھنوی کے اس شعر مین اسی مضمون کیطرف اشارہ ہے۔

جب لاؤن گا ہاتھون پہ دل مردہ کی میت — کیا شور سر عرصۂ محشر نہ اُٹھے گا

کربلا کی یاد مین اب تک راہون مین پیاسون کے لیے ایام عزا وغیرہ مین سبیل رکھی جاتی ہے۔ چنانچہ ایک شاعر کا شعر ہے۔

بھائیؑ تشنگان دشت الفت پیاس مقتل مین — سبیل اک فی سبیل اللہ رکھدو آبِ خنجر مین

ماتداری وسینہ کوبی کرتے ہوئے علم لیجاتے ہین اس منظر سے متاثر ہوکر مومن مرحوم نے فرمایا ہے۔

سینہ کوبی سے زمین ساری ہلا کے اُٹھے — کیا علم دھوم سے تیرے شہدا کے اُٹھے

اسی طرح اشعار ذیل کے مضامین اور تخیل کا ماخذ بھی کربلا کے واقعات ورسوم ہین۔

(عرفی) دفنا را یاد گیر از دوست کز ماتم سیہ سازد — لباس کعبہ در مرگ شہیدان بیابانش
وہ دیار حسن کے آستان وہ علاج درد کہ الامان — وہی سر ہمیشہ قلم ہوئے جو جھکے تھی سجود نیاز مین
قاتل سے پوچھ داور محشر یہ کون ہے — قبرون سے نکلے ہاتھون پہ جو سر لیے ہوئے
روتی ہین آرزوئین ماتم ہے حسرتون مین — آجاؤ تم بھی دلمین بزمِ عزا سمجھکر
بنا کردند خوش رسمے بخاک و خون غلطیدن — خدا رحمے دہد ایں کشتگانِ پاک طینت را

زخون رزنہ کند شیخ نہی گرداند — کہ خون حرّ متیان را نخست کرد مباح

(سودا) شمشیر جون ہلال محرم ہے اسکے ہاتھ — شیون وہی کہ جسکے ہر ایک گھر مین ہے

تا سوم بال جو قاتل نے پریشان رکھے — ہوئی کاشانۂ گیسو مین عزادارئ دل

چون بگذرد نظیری خونین کفن بحشر — خلقے فغان کنند کہ این داد خواہ کیست

قتل گاہ ناز کی صبر آزمائی کیا کہین — دسکے ٹکڑون کو تڑپتے خاک پر دیکھا کئے

غم نہین لائی جو غربت مین شہادت مجکو — خون سے دامن صحرا تو گلستان ہوجائے

جسمین کبھی بندھے تھے سودا بیان الفت — اب تک نشان لہو کے اس ریسمان پر ہین

جو کر سکتے ہین وہ منت کش بیداد کرتے ہین — لہو مین ڈوب کر شکریہ جلاد کرتے ہین

زمانہ ہوگیا باغ محبت کی تباہی کو — ابھی تک ہین وہی گلکاریان خون شہیدانی

نظم کے علاوہ نثر مین بھی جا بجا واقعہ کربلا کی گلکاریان نظر آرہی ہین مثلاً پنجرقعہ کی عبارت درج کی جاتی ہے۔

" شہید تبسّم دیت عشوہ خونہا، مقتول رنگین مطلب شیرین مدعا، نخل تابوت بستہ کوے بوالہوسی و گل تمنّا پخیدہ گلشن مدعا رسی۔ مائی شہید گلگون کفن اشک ارغوان بستر نوحہ گر حلقۂ مصیبت قتیل خونین پیرہن لخت جگر سبل تفتہ جگر کربلائے بلا۔ تشنہ لب در آب فرات چشم آشنا ..... الخ

کربلا کے علاوہ بہت سے دیگر واقعات بھی مشرقی ادب مین تلمیحات کی شان سے مختلف رنگ و روپ مین آگئے ہین۔

ممتاز حسین جونپوری

علامہ اقبال اور زمانہ

علامہ اقبال بھی زمانہ کے اولین قلمی معاون ہین۔ آپ کا مشہور و معروف قومی ترانہ۔ سارے جہان سے اچھا ہندوستان ہمارا" سب سے پہلے رسالہ زمانہ مین ستمبر ۱۹۰۴ء کے پرچہ مین شائع ہوا تھا اسکے بعد بھی وقتاً فوقتاً آپ کی قلمی عنایات کا سلسلہ جاری رہا چنانچہ ۱۹۲۵ء مین زمانہ کا جو قومی نمبر شائع ہوا تھا اسکے لیے آپ نے یہ شعر خاص طور پر عنایت فرمایا تھا۔

نہ کنم دگر نگاہے بہ رہے کہ طے نمودم — بسراغ صبح فردا روش زمانہ دارم

یورپین شعرائے اردو

(از سید محمد حفیظ صاحب بی۔ اے۔ ایل۔ ٹی۔ لکچرار الہ آباد یونیورسٹی)

اُردو کی ابتدائی نشو ونما میں بعض یورپین اصحاب نے بھی حصہ لیا ہے۔ گرچہ اضافہ انھوں نے کیا ہو وہ بلحاظ نوعیت بالکل مختلف ہے۔ یہ یورپین حضرات جنھوں نے اردو شعر وسخن سے دلچسپی لی یا اس میدان میں طبع آزمائی کی۔ اپنے کو غیر ملکی یا اجنبی تصور نہیں کرتے تھے۔ بلکہ ہندوستان کو اپنا گھر بنا لیا تھا اور ہندوستانی اسپرٹ کو پوری طرح جذب کر لیا تھا وہ ہو بہو ہندوستانیوں کی طرح لکھتے تھے۔ اور فکر کرتے تھے۔ بظاہر اُنھیں زبان پر حیرت انگیز عبور حاصل تھا اور معلوم ہوتا تھا کہ صدیوں پیشتر سے اردو اُن کی مادری زبان رہی ہے۔ اُن کا طریقۂ اظہار اسی معیار کے مطابق تھا جسے اُردو شاعری کے اساتذہ نے قائم کر دیا ہے۔ بسا اوقات وہ فنِ شاعری کی عمیق گہرائیوں تک پہونچ جاتے ہیں، اور اردو زبان کی تمام مروجہ قیود اور بندشوں کی سختی کے ساتھ پابندی کرتے ہیں۔ چنانچہ بعض معمولی نقائص کے باوجود اُن کی شاعری میں پائے جاتے ہیں یہ ماننا پڑیگا کہ انتمام پابندیوں میں رہکر انھوں نے قابل تعریف طریقے سے اپنی عہدہ برائی کی ہے۔

ان انگلو انڈین شعرا میں بہت سے مشہور ومعروف بیگم شمرو کے دربار سے وابستہ تھے۔ بیگم شمرو مشہور ومعروف فرانسیسی سردار جنرل سمرو یا سومبر کی اہلیہ تھی۔ اور اس کی قابلیت کے لحاظ سے شاہ عالم نے اُسے زیب النسا کا خطاب عطا کیا تھا۔ وہ نہایت قابل اور باکمال عورت تھی۔ انتظامی قابلیت کے ساتھ ساتھ مختلف علوم وفنون کی ماہر تھی۔ علم ادب سے بھی اسے خاص ذوق تھا اور فارسی اور اردو بے تکلف لکھ پڑھ سکتی تھی۔ وہ فارسی زبان میں خط وکتابت کیا کرتی تھی۔ اور آخری وصیت جسکی روسے اُس نے اپنی ساری جائداد اپنے متبنیٰ لڑکے ڈائس سومبر کو دیدی تھی اُسی کی تیار کردہ تھی۔ اس کا ایک سوتیلا بیٹا الائے سی این رین ہارٹ جس نے اسلامی وضع قطع اختیار کر لی تھی اور نواب ظفر یاب خاں کے لقب سے ممتاز تھا صاحب تخلص کرتا تھا۔ یہ نوجوان عیسائی شہزادہ اُردو کا اچھا شاعر تھا۔ اور اپنے مکان واقعہ دہلی میں مشاعرے منعقد کیا کرتا تھا۔ دار السلطنت کے تمام نامی گرامی شعرا اس کے مشاعرے میں شریک ہوا کرتے تھے۔

اُردو شعرا کے مشہور تذکرہ نویس سرور بھی ان صحبتوں میں باقاعدہ شریک ہوتے تھے (ان تفصیلات کے لئے ہم انھیں کی کتاب کے مرہون منت ہیں) صاحب اپنی غزل کی اصلاح خیراتی خاں دلسوز سے لیا کرتا تھا۔ اور خوشخطی، مصوری اور موسیقی میں اچھی دستگاہ رکھتا تھا۔ لیکن شراب کا بیحد عادی تھا جس سے اُس کی زندگی نے جس سے بہت سی توقعات وابستہ تھیں کچھ وفا نہ کی۔ اسکے دو شعر ملاحظہ ہوں۔

نظر آیا مجھے شب بام پہ پیارا اپنا ۔۔۔ بارے اب کچھ ہے بلندی پہ ستارا اپنا

ہے زلف حلقہ زن خطِ دلبر کے آس پاس ۔۔۔ یا اژدہا ہے فوج سکندر کے آس پاس

وہ ایک لڑکی جولیا این نامی چھوڑ کر مرا جس نے بعد میں کرنل جارج اے ڈالس سے شادی کی۔ اس سے مشہور و معروف ڈالس سومبر پیدا ہوئے جسے بیگم سرو دھنہ نے اپنا متبنیٰ قرار دیا۔ اور اپنی موت کے بعد جو ۱۸۳۶ء میں واقع ہوئی۔ اپنی ساری جائیداد کا تنہا وارث بنا دیا۔ ڈالس کی تعلیم و تربیت مشرقی اصول پر ہوئی تھی اور وہ فارسی میں بہت معقول دستگاہ رکھتا تھا۔ اس کا ایک ہمعصر یکن اس کے متعلق رقمطراز ہے کہ "ڈالس نے دہلی کالج میں تعلیم پائی تھی اور وہ فارسی اور انگریزی کا زبردست فاضل ہے"۔ اسے اسلامی علم ادب سے بھی بغایت دلچسپی تھی اور اُردو میں نہایت اچھے شعر کہتا تھا، شعر پڑھنے کا انداز بھی نہایت پسندیدہ تھا۔ لیکن افسوس ہے کہ آج اُس کا ایک شعر بھی دستیاب نہیں ہوتا۔ ممکن ہے اسکا باعث یہ ہو کہ وہ عنفوان شباب ہی میں انگلستان چلا گیا تھا، جہاں اس نے باقی عمر بسر کی اور پھر نہ لوٹا۔

نواب ظفر یاب خاں کا ایک نوجوان دوست بلتھزر نامی اسیر تخلص کرتا تھا، اور مرصع شعر کہا کرتا تھا دہلی کے مشہور استاد شاہ نصیر کا شاگرد تھا۔ اس کا ذکر اور نمونہ کلام بعض بڑے بڑے تذکروں میں درج ہے۔ یہاں ہم ناظرین کی دلچسپی کے لئے دو شعر درج کرتے ہیں

شمع فانوس میں در پردہ جلے ہے دیکھو ۔۔۔ شعلۂ آہ نکالے ہے جگر سے باہر

ہم اس آئینہ رو کے ہجر میں یوں زیست کرتے ہیں ۔۔۔ کہ سکتے کی سی حالت ہے نہ جیتے ہیں نہ مرتے ہیں

اس سلسلہ میں بلتھزر نامی ایک اور شخص کا بھی ذکر بیجا نہ ہوگا۔ جو شہزادہ سیحی کے نام سے مشہور تھا

یہ فرانسیسی نژاد تھا اور ہندوستان میں عہد اکبری میں وارد ہوا تھا۔ باعتبار عقائد وہ رومن کیتھولک تھا اور ۱۸۱۰ء میں بھوپال کی کونسل آف ریجنسی کا ممبر بھی تھا۔ اس کی نسبت مشہور ہے کہ شعر و سخن کا خاص ذوق تھا۔ مگر بدقسمتی سے موجودہ تذکروں میں اس کا ایک شعر بھی محفوظ نہیں ہے۔

ایک اور یورپین شاعر فراسو نامی تھا جس کا پورا نام فرانکوالس کومین سوسنے آگسٹین تھا۔ یہ بیگم سمرو کا ملازم اور فرانسیسی نژاد تھا۔ اور بیگم سمرو کے دربار میں شعرا میں نہایت ممتاز حیثیت رکھتا تھا، اس کا نایاب دیوان حال میں دہلی میں میری نظر سے گذرا ہے۔ فراسو نہایت پرگو شاعر تھا، اور تصنیف و تالیف سے اُسے اس قدر شوق تھا کہ اس نے اپنے بعد بہت سی کتابیں اپنی یادگار چھوڑیں۔ اس کا ایک شعر یہ ہے:-

ہے خواب میں دیکھا تو بظاہر بھی ملیں گے قسمت سے نہ گر خواب کی تعبیر اُلٹ جائے

لالہ سری رام صاحب دہلوی مؤلف خمخانۂ جاوید کے کتب خانے میں فراسو کا ایک ضخیم دیوان موجود ہے جس میں نثر اور نظم دونوں قسم کی عبارتیں درج ہیں۔ اشعار ذیل اسی قلمی نسخے سے منتخب ہیں:-

ہوتا بسر ہے یوں اب روزِ فراق اپنا کب دردِ دل نہ دیکھا کب دردِ سر نہ دیکھا
فریاد میری سنکر کچھ آہ کام آئی نالے کا آہ پر کچھ ہم نے اثر نہ دیکھا
دیکھا ہر اک طرف کو محفل میں اے فراسو بیٹھے تھے ہم جدھر کو اُس نے اُدھر نہ دیکھا

پوری غزل اُنیس اشعار میں ہے، یہاں پر بخوفِ طوالت صرف تین اشعار نقل کئے گئے ہیں۔ ایک دوسری غزل کے دو اشعار یہ ہیں:-

ایسا تو کوئی ہم نے سنگیں جگر نہ دیکھا ہم مر گئے تڑپ کر تم نے اُدھر نہ دیکھا
دیر و حرم کے گھر میں گھر ہے بشر کا لیکن گھر میں خدا کے ہم نے انساں کا گھر نہ دیکھا

چند اور اشعار ملاحظہ ہوں۔

دل میں ملنے کی نہیں تو یہ بہانا سیکھا اور سیکھا بھی تو بس بات بنانا سیکھا
ضعفِ پیری نے سرِ راہ بٹھا کر مجھکو کوکبِ چرخ سے بھی آنکھ لڑانا سیکھا
آئینہ کب تیری صورت کے مقابل ہوگا ہم سے پردے میں چھپے خوب بنانا سیکھا
اپنا ہی قصۂ جاں سوز فراسو تو لکھ یک قلم لکھنے سے کیوں ہاتھ اُٹھانا سیکھا

کیوں اُتر جائیں بھلا ہم خاطرِ دلدار سے اُسکا مطلب مجھ سے اور میرا ہے مطلب یار سے

بندشِ رشتہ ہے ہم کو اک بتِ عیار سے
کب مسلمانوں کو میرے عار ہے زُنّار سے

یاس و غم کے ہوں مضامیں جس میں وہ پڑھیئے غزل
ہم تو ہوتے ہیں فراسو خوش ترے اشعار سے

نرگسِ بیمار کے تلوے مَیں سہلاؤں نہ کیوں
کرتے ہم چشمی ہیں میرے دیدۂ خونبار سے

کونسے مذہب میں ہے عاشق کا ترسانا روا
یعنی ظالم کے نہیں ہے ہاتھ کا کھانا روا

گرد کھانا ہے ہمیں جلوہ تو ہے آنا روا
دیر کی تم نے تو ہے عاشق کا مرجانا روا

غیر کے گھر میں کیا جانا جو جاناں نے روا
ہم نے بھی جانا ہے جاناجان کا جانا روا

چاہیئے بیمار تیرے لعل لب کو چوس لے
وقت مُردن ہے ستی کو پان کا کھانا روا

کون بچتا ہے فراسو ہاتھ سے اس موت کے
عاقبت سوئے عدم انساں کو ہے جانا روا

دل اس کے دم میں نہ آنا وہ یار کسکا ہے
کسی کے دل پہ بھلا اختیار کس کا ہے

جو نکلے سینہ سے دم تو اسے نکلنے دے
اے یار وہ دلِ بااختیار کس کا ہے

کرو نہ گریہ و نالہ سدا فراسو تم
وہ بے وفا ہے صنم غمگسار کس کا ہے

لگی ہے تار نفس میں یہ ناخنِ مضراب
کہو یہ پردے میں بجتا ستار کس کا ہے

ایک اور اینگلو انڈین شاعر جو ایک لحاظ سے سر دھنہ ہی سے وابستہ ہے جان تھامس تھا اس کی سکونت دہلی میں تھی اور اس شہر کے ادبی حلقوں میں اسے ایک خاص ہر دلعزیزی بھی حاصل تھی۔ عوام میں وہ 'خاں صاحب' کے نام سے مشہور تھا۔ اس کے باپ جارج ٹامس کو لوگ عام طور پر 'جہازی صاحب' کہتے تھے۔ ٹامس شروع شروع میں ہانسی میں رہا جہاں اسکے باپ جارج ٹامس کا کچھ عرصہ تک خوب دور دورہ رہا۔ یہاں کا وہ خود مختار حاکم تھا لیکن چار سال کی حکومت کے بعد اسے جنرل پیرن کی افواج کے مقابلہ میں بھاگ جانا پڑا بالآخر ۱۸۰۲ء میں کلکتہ کے راستے میں مرگیا۔ جارج ٹامس ہندوستانیوں سے اسدرجہ میل جول رکھتا تھا اور اہل یورپ سے اس قدر علیحدہ رہا کرتا تھا کہ لارڈ ولزلی نے اسکے علاقہ کی رپورٹ طلب کی تو اس نے بمنت فارسی میں رپورٹ لکھنے کی اجازت مانگی اور لکھا کہ یہ درخواست میں اسلئے کرتا ہوں کہ انگریزی زبان بالکل بھول گیا ہوں۔ ۱۸۰۲ء کے بعد ٹامس دہلی آگیا اور دار السلطنت کے مختلف ادبی صحبتوں میں شامل ہوگیا۔ شاہ نصیر اس پر بیحد مہربان تھے، ذیل میں اس کا ایک شعر درج کرکے اس مضمون کو ختم کیا جاتا ہے۔

سودا ہے زلفِ یوسفِ ثانی کا اس قدر
روتے ہیں ہم کھڑے سرِ بازار زار زار

اُردو کے چار شاعر

(از پنڈت امرناتھ جھا صاحب ایم۔ اے پروفیسر انگلش لٹریچر الہ آباد یونیورسٹی)

نمک ہے فارسی کا درد ہندی شاعری کا ہے
یہ اُردو ہے سلے نکتہ سنجانِ عجم دیکھیں

اُردو شاعری پر قلم اٹھانیکا مجھے کوئی حق نہیں، سوائے اس کے کہ چند زبانوں کی شاعری سے واقف ہوں۔ اور شاعری میں کس چیز کی ضرورت ہے، اور اچھی اور بُری شاعری میں کیا فرق ہے، اور شاعر ہونے کا دعویٰ کون کرسکتا ہے، ان امور پر میں نے قدرے غور کیا ہے۔ پھر بھی حال کے اُردو شعرا کے کلام پر میرا کچھ عرض کرنا گستاخی میں داخل ہے۔ لیکن جناب اڈیٹر صاحب زمانہ کا اصرار ہے بلکہ حکم ہے کہ زمانہ کے جوبلی نمبر کے لئے میں کوئی مضمون ضرور لکھوں۔ منشی دیا نرائن صاحب نگم نے گذشتہ پچیس سال میں زبان اردو کی ... قابل قدر خدمت کی ہے۔ خدا اون کو اس سے بھی زیادہ توفیق عطا فرمائے۔ اس مضمون میں جو کچھ کمی ہے اُسکا ذمہ دار میں ہوں، اور اسکے لکھے جانیکے گنہگار جناب نگم صاحب ہیں۔

یہاں مجھے اس بحث سے کوئی غرض نہیں کہ لوگوں کو شعر و سخن میں دلچسپی کیوں ہوتی ہے اور ہر دل و دماغ میں کونسی ایسی شے ہے جس کی وجہ سے اچھا شعر سنکر ایک عجیب اثر پیدا ہوتا ہے۔ رنج و غم۔ لطف و خوشی ہر حالت میں یہ اثر موجود ہے اور ہر ملک اور ہر زبان کی شاعری میں یہ اثر مضمر ہے۔ پھر بھی کوئی مصنف شاعری اصل میں کیا ہے اسکو اختصار کے ساتھ بیان کرنے میں کامیاب نہیں ہوا ہے۔ ارسطو اور افلاطون نے یونان میں، حارس نے اٹلی میں۔ بوایلو۔ اناطول فرانس۔ سینٹ بوف نے فرانس میں۔ سڈنی۔ بنجالسن۔ ڈرائیڈن۔ ورسورتھ۔ شیلی۔ متھو آرنلڈ۔ مُری اور ڈرنکواٹر نے انگلستان میں۔ بھامہ۔ ڈنڈی۔ ممٹ اور جگناتھ نے ہندوستان میں بہت کوشش کی کہ لوگوں کو سمجھائیں کہ شاعرانہ خوبی کیا ہے۔ حالانکہ اچھے شعر کی داد سبھی دیتے ہیں، اور بہت سے پڑھے لکھے لوگ نکتہ چینی بھی کرتے ہیں، پھر بھی اگر اُن سے کہا جائے کہ چند الفاظ میں یہ بیان کریں کہ اچھے شاعر کے لئے کن خصوصیات کی ضرورت ہے تو شاید وہ اسے آسانی سے بیان نہ کرسکیں گے یہ نہایت مشکل کام ہے جس کا معمولی ثبوت یہ ہے کہ ہر انسان کا دل مختلف سانچے میں ڈھلا ہوتا ہے۔ علاوہ اسکے سوسائٹی اخلاق۔ تعلیم اور رفتار زمانہ کا اثر ہر دل و دماغ پر ایک مختلف کیفیت پیدا کرتا ہے۔ اچھے خیالات کا اچھی زبان میں ادا کرنا شاعری ہے۔ اچھے خیال کون ہیں اور اچھی زبان کیسی ہوتی ہے، اس کا فیصلہ نہ تو آجتک ہوا ہے اور نہ آسانی سے ہوسکتا ہے۔ اشعار کا انتخاب ظاہر میں آسان مگر فی الحقیقت نہایت مشکل اور اہم ہے۔ شاعر کا کیا خاص رنگ ہے۔ کسی شعر میں طرز بیان کی

خوبی یا خیالات کی بلندی کا معلوم کرنا بس یہی فرض انتخاب کنندہ کا ہے۔ سنسکرت میں یہ کہاوت ہے کہ زندہ شاعروں کے کلام کی نسبت کچھ نہیں کہنا چاہیئے۔ شاعروں کی ذات نہ صرف ہندوستان میں بلکہ تمام دنیا میں نازک مزاجی کے لئے مشہور ہے، لہذا میں اس مضمون میں اگر تمام شعرا کی تعریف کرتا ہوں تو اس کے معنی یہ نہیں کہ میرے نزدیک انکا کلام ہر قسم کے عیب سے خالی ہے۔ بلکہ بقول اکبر

"اگر سمجھا ہونکا لو عیب تم اچھے سے اچھے میں"

لیکن جہاں اتنے اوصاف موجود ہیں وہاں عیوب پر نظر کرنا مناسب نہیں معلوم ہوتا۔

سب سے پہلے میں سید اکبر حسین صاحب اکبر الہ آبادی کے چند اشعار نمونہ کے طور پر پیش کرتا ہوں گذشتہ پچاس سال کے اردو شعرا میں اکبر کا جو مرتبہ ہے وہ کسی اور کو نصیب نہیں ہوا۔ یہ خیال کرنا کہ اُن کے کلام میں محض ظرافت ہے غلطی ہے سید صاحب کے دیوان میں ہر پیمانہ کے اشعار موجود ہیں اور ہر رنگ میں اُنکی شاعری چمکی ہے ظرافت کا کیا کہنا وہ اس زمرہ کے سرتاج ہیں، لیکن کلیات اکبر کے تینوں حصوں کو جس کسی نے غور سے پڑھا ہے وہ ضرور حیران ہوگا کہ ظرافت کے رنگ میں اتنی کامیابی حاصل کرتے ہوئے بھی ممدوح نے تغزل، پند و نصائح کے مطالب کو بھی کس خوبی سے ادا کیا ہے ملاحظہ ہو:-

دل بھی کانپا ہونٹ بھی تھرائے شرمایا بھی خوب — شیخ کو لیکن تری مجلس میں پینا ہی پڑا

قرآن ہے شاہد کہ خدا حُسن سے خوش ہے — کس حُسن سے، یہ بھی تو سنو۔ حُسن عمل سے

جب کہا میں نے بھلا دو غیر کو ہنس کر کہا — یاد پھر مجھکو دلانا بھول جانے کے لئے

جو غبارے تھے وہ آخر گر گئے — جو ستارے تھے وہ چمکتے ہی رہے

عشق نازک مزاج ہے بیحد — عقل کا بوجھ اُٹھا نہیں سکتا

لفٹن نفیس، سڑک خوشنما، ڈنر ہر شب — یہ لطف چھوڑ کے حج کا سفر؟ یہ خوب کہی

ہزار سائنس رنگ لائے، ہزار قانون ہم بنائیں
خدا کی قدرت یہی رہے گی، ہماری حیرت یہی رہے گی

آپ نے سچ فرمایا ہے۔

امید ہے دعا کی اہل سخن سے اکبر میرے حقوق بھی کچھ اردو زبان پر ہیں

(شاد عظیم آبادی)

ابھی تھوڑے ہی دن ہوئے کہ خان بہادر مولانا محمد علی شاد نے رحلت فرمائی ہے۔ لیکن آپ اپنے کلام کی بدولت ہمیشہ زندہ رہیں گے۔ آپ کی شاعری کا رنگ تو پرانا ہے تاہم اس میں انتہا درجہ کی سادگی موجود ہے۔ کیا خوب فرماتے ہیں:۔

کبھی ہم سے نہ شغل شعر خوانی شاد چھوٹے گا
اجل جبتک نہیں آتی یہی رونے رلانے ہیں

سادگی کے ساتھ ساتھ یاس و حسرت کی تصویر بھی کس مزے سے کھینچتے ہیں، فرماتے ہیں:۔

تمناؤں میں الجھایا گیا ہوں کھلونے دے کے بہلایا گیا ہوں

اگر مرتے ہوئے لب پر نہ تیرا نام آئے گا تو میں مرنے سے درگذرا۔ مرے کس کام آئیگا

کہاں سے لاؤں سبو حضرت ایوب اے ساقی خم آئیگا۔ صراحی آئیگی۔ تب جام آئیگا

جب کسی نے حال پوچھا رو دیا چشم تر تو نے تو مجھ کو کھو دیا

گھبرا کے یہی کہتے ہیں اب عمر رواں سے پہنچا دے وہیں گھیر کے لائی تھی جہاں سے

الٰہی خیر ہو اب کے بہار باغ نے پھر بھی جمایا بے طرح بلبل کے دل پر اعتبار اپنا

شیخ ذکرِ گلشنِ فردوس فرمانے لگے رفتہ رفتہ تیرے کوچے کی طرف آنے لگے

علاوہ بریں آپ کے کلام میں میرے نزدیک سب سے قابل قدر بات (Element of Surprise) یعنی خلافِ قیاس بات کا پیدا کرنا ہے۔ اس زمرہ میں آپ کے چند اشعار مثال کے طور پر پیش کرتا ہوں۔

کانٹوں میں ہے گھرا ہوا چاروں طرف سے پھول اُسپر کھلا ہی پڑتا ہے کیا خوش مزاج ہے

دے کے تھی صبوح مجھے صبر کا حوصلہ دیا جس کی طلب تھی ساقیا اُس کو کہیں سوا دیا

اِسے کہتے ہیں خوبی، ہم تو اس خوبی کے قائل ہیں ہوا جب ذکر کیتائی کا نام آیا وہیں تیرا

ساقیا تو نہ میرے شکر کا مطلب سمجھا تب تو پیمانۂ خالی کو لبالب سمجھا

حسن و عشق ایک ہیں ظاہر میں ہیں فقط دو نام یہ اگر سچ ہے تو کیا ان کے برابر ہم ہیں

(صفی لکھنوی)

مولانا سید علی نقی صاحب صفی لکھنوی کا نام نامی صرف لکھنؤ میں نہیں بلکہ جہاں کہیں اردو شاعری کا ذکر ہے نہایت ادب و احترام کے ساتھ لیا جاتا ہے۔ موجودہ شعرا میں زبان کی سلاست۔ نفاست اور خیالات کی پاکیزگی اور بلندی اور مضامین کے انتزاع کے لحاظ سے آپ کا کلام نہایت قابل تعریف ہے۔ میرا خیال ہے کہ میری اس رائے میں دوستانہ مبالغہ نہیں بلکہ علمی انصاف کا تقاضا ہے۔ آپ کے کلام سے جو کیفیت مشاعروں میں پیدا ہوتی ہے بعینہ وہی کیفیت خلوت میں آپ کے اشعار پڑھنے سے طاری ہوتی ہے۔ کیا خوب فرماتے ہیں:-

عاشقی ہے زندگی کا ایک نام زندگی موت کا بہانہ ہے

ذکرِ جنت بہت سنا واعظ شاخ در شاخ اِک فسانہ ہے

نہ تو واعظ کو خبر ہے نہ مجھے کسے دوزخ کسے جنت ہوگی

دِل میں رکھیں تو کدورت کہلائے منہ سے نکلے تو شکایت ہو گی

دارِ ہستی سے عدم تک ہیں منازل بیشمار بھیس ہر منزل پہ ہم اپنا بدلتے جائیں گے

یہ شعر ملاحظہ ہو، واقعات کی تشریح کس خوبی و سادگی کے ساتھ فرماتے ہیں:۔

بادل گرجا، بجلی چمکی۔ روئی شبنم۔ پھول ہنسے مرغِ سحر کو ہجر کی شب کے افسانے دُہرانے دو

یہ مطلع ملاحظہ ہو، اسکی تشبیہ کس خوبی کے ساتھ بیان فرمائی گئی ہے۔ یہ مولانا صفی ہی کا کام تھا:۔

کل ہم آئینے میں رُخ کی جھُرّیاں دیکھا کئے کاروانِ عمرِ رفتہ کے نشاں دیکھا کئے

(اقبال)

سر محمد اقبال نے یورپ میں جتنی ناموری حاصل کی ہے، وہ تمام اہل ہند کے لئے باعثِ فخر ہے۔ سوائے سر رابندر ناتھ ٹگور اور مسٹر گاندھی کے اور کوئی ہندوستانی اس قدر مشہور نہیں ہوا۔ یہ سچ ہے کہ زیادہ تر اُنکی شہرت اُن کے فارسی کلام کی وجہ سے ہوئی ہے۔ اسرارِ خودی کا انگریزی ترجمہ آج یورپ میں قریب قریب اُسی ذوق و شوق اور اُسی عظمت سے پڑھا جاتا ہے جیسے پندرہ برس قبل گیتانجلی کا ترجمہ پڑھا جاتا تھا۔

ایک وقت تھا جب لوگوں کو امید تھی کہ اقبال انھیں معنوں میں تمام ہندوستان کے نیشنل شاعر ہونگے جن میں انگلستان کا شکسپیر اور جرمنی کا گوئٹھ گذرا ہے۔ اُس زمانہ میں یہ ترنم گونج رہا تھا۔

سونی پڑی ہوئی ہے مدت سے دل کی بستی آ اِک نیا شوالہ اس دیس میں بنا دیں

ہر صبح اُٹھ کے گائیں منتر وہ میٹھے میٹھے سارے پجاریوں کو مے پیت کی پلا دیں

آجکل کے جھگڑوں سے بالکل الگ رہکر انھوں نے تصوّف اور فلسفہ کی طرف اپنے کو رجوع کیا، اور وہ نظمیں لکھیں جن کی قدر زبان کی بعض کمزوریوں کے باوجود ادبی صحبتوں میں ہمیشہ یادگار رہیں گی۔ اقبال روزمرہ نیچر کی کیفیت کا نقشہ بھی نہایت حسن و خوبی کے ساتھ کھینچتے ہیں۔ اور اس طرزِ کلام میں وہ انگلستان کے مشہور شاعر ورڈسورتھ کے مقابل لائے جا سکتے ہیں۔ ذیل کے چند اشعار ملاحظہ ہوں، کس خوبی اور کیسے پر اثر پیرایہ میں بیان فرماتے ہیں:۔

لگتی ہے چوٹ دل پر آتا ہے یاد جس دم شبنم کے آنسوؤں پر کلیوں کا مسکرانا

اُٹھائے کچھ ورق لالہ نے کچھ نرگس نے کچھ گل نے — چمن میں ہر طرف بکھری ہوئی ہے داستاں میری

اُڑالی قمریوں نے طوطیوں نے عندلیبوں نے — چمن والوں نے مل کر لوٹ لی طرزِ فغاں میری

اِس مختصر تحریر کے بعد میں اپنے مضمون کو ختم کرتا ہوں، اور اربابِ عقل و دانش سے اپنی غلطیوں کی معافی چاہتا ہوں۔ اخیر میں میں یہ عرض کر دنگا کہ جس زبان میں اب بھی ایسے شاعر موجود ہیں اُسکی آئندہ کی بہبودی میں کیا شک ہوسکتا ہے، شعرا موجود ہیں، جدید راستے سامنے ہیں، ضرورت محض اس بات کی ہے کہ اُن راستوں کی طرف اس وقت جو بہ گمانیاں ہیں دور کردی جائیں اور پھر کوئی وجہ نہیں کہ اردو شاعری دنیا کی کسی اور شاعری سے کیوں نہ مقابلہ کرے۔

اَمرناتھ جھا

کلام شاد

ہز اکسیلنسی راجۂ ایان مہاراجہ سرکشن پرشاد بہادر یمین السلطنۃ صدر اعظم حیدرآباد دکن

دل لگا کر عجب مزا دیکھا — دوست دشمن کو آشنا دیکھا

دیر میں کعبے میں کلیسا میں — جلوۂ یار جا بجا دیکھا

اُس کے جلوہ کا حال کیا کہیئے — جو سُنا اس سے بھی سوا دیکھا

دیر میں ہم نے دیکھی قدرتِ حق — شیخ مسجد میں تو نے کیا دیکھا

تھی اُسے اپنے دید کی خواہش — اپنا جلوہ ہر ایک جا دیکھا

کس نے دعوے کیا انا الحق کا — بر سرِ دار تو نے کیا دیکھا

جب نہیں اور کوئی اس کے سوا — کس کو پردے میں پھر چھپا دیکھا

کیوں بلے کہہ کے تو بلا میں پھنسا
شاد کیا سمجھا اور کیا دیکھا

گھنٹا بیگ

(از جناب خواجہ عبدالرؤف صاحب عشرت لکھنوی)

شاہ نصیر الدین حیدر بادشاہ سلطنت اودھ کے زمانے مین آغا میر کے مشورہ سے افغانی فوج رفتہ رفتہ کم کردی گئی اور آخر کار برخاست ہوگئی۔ اسکا اصلی سبب یہ تھا کہ سردار عبدالرحمن خان رسالدار فوج بہادر اور جرمی تھا اور اراکین سلطنت کو خاطر مین نہ لاتا تھا۔ ایک دفعہ بخشی فوج نے کہا کہ فوج کی تنخواہ جائزہ لینے کے بعد دی جائے گی اس پر خانصاحب کو غصہ آگیا اور انھون نے اپنا کنٹھا بخشی جی کے منھ پر کھینچ مارا اور کہا ہم فوج کا جائزہ اُسوقت دینگے جب بادشاہ پر کوئی غنیم آئیگا ہمارا بچہ بچہ سلطنت کا نمکخوار ہے اور اسکے لیے جان دیدیگا نواب سعادت علیخان اور نواب غازی الدین حیدر کو نواب بھائی کہا کرتے تھے۔

ایک مرتبہ رزیڈنٹ نے نواب غازی الدین حیدر کو کسی مشورہ کیلئے بیبیاپور کی کوٹھی مین بلوایا۔ معمول سے کچھ زیادہ دیر ہوگئی تو بادشاہ بیگم نے عبدالرحمن خان کو بلواکر کہا وہ فوراً بیبیاپور کی کوٹھی مین پہنچگئے اور بادشاہ کا ہاتھ پکڑ کر اپنے ساتھ لے آئے۔ خان صاحب کے انتقال کے بعد مغل فوج ملازم ہوئی اور اُن کے افسر فقیر محمد خان گویا مقرر ہوئے۔ انھین مغلون مین ایک مغل مرزا عنایت علی بیگ بھی تھے جو رسالہ مین ملازم تھے نہایت قدآور جوان لحیم شحیم گورے چٹے اُس زمانے مین سوار دن کی تنخواہ قلیل ہوتی تھی اسکے ساتھ ساتھ تین روپیہ مہینہ کا سائیس گھوڑے کا دانہ گھاس وغیرہ سب کا ان کو انتظام کرنا پڑتا تھا اسلئے سوار دن سے پیدل اچھے رہتے تھے۔ دوسری مصیبت یہ تھی کہ مرزا اسقدر وزنی تھے کہ کوئی گھوڑا سواری مین دو مہینے سے زائد زندہ نہ رہتا تھا۔ اوّل تو خود بھی گرانڈیل تھے دوسرے فوجی اسلحہ جنگ زیب بدن کرنا لازمی تھا۔ خود چہلنا۔ چار آئینہ۔ زرہ بکتر تلوار۔ ڈھال۔ نیزہ۔ قرابین بندوق وغیرہ دو من کا بوجھ یہ بھی ہوجاتا تھا۔

مرزا صاحب خوش خوراک تھے عملے کی طرف سے جب کبھی تعنیات کئے جاتے تھے تو کچھ آمدنی ہوجاتی تھی۔ لیکن بیچارے پیدل جاتے تھے۔ ایک دفعہ دس کوس کا سفر کرکے کسی سرا مین داخل ہوئے تو بھٹیاری سے کہا کہ ڈھائی سیر کی روٹی آدھ سیر گوشت چھٹانک بھر گھی لیکر کھانا پکاؤ اس نے پوچھا آپکے ساتھ کتنے آدمی ہین کہنے لگے آٹھ آدمی اور آتے ہین۔ جب وہ کھانا پکاکر لائی مرزا صاحب نے اکیلے بیٹھکر ناشتہ کرلیا۔ بھٹیاری دیکھکر حیران ہوگئی آپ نے اُسے بلاکر چپکے سے کہا کہ بھٹیاری کسی سے کہنا نہین مین آدمی نہین ہون جن ہون جو کچھ تم کہوگی

مین تمہارا کام پورا کرونگا کچھ کھانا اور بھی ہو تو لے آؤ اُسنے ڈرتے ہوئے جو کچھ کھانا مسافرون سے ملا تھا اور جو کچھ گھر مین بچا تھا سب ان کے آگے رکھدیا مرزا صاحب نے سب نوشجان کرکے ڈکار لی۔

اودھ کی سلطنت سے رزیڈنٹ بہادر کا معاہدہ تھا کہ جب بادشاہ کو کسی غنیم پر یا کسی باغی پر فوج بھیجنا ہوگی تو انگریزی فوج مدد کے لیے جائے گی۔ اس زمانے کے سرکش راجہ سلطنت سے روزمرہ سرتابی کیا کرتے تھے اور اکثر انگریزی فوج جایا کرتی تھی لیکن نصیر الدین حیدر بادشاہ کے زمانے مین مسٹر ماردنٹ رکھش صاحب بہادر نے اسمین عذر کیا سبکی وجہ سے اکثر زمیندارون کو سرکشی کا حوصلہ ہوگیا اور بادشاہ کو ان کے خلاف ناچار اپنی فوج بھیجنا پڑتی تھی۔ ایک مرتبہ کسی گڑھی کے راجہ نے دو برس سرکاری مالگذاری ادا نہ کی اور مضبوط قلعہ بنوالیا اور اسکے فصیل مین چارون طرف روزن بنوا دیئے اور بندوقین وغیرہ کثرت سے خرید کر فوج بھی فراہم کرلی۔ جب بادشاہی فوج اس جگہ کے راجہ کے گرفتاری کیواسطے گئی تو اس نے قلعہ کا پھاٹک بند کرلیا اور روزن سے گولیان برسانا شروع کین۔ دو مہینے تک ساری فوج قلعہ کو گھیرے رہی مگر کسی طرح قلعہ فتح نہوا۔ مجبور ہوکر فوج واپس چلی آئی لیکن اُس کے پچاس سوار اس جنگ مین کام آگئے۔

اراکین سلطنت اس تشویش کی حالت مین مختلف تجویزون پر غور کررہے تھے بادشاہ کو بھی بہت غصہ تھا فوج کے تمندار رسالدار سپہ سالار سب دم بخود موجود تھے۔ مرزا عنایت علی بیگ بھی موجود تھے ہاتھ باندھکر عرض کی اگر حضور فدوی کو تھوڑی فوج عنایت فرمائین تو حضور کے اقبال سے دس دن مین قلعہ فتح کرکے راؤ کو قید کرکے لے آؤن۔

اس بات پر اراکین سلطنت ہنسنے لگے اور بادشاہ نے غصے کی حالت مین فرمایا اگر تم بھی ناکام آئے تو سر اُڑا دیا جائیگا۔

مرزا نے کہا "حضور مین نے اپنا خون معاف کیا اُسی وقت توپ اِم کرا دیجئے گا"

اس جراءت پر تمام دربار کو تعجب ہوا لوگ ان کی حماقت پر ہنستے تھے اور کہتے تھے کہ اس دراز قد بیوقوف کی موت آئی ہے۔ تاہم بادشاہ نے حکم دیا کہ ان کی سرکردگی مین فوج روانہ کی جائے۔ مرزا نے اپنے ساتھ دو ہوشیار بڑھئی لیے۔ اور فوج کے سپہ سالار بنکر روانہ ہوئے قریب شام کے قلعہ سے دو تین میل کے فاصلے پر فوج کو ایک جنگل مین پوشیدہ اُتار دیا۔ اور آپ رات کو دونون بڑھیون کو ساتھ لیکر قلعہ کے پھاٹک پر چلے آئے اور بڑھیون سے کہا کہ اسکے دونون پٹ آرہ سے کاٹ ڈالو" ابھی پو بھی نہ پھٹنے پائی تھی کہ پھاٹک کے دونون پٹ کٹ گئے سب سے پہلے پٹ ہٹاکر آپ تنہا قلعہ مین داخل ہوئے اہل قلعہ اس آفت سے بیخبر باؤن پھیلائے سو رہے تھے مرزا نے جاتے ہی سب سے پہلے راجہ کو دبوچ لیا اسکے بعد سپاہیون سے کہا کہ اگر میرے پاس کوئی آیا

یا مچھر کسی نے وار کرنے کا قصد کیا تو راجہ کی جان کی خیر نہیں قلعہ کے لوگ اس دیو صورت انسان کو دیکھکر ڈر گئے اتنے میں مرزا کے ساتھ کی فوج بھی قلعہ میں داخل ہو گی۔ اہل قلعہ کچھ بھاگ گئے کچھ گرفتار ہوئے فوج نے تمام قلعہ لوٹ لیا اور راجہ کو گرفتار کر کے بادشاہ کے حضور میں لائے۔ راجہ نے بادشاہ سے معافی مانگی اور از سر نو معاہدہ کیا۔

بادشاہ نے اس خدمت کے صلے میں مرزا کو انعام دینا چاہا اراکین سلطنت میں سے کسی نے کہدیا حضور مرزا کی سواری کے لائق کوئی گھوڑا نہیں ملتا جو گھوڑا سرکار سے ملتا ہے دو چار مہینے زندہ رہکر مرجاتا ہے بہتر ہے کہ اس حسن خدمت کے صلے میں ایک ہاتھی مرحمت فرمایا جائے بادشاہ نے نہایت خوشی سے اس بات کو قبول کیا اور ہاتھی کی خوراک اور فیلبان کی تنخواہ اپنے خزانۂ عامرہ کے ذمہ لی۔ مرزا بیچارے غریب آدمی تھے ان کے گھر میں ہاتھی باندھنے کی جگہ نہ تھی اور خود ان کی اولاد مصیبت سے بسر کرتی تھی طوعاً و کرہاً ہاتھی کو تولے آئے مگر دوسرے دن اُسے تین ہزار روپیہ کو بیچکر اور فیلبان کو بھی ہاتھی کے ساتھ روانہ کر کے آپ اپنی ذات پر روپیہ اُڑانے لگے البتہ صرف ہاتھی کا گھنٹا جو اسکے گلے میں پڑا ہوا تھا اتار رکھا۔

مہینے دو مہینے کے بعد بادشاہ کو پرچہ گذرا کہ مرزا نے ہاتھی بیچڈالا چنانچہ بادشاہ نے استفسار حال کے لیے ان کو طلب فرمایا۔ آپ نے ہاتھی کا گھنٹا اپنے گلے میں باندھ لیا اور اسی حالت سے شاہی دربار میں حاضر ہوئے۔ بادشاہ نے پوچھا مرزا یہ آج خلاف انسانیت آپکے گلے میں ہاتھی کا گھنٹا کیوں پڑا ہوا ہے اور ہاتھی کہاں ہے۔

دست بستہ عرض کی کہ حضور ہاتھی تو میں خود ہوں جس کے دم کے ساتھ ایک کنبے کا خرچ لگا ہوا ہے پھر دو دو ہاتھی باندھکر کیا کرتا۔ امیدوار ہوں کہ ہاتھی کا راتب اور فیلبان کی تنخواہ فدوی پر جاری رہے کہ اپنے کنبے کی پرورش کر سکوں۔

بادشاہ نے حکم دیا کہ چودہ سیر آٹا اور سیر بھر گھی روزانہ کے حساب سے مرزا کو ہاتھی کی خوراک کے بجائے ملا کرے۔ مرزا نے بھی اپنی وضع کو مرتے دم تک نباہ دیا یعنی زندگی بھر اُن کے گلے میں ہاتھی کا گھنٹا پڑا رہا۔ اسی وجہ سے لوگوں نے ان کا نام عنایت علی بیگ کے بجائے گھنٹا بیگ رکھ لیا۔ اور محلے والے مرزا گھنٹا بیگ کہنے لگے۔

مرزا کا مکان حضرت عباس کی درگاہ کے پشت کیطرف زنانی درگاہ کے پاس ایک میدان میں تھا۔ اور وہیں کچھ چھوٹے چھوٹے مکان اور بھی بنوا لیے تھے جو دو روپیہ ماہوار پر اور بعض ایک روپیہ ماہوار پر اُٹھا دیے تھے حسن اتفاق سے ایک مرتبہ بارش اس کثرت سے ہوئی کہ شہر کے تمام کچے مکان گر گئے۔ مرزا کے مکانوں پہ بھی بلا نازل ہوئی اور سب مکان خاک سیاہ ہو گئے۔ آپ نے اسکی لکڑی تو فروخت کر ڈالی اور مکان کی مٹی ہر آدمی کو دو آنہ روز پر دینا شروع کی یعنی جسکو ضرورت ہو مرزا صاحب کو دو آنہ دیکر شام تک جتنی مٹی لیجا سکے لیجائے۔ محلے میں جن لوگوں

کے کچے مکان منہدم شدہ بن رہے تھے۔ ان سبھوں نے مٹی خریدنا شروع کردی۔ جب مٹی ختم ہوگئی تو آپ نے زمین کھدواکر مٹی بیچنا شروع کی۔

اسی طرح آپ سال بھر تک مٹی بیچا کئے اور اسمین مکان کی قیمت سے زیادہ روپیہ حاصل ہوگیا۔ برسات مین وہی زمین گڑھیا بن گئی اور آجتک لکھنو مین گھنٹا بیگ کی گڑھیا کے نام سے مشہور ہے۔ کسی زمانے مین یہ گڑھیا اتنی بڑی تھی کہ اسمین ہاتھی ڈوب جاتے تھے اب بھی کبھی خشک نہین ہوتی اور اہل محلہ کو اس سے بہت آرام ہے آجتک اسمین دھوبی کپڑے دھوتے اور جانور پانی پیتے ہین چھوٹے بچے نہلائے جاتے ہین برسات مین یہی گڑھیا ایک تالاب بنجاتی ہے۔ ان کی دیکھا دیکھی مرزا اعظم بیگ تمندار نے بھی اپنا مکان کھدواکر مٹی بیچکر کشمیری محلہ کے قریب ایک گڑھیا بنوائی تھی مگر اسمین شاید وہ خوش نیتی شامل نہ تھی۔ کیونکہ یہ گڑھیا کچھ عرصہ کے بعد پٹ کر بالکل صاف ہوگئی۔ اور اب مرزا اعظم بیگ کی گڑھیا ایک میدان ہے جسمین برسات مین قدرے پانی جمع ہوجاتا ہے لیکن گرمی مین خشک ہوجاتی ہے۔ مرزا کی خوش نیتی دیکھئے کہ ان کی گڑھیا درگاہ کے قریب آجتک موجین مار رہی ہے

محمد علیشاہ بادشاہ اودھ کے عہد مین دیانت الدولہ خواجہ سرا بہت خدا پرست تھے اور یہ صرف دربار شاہی[۵۱] مین رہا کرتے تھے۔ اور جس زمانے مین بادشاہ نے حسین آباد کی تعمیر سے فراغت حاصل کی دیانت الدولہ نے بھی اپنی کربلا بنوالی جب بادشاہ کو اس کی خبر پہونچی تو انھون نے دیانت الدولہ سے پوچھا کہ کیا تم نے بھی کربلا بنوائی ہے اس پر دیانت الدولہ نے کہا کہ جی ہان فدوی نے بھی حضور کے اقبال سے ایک کربلا بنوائی ہے اور اپنی تمام جائداد اسکے خرچ کے واسطے وقف کردی ہے۔ بادشاہ نے کہا کہ ہم بھی انشاء اللہ کل اسکی زیارت کیلئے آئینگے۔

اب دیانت الدولہ کو یہ فکر ہوئی کہ بادشاہ کی سواری مع جلوس نکلے گی۔ اور اگر منصور نگر کیطرف سے تشریف لیجائینگے تو وہان ایک چھوٹا پڑتا ہے اور سواری کا جلوس اسطرف سے نہین نکل سکتا اور اگر درگاہ حضرت عباس سے سواری جائے تو بیچ مین گھنٹا بیگ کی گڑھیا پڑتی ہے۔ بادشاہ اپنے دلمین کہین گے کہ کیسا بیوقوف ہے جس نے ایسے مقام کربلا بنوائی ہے۔ اور سواری واپس چلی آئے گی۔

---

[۵۱] خواجہ سرا دو قسم کے ہوتے ہین۔ ایک تو صندلی ایسے خواجہ سرا محلات شاہی کی خدمت کے واسطے مقرر کئے جاتے تھے جن کے ذمہ محلات کی حفاظت اور نگہداشت بھی تھی۔

دوسری قسم کے خواجہ سرا بادامی کہلاتے تھے انکو محلات مین جانے کی اجازت نہین تھی صرف شاہی دربار مین رہتے تھے بادشاہ کیطرف انکو خطابات ملتے تھے جسوقت سودا گر لوگ انکو فروخت کرنیکی غرض سے بادشاہ کے حضور مین پیش کرتے تھے تو خریداری سے پہلے انکو ایک بار کیساتھ حوض مین اتارا جاتا تھا جب وہ بھیگے نکلتے تھے تو باریک کپڑے کی وجہ سے معلوم ہوجاتا تھا کہ صندلی ہین یا بادامی اور یہ سب خواجہ سرا حبشی ہوتے تھے

دیانت الدولہ کے ایک دارو غہ تھے سید علی حسن نہایت زکی وکارکن تھے۔ چنانچہ انھون نے ان سے مشورہ کیا انھون نے کہا کہ اور تو کوئی صورت بن نہین پڑتی مین گھنٹا بیگ سے طے کرکے راتون رات گڑھیا کو نیچے سے پٹوا دونگا مگر ہان صرف زیادہ ہوگا۔ دیانت الدولہ نے کہا کچھ خرچ ہو بات رہ جائے۔

داروغہ صاحب نے گھنٹا بیگ کو کچھ روپیہ دیکر معاملہ طے کیا اور تمام شہر کے گدھے والون کو بلاکر کہا کہ جسطرح سے ہوسکے آج شام تک اس گڑھیا کے بیچ سے ایک سڑک نکالو پھر کیا تھا ہزارون گدھے مٹی لاد لاد کر ڈالنے لگے کچھ مزدور بھی تھے جو قریب سے جسقدر ممکن ہوا مٹی اور کوڑا لے آئے اور پانی کے بیچ مین لکڑی کے تختے لگا دیئے گئے اسطرح شام تک تو نہین مگر صبح ہوتے ہوتے گڑھیا کے بیچ مین ایک سڑک بن گئی اور بادشاہ کی سواری اُسی راستے سے نکلگئی۔ مرزا گھنٹا بیگ کو پانچ سو روپیہ گھاتے مین ملگیا۔ سنا جاتا ہے کہ گھنٹا بیگ اسی برس کی عمر تک زندہ رہے۔ آخر عمر مین شاہی مسخرون مین بھی شامل ہوگئے تھے اور اسمین انھین اچھی خاصی رقم ملجاتی تھی۔ مرزا صاحب بہادر بھی تھے اور خوش مزاج بھی طاقتور ایسے تھے کہ اکی کے دو پہیے ہاتھ سے چیر کر رکھدیتے تھے فن سپہ گری سے بھی خوب واقف تھے۔

مگر افسوس ہے کہ ان کی زندگی کا آخری زمانہ بہت عسرت مین بسر ہوا تاہم وہ نہ کسی کے قرضدار اور نہ کسی کے محتاج تھے کسی کے آگے ہاتھ بھی نہین پھیلایا۔ اپنی جائداد بیچ بیچ کر کھاتے رہے اور خانہ نشین ہوکر گھر سے باہر نہین نکلے دروازے پر ہمیشہ ایک پہرہ دار نوکر رہا۔ شریفانہ آن بان سے زندگی بسر کی لیکن ہاتھی کا گھنٹہ ہمیشہ گلے مین پڑا رہا۔ امجد علیشاہ کے زمانۂ سلطنت مین دنیا سے کوچ کیا اور غظیم اللہ خان کی کربلا مین دفن ہوئے۔

خواجہ عبدالرؤف عشرت

عہد واجد علیشاہ مین گو لوگ عیش کے بندے ہوگئے تھے مگر بے غیرت نہ تھے۔ قومی دلیری ان مین عنقا تھی مگر ذاتی دلیری کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ اہل ملک کے سیاسی جذبات فنا ہوگئے تھے۔ بادشاہ کے لیے سلطنت کے لئے۔ قوم کے لیے جان کیون دین۔ کیون اپنی میٹھی نیند مین خلل ڈالین مگر انفرادی جذبات مین مطلق خوف نہ تھا بلکہ وہ قوی تر ہوگئے تھے اور ذاتی آن بان کے لیے معمولی معمولی باتون پر جو جھگڑے ہوجاتے تھے ان مین اپنی گردنین کٹانے کو مستعد ہوجاتے تھے۔

پریم چند

منتر

از منشی پریم چند صاحب بی۔اے ایڈیٹر ہادھری لکھنؤ

(۱)

شام کا وقت تھا ڈاکٹر چڈھا گولف کھیلنے جا رہے تھے۔ موٹر دروازے کے سامنے کھڑی تھی کہ دو کہار ڈولی لئے آتے ہوئے دکھائی دیئے۔ ڈولی کے پیچھے ایک بوڑھا ضعیف آدمی لاٹھی ٹیکتا ہوا چلا آتا تھا۔ ڈولی مطب کے سامنے آکر رک گئی۔ بوڑھے نے دھیرے دھیرے دروازہ پر آکر اندر جھانکا، ایسی صاف ستھری زمین پر اُسے پیر رکھتے ہوئے ڈر معلوم ہوتا تھا کہ کوئی چلّا نہ دوڑے

ڈاکٹر صاحب نے چق کے اندر سے گرج کر کہا، کون ہے کیا چاہتا ہے؟"

بوڑھے نے ہاتھ باندھکر کہا۔ "ہجور بڑا غریب آدمی ہوں، میرا لڑکا کئی دن سے .....

ڈاکٹر نے سگار جلاتے ہوئے کہا۔ کل سویرے آؤ، سویرے ہم اس وقت مریضوں کو نہیں دیکھتے۔

بوڑھے نے گھٹنے ٹیک کر زمین پر سر رکھدیا اور بولا۔ دُہائی ہے سرکار کی، ہجور لڑکا مرجائے گا، چار دن سے آنکھیں .....

ڈاکٹر نے کلائی پر نظر ڈالی، چھ بجنے میں صرف ۱۰ منٹ باقی تھے، گولف اسٹک ہاتھ میں لیتے ہوئے بولے، کل سویرے آؤ، ہم کھیلنے جاتا ہے۔

بوڑھے نے پگڑی اُتار کر چوکھٹ پر رکھدی اور رو کر بولا، ہجور ایک نگاہ دیکھ لیں، لڑکا ہاتھ سے چلا جائیگا سات لڑکوں میں یہی ایک بچ رہا ہے ہجور، ہم دونوں آدمی روروکر مرجائیں گے۔

ڈاکٹر نے چلمن اٹھائی اور موٹر کی طرف چلے، بوڑھا پیچھے پیچھے یہ کہتا ہوا دوڑا۔ سرکار بڑا دھرم ہوگا، ہجور دیا کیجئے۔ مگر ڈاکٹر صاحب مطلق مخاطب نہ ہوئے۔ موٹر پر بیٹھکر بولے "کہدیا کل سویرے آؤ۔"

موٹر چلی گئی، بوڑھا کئی منٹ تک سکتے کے عالم میں کھڑا رہا، دنیا میں ایسے انسان بھی ہوتے ہیں شاید اُسے اب بھی یقین نہ آتا تھا۔ پھر اُس نے کہاروں سے ڈولی اُٹھانے کو کہا۔ یہ غریب چاروں طرف سے مایوس ہوکر چڈھا کے پاس آیا تھا، اُن کی بڑی تعریف سُنی تھی، یہاں سے جواب پاکر پھر وہ کسی اور ڈاکٹر کے پاس گیا قسمت ٹھونک لی۔

اُسی رات کو اُس کا سات سال کا ہنستا کھیلتا بچہ دنیا سے رخصت ہوگیا۔
بوڑھے ماں باپ ہاتھ ملکر رہ گئے۔ زندگی کا یہی ایک سہارا تھا، اسی بچہ کا منہ دیکھکر دونوں جیتے تھے، اب دنیا اُن کے لئے تاریک ہوگئی!

(۲)

کئی سال گذر گئے، ڈاکٹر چڈھا کی ثروت اور شہرت ماہ نو کی طرح بڑھتی گئی، اور صحت تو اُن کی بے مثال تھی یہ اُن کی پابندیِ اوقات کا نتیجہ تھا کہ پچاس سال کے سن میں بھی اُن کی چستی و جفاکشی جوانوں کو شرمندہ کرتی تھی، اکثر لوگ صحت کے قواعد کی پابندی اس وقت کرتے ہیں جب صحت زائل ہوچکی ہوتی ہے۔ ڈاکٹر چڈھا علاج اور انسداد کے راز کو خوب سمجھتے تھے، ورنہ ڈاکٹری کیوں ہوتے۔ یقین اولاد بھی اُنھیں قواعد میں تھا، اُن کے صرف دو لڑکے ہوئے، ایک لڑکی اور ایک لڑکا، تیسری اولاد نہ ہوئی۔ چنانچہ شریمتی چڈھا کی صحت میں بھی کسی قسم کا ضعف نہ تھا۔ دونوں لڑکے صحت اور زندہ دلی کے پتلے تھے۔ لڑکی کی تو شادی ہوچکی تھی۔ لڑکا کالج میں پڑھ رہا تھا، سبزہ آغاز نوجوان تھا، مردانہ حسن کا اعجاز، ذہانت کا پتلا، تحریر و تقریر میں یونیورسٹی کا مایۂ ناز۔ چہرہ سے نور برستا تھا، ہر ایک دائرہ کا مرکزِ نگاہ، خوش گلو، خلیق، منکسر۔ آج اُس کی بیسویں سالگرہ تھی۔

رات کا وقت تھا، ہری ہری گھاس پر کرسیاں بچھی ہوئی تھیں، شہر کے رؤسا اور حکام ایک طرف، کالج کے طلبا دوسری طرف بیٹھے ہوئے دعوت کھا رہے تھے۔ بجلی کی روشنی سے سارا میدان برق قائم بنا ہوا تھا، تفریح کے سامان بھی جمع تھے، ایک چھوٹے سے فارس کھیلنے کی تیاری کی گئی تھی۔ فارس خود نوجوان چڈھا کی تصنیف تھی، وہی خاص ایکٹر بھی تھا، وہ اس وقت ایک ریشمی کرتہ پہنے، ننگے پاؤں، دوستوں کی خاطر و مدارات میں مصروف تھا۔ کوئی پکارتا چڈھا ذرا ادھر آنا، کوئی اُدھر سے پکارتا، چڈھا کیا اُدھری رہوگے؟

یکایک ایک حسینہ نے آکر کہا، کیوں کیلاش، تمہارے سانپ کہاں ہیں، ذرا مجھے بھی دکھادو۔

چڈھا نے ٹالتے ہوئے کہا۔ اس وقت معاف کرو مرنالنی، کل دکھادوں گا۔

مرنالنی نے ایک انداز سے ماتھا سکوڑ کر کہا، جی نہیں تمہیں دکھانا پڑیگا، میں نہیں ماننے کی، تم یوں ہی روز کل کل کرتے رہتے ہو۔

مرنالنی اور کیلاش دونوں ہم جماعت تھے، اور ایک دوسرے پر فدا، کیلاش کو سانپوں کو نچانے اور کھلانے کا شوق تھا۔ طرح طرح کے سانپ پال رکھے تھے، اُن کے عادات و خواص کا مطالعہ کرتے رہتے تھے۔ سانپوں پر تھوڑے دن ہوئے انھوں نے یونیورسٹی کلب میں ایک نہایت دلچسپ تقریر کی تھی، اور سانپوں کو نچا کر دکھایا تھا

ایک بوڑھے سپیرے سے اس نے یہ فن سیکھا تھا۔ سانپوں کی کتنی ہی جڑی بوٹیاں اُس نے جمع کر رکھی تھیں۔ مرنالنی کا اصرار بے موقع تھا۔ سانپوں کے کمرہ میں بہت ہجوم ہو جائیگا، اس لئے وہ ٹال رہا تھا، اور شاید مرنالنی مان بھی جاتی، مگر دوستوں کو چین کہاں؟ ایک صاحب بولے، دکھا کیوں نہیں دیتے بھئی، ایک ذرا سی بات کے لئے اتنا ٹال مٹول کر رہے ہو، مرنالنی ہرگز نہ مانا، دیکھوں یہ حضرت کیسے نہیں دکھاتے۔ دوسرے صاحب بولے، مس مرنالنی اس قدر سیدھی اور بھولی ہیں جبھی آپ اتنا مزاج کرتے ہیں، دوسری ہوتی تو اسی بات پر بگڑ کھڑی ہوتی۔ تیسرے صاحب نے فرمایا "اجی بولنا چھوڑ دیتی، صورت نہ دیکھتی، اس پر آپ کو دعویٰ ہے کہ مس مرنالنی کے لئے جان حاضر ہے۔

مرنالنی نے اِن شہدوں کی طرف تمسخر کی نگاہوں سے دیکھکر کہا، آپ لوگ میری وکالت نہ کریں، مَیں اِس وقت نہیں دیکھنا چاہتی، چلو چھٹی ہوئی۔

اِس پر دوستوں نے قہقہہ لگایا، ایک صاحب بولے، دیکھنا تو آپ سب چاہیں لیکن کوئی دکھائے بھی۔

کیلاش کو مرنالنی کے بشرے سے معلوم ہوا کہ اِس وقت اسکا انکار ناگوار گذرا۔ جونہی دعوت ختم ہوئی اور گانا شروع ہوا اُس نے مرنالنی اور چند احباب کو سانپوں کے دربے کے سامنے لے جاکر مہور بجانا شروع کیا۔ پھر ہر ایک خانے کو کھول کھول کر ایک ایک سانپ نکالنے لگا۔ واہ! کیا کمال تھا، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ یہ کیڑے اُس کی ایک ایک بات کو سمجھتے ہیں۔ کسی کو ہاتھوں میں اٹھا لیا، کسی کو گردن میں ڈال لیا، کسی کو ماتھے کے گرد لپیٹ لیا، مرنالنی بار بار منع کرتی تھی، اِنھیں گردن میں نہ ڈالو۔ دُور ہی سے دکھا دو۔ بس ذرا نچا دو۔ کیلاش کی گردن میں سانپوں کو لپٹتے دیکھکر اُس کی جان نکلی جاتی تھی۔ افسوس کر رہی تھی کہ میں نے ناحق انھیں چھیڑا۔ مگر کیلاش ایک نہ سنتا تھا معشوقہ کے روبرو اپنے کمال کے اظہار کا ایسا موقعہ پاکر کون چوکتا ہے۔

ایک صاحب بولے۔ دانت تو توڑ ہی ڈالے ہوں گے۔

کیلاش نے ہنسکر کہا، جی نہیں بندہ نواز۔ دانت توڑنا مداریوں کا کام ہے، کسی کے دانت نہیں توڑے گئے، کہئے تو دکھا دوں۔

یہ کہکر اُس نے ایک کالے سانپ کو پکڑ لیا اور بولا۔ میرے پاس اِس سے بڑا اور زہریلا دوسرا جانور نہیں ہے، اگر کسی کو کاٹ لے تو آناً فاناً آدمی مر جائے، اسکا کوئی علاج نہیں، دکھا دوں اسکے دانت!

مرنالنی نے اُسکا ہاتھ پکڑ کر کہا، نہیں، نہیں کیلاش۔ ایشور کے لئے اسے چھوڑ دو۔ تمہارے پیروں پڑتی ہوں

اِس پر ایک دوسرے مہربان بولے، مجھے یقین تو نہیں آتا، مگر چونکہ تم کہتے ہو اِس لئے مان لیتا ہوں۔

کیلاش نے سانپ کی گردن پکڑ کر کہا۔ نہیں صاحب آپ آنکھوں سے دیکھ لیجئے تب مانیئے۔ دانت توڑ کر قبضہ

میں کیا تو مجھ میں اور مداریوں میں فرق ہی کیا رہا۔ سانپ بڑا سمجھدار ہوتا ہے، اگر اُسے یقین ہو جائے کہ اس آدمی سے مجھے کوئی گزند نہ پہونچے گا تو وہ اُسے ہرگز نہ کاٹے گا، دانت اُسکا آلہ نعمت ہے۔

مرنالنی نے دیکھا کیلاش پر اس وقت جنون سوار ہے تو اُس نے یہ تماشا ختم کرنے کو کہا اور بولی اب یہاں سے چلو دیکھو باہر گانا شروع ہو گیا۔ آج میں بھی کوئی چیز سناؤں گی، یہ کہکر اُس نے کیلاش کا کندھا پکڑ کر چلنے کا اشارہ کیا۔ اور کمرہ سے چلی گئی۔ مگر کیلاش معترضوں کو خاموش کر کے ہی دم لینا چاہتا تھا۔ اُس نے سانپ کی گردن پکڑ کر اتنے زور سے دبائی کہ اُس کا چہرہ سُرخ ہو گیا، جسم کی ساری رگیں تن گئیں۔ سانپ نے ابتک اُس کے ہاتھوں اس قسم کا بیرحمانہ برتاؤ نہ دیکھا تھا۔ اُس کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ یہ مجھ سے کیا چاہتے ہیں اُسے شاید خیال ہوا کہ یہ مجھے مار ڈالنا چاہتے ہیں۔ اپنی محافظت کے لئے آمادہ ہو گیا، کیلاش نے اُس کی گردن دبا کر اُسکا منہ کھولدیا، اور اُس کے دانت دکھاتے ہوئے بولا۔ جن صاحبوں کو شبہ ہو آکر دیکھ لیں، آیا یقین؟ یا اب بھی شک ہے؟

دوستوں نے قریب آکر اس کے دانت دیکھے اور کیلاش کے کمال کا اعتراف کرنے لگے۔ عینی شہادت کے سامنے شبہ کی گنجایش کہاں، اُن کا اطمینان کر کے کیلاش نے سانپ کی گردن ڈھیلی کر دی اور اُسے زمین پر رکھنا چاہا مگر وہ کالا گیہوں غضبناک ہو رہا تھا، گردن نرم پڑتے ہی اُس نے سر اُٹھا کر کیلاش کی انگلی میں زور سے کاٹا اور وہاں سے بھاگا، انگلی سے ٹپ ٹپ خوں ٹپکنے لگا۔ کیلاش نے فوراً زور سے انگلی دبالی اور اپنے کمرہ کی طرف دوڑا۔ اُس کی میز کی دراز میں ایک جڑی رکھی ہوئی تھی جس کے استعمال سے قاتل زہر بھی رد ہو جاتا تھا۔ دوستوں میں ہلچل مچ گئی، ڈاکٹر صاحب مدحواس ہو کر دوڑے، وہ جڑی بوٹی کے قائل نہ تھے۔ انگلی کو جڑ سے کاٹ دینا چاہتے۔ پر کیلاش کو جڑی پر کامل اعتقاد تھا، فوراً جڑی پیسی گئی اور انگلی پر اس کا لیپ کیا گیا۔ کیلاش تو مطمئن ہو کر باقی سانپوں کو درے میں بند کرنے لگا، مگر ڈاکٹر صاحب اور دوسرے احباب پریشان تھے۔ مرنالنی پانو چھوڑ کر دوڑی آئی تھی وہ بار بار ڈاکٹر صاحب سے کہتی آپ نشتر لگا دیجئے، مگر ڈاکٹر صاحب تذبذب کی حالت میں پڑے ہوئے تھے مشکل سے پندرہ منٹ گذرے ہونگے کہ کیلاش کو سر میں چکر سا محسوس ہوا اور دیکھتے دیکھتے اسکے چہرہ کا رنگ زرد پڑنے لگا، مگر ابھی تک وہ ضبط کئے کھڑا تھا اور سب سے کہتا تھا آپ لوگ اندیشہ نہ کریں میں بالکل اچھا ہوں۔ ڈاکٹر صاحب گو خاموش کھڑے تھے پر کیلاش کے چہرہ کا اڑتا ہوا رنگ دیکھکر انکا دل بیٹھا جاتا تھا۔ آخر نہ رہا گیا، وہ جلدی سے مطب میں آ گئے اور کئی چیزیں ایک گلاس میں ملا کر لائے کیلاش نے ایک بیغرضانہ انداز سے گلاس لے لیا اور منہ میں لگانا ہی چاہا تھا کہ اس کی آنکھوں میں اندھیرا چھا گیا، گلاس ہاتھ سے چھوٹ کر گر پڑا۔ وہ وہیں زمین پر لیٹ گیا اور ہاتھ سے پنکھا جھلنے کا اشارہ کیا۔ میز کا پنکھا لگا دیا گیا اور تیز ہوا چلنے لگی، مرنالنی نے دوڑ کر اس کا سر اپنی گود میں رکھ لیا اور بھرائی ہوئی آواز

میں بولی، کیلاش کیسی طبیعت ہے؟ کیلاش نے ہاتھ اوپر اُٹھا دیا، پھر منہ سے کچھ نہ بول سکا۔

مسز چڈھا نے بگڑ کر شوہر سے کہا۔ کھڑے منہ کیا تاک رہے ہو، کوئی چیز دیتے کیوں نہیں؟

مرنالنی نے کہا۔ ماں دیکھئے، ان کا چہرہ کیسا ہوا جاتا ہے۔

چڈھا نے پچھتا کر کہا۔ کیا بتلاؤں، مَیں اسکی باتوں میں آگیا، اب تو نشتر سے بھی کچھ فائدہ نہ ہوگا۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا کیا کروں۔

یہ کہتے ہوئے انھیں کچھ خیال آگیا، پھر دوڑے ہوئے مطب میں گئے، اور کوئی مرکب بنا کر لائے، بڑی مشکل سے کیلاش کا منہ کھولا گیا اور دوا ڈالی گئی۔ مگر زہر اتنا قاتل تھا کہ دوبارہ لہر نہ آئی، دوا کا کچھ اثر نہ ہوا۔ آدھ گھنٹہ بھی نہ گذرا تھا کہ کیلاش کے ہاتھ پاؤں ٹھنڈے پڑ گئے، چہرہ سفید ہوگیا، نبض کا کہیں پتہ نہیں، موت کی ساری علامتیں نمودار ہوگئیں۔ گھر میں کہرام مچ گیا، مرنالنی ایک طرف سر پیٹنے لگی، ماں الگ پچھاڑیں کھانے لگی، اور ڈاکٹر چڈھا تو ایسے بدحواس ہوگئے کہ اگر دوستوں نے پکڑ لیا ہوتا تو شاید اپنے گلے پر نشتر چلا لیتے۔

ایک صاحب بولے، کوئی منتر جھاڑنے والا مل جائے تو ممکن ہے اب بھی جان بچ جائے

دوسرے صاحب نے فرمایا، ارے صاحب قبر سے نکلی ہوئی لاشیں زندہ ہوگئی ہیں، ایسے ایسے باکمال پڑے ہوئے ہیں

چڈھا نے سر پر ہاتھ رکھکر کہا، میری عقل پر پتھر پڑ گیا تھا، کہ اسکی باتوں میں آگیا، نشتر لگا دیتا تو یہ نوبت کیوں آتی

بار بار سمجھاتا رہا کہ بیٹا سانپ نہ پالو، جان کا خطرہ ہے، مگر میری کون سنتا تھا۔ بلائیے، کسی جھاڑنے والے کو بلائیے، میرا سب کچھ لے لے، میں اپنی ساری جائداد اس کے پیروں پر رکھ دونگا، لنگوٹی باندھکر گھر سے نکل جاؤں گا، مگر میرا کیلاش میرا لختِ جگر اٹھ بیٹھے۔ ایشور کے لئے بلائیے، مجھ پر رحم کیجئے۔

بنگلہ سے کچھ دور پر کئی گوالے رہتے تھے، اُن میں سے ایک سانپ کا منتر جانتا تھا۔ اُس نے آکر کئی بار منتر پڑھا کئی بار کیلاش کے کان میں چلایا، پھر پچاسوں گھڑے پانی اوس کے اوپر ڈلوائے۔ پر بازیافت کی کوئی علامت نہ دیکھکر مایوس چلا گیا۔ ایک دو منتر والے اور بھی آئے، ان سبھوں نے بھی منتر پڑھے۔ دوائیں پلائیں، سونگھائیں، نہلایا، شور مچایا مگر کوئی نتیجہ نہ دیکھکر رخصت ہوگئے۔ چوتھے نے آکر کیلاش کی صورت دیکھتے ہی کہا، اب میں کیا منتر پڑھوں سرکار، جو کچھ ہونا تھا ہو چکا۔

ظالم! یہ کیوں نہیں کہتا کہ جو کچھ نہ ہونا تھا ہو چکا، جو کچھ ہونا تھا وہ کہاں ہوا، ماں باپ نے بیٹے کا سہرا کہاں دیکھا، مرنالنی کو آغوشِ محبت میں بیٹھنا کہاں نصیب ہوا، زندگی کے وہ سنہرے خواب جنسے زندگی نوبہار ہو جاتی تھی کیا پریشان نہیں ہوگئے تمناؤں کی زرنگار رنگیلیوں میں لطفِ سیر اٹھاتے ہوئے کیا انکا بجرا غرقاب نہیں ہوگیا، جو ہونا تھا وہ کہاں ہوا

جو کچھ نہ ہونا تھا وہ البتہ ہوگیا۔

وہی نورانی سبزہ زار تھا۔ وہی سنہری چاندنی ایک نغمۂ خاموش کی طرح منظر پر چھائی ہوئی تھی۔ وہی مجمع احباب تھا وہی تفریح کے سامان تھے۔ مگر اب اُن پر تارے ماتم کرتے تھے اور شبنم آنسو بہاتی تھی۔ بارات وہی تھی، پر دولھا رخصت ہوگیا تھا۔

(۳)

ایک چھوٹے سے کچے مکان میں ایک بوڑھا اور ایک بڑھیا انگیٹھی کے سامنے بیٹھے جاڑے کی رات کاٹ رہے تھے۔ انگیٹھی میں آگ نہ تھی، صرف من کو بہلانے کا ایک سامان تھا۔ زمین پر پڑی ہوئی پوال اور دو تار کمل خوش آیند نیند کے ضامن نہ ہوسکتے تھے۔ انگیٹھی میں کم سے کم گرم راکھ تو تھی۔ دونوں خاموش تھے، دونوں صبر کے پُتلے۔ اور صبر بھی کیسا؟ بے عذر، اُن کی زبان پر نہ زمانہ کا شکوہ تھا، نہ مرنے والوں کا ذکرِ غم! اُن کا سارا وقت مصافِ حیات میں صرف ہوتا تھا۔ موت دروازہ پر کھڑی دستک دے رہی تھی، باتوں کی کہاں فرصت، فردا ہی نہ تو غم کس کا۔

بُڑھیا نے بڑی دیر کے بعد پوچھا۔ کل کے لئے سَن تو ہے ہی نہیں، کیا ہوگا؟

جا کر جھگڑو ساہ سے اُدھار لاؤنگا۔

اُس کے پہلے کے پیسے تو ابھی دیے ہی نہیں، اُدھار نہ دیگا۔

نہ دیگا نہ سہی، گھاس تو کہیں نہیں گئی ہے، دوپہر تک کیا دو آنہ کی بھی نہ چھیل سکونگا، اور کیا کرنا ہے۔

اتنے میں ایک آدمی نے دروازہ پر آواز دی۔ بھگت، کیا سو گئے کیا؟ ذرا کواڑ کھولو، میں ہوں منگلی۔

بھگت نے اُٹھکر دروازہ کھولدیا۔ منگلی نے کوٹھری میں آکر کہا۔ کچھ سُنا۔ چڈھا بابو کے لڑکے کو سانپ نے کاٹ لیا؟

بھگت نے چونک کر سر اٹھایا، چڈھا بابو کے لڑکے کو؟ وہی چڈھا بابو ہیں نہ جو بنگلے میں رہتے ہیں، پورپ طرف؟

منگلی نے کہا۔ ہاں ہاں رہی، نامی آدمی ہیں۔ چاروں اور ہلّا مچا ہوا ہے۔ جاتے ہو وہاں؟ آدمی بن جاؤگے!

بوڑھے نے بیرحمانہ انداز سے سر ہلا کر کہا۔ میں نہیں جاتا، میری بلا جائے، وہی چڈھا ہیں، کھوب جانتا ہوں، آدمی نہیں کسائی ہے، آج آٹھ سال ہوئے.....

بڑھیا نے تصحیح کی، نواں لگا ہے۔

بوڈھا۔ ہاں نواں سال ہے، میں پتا کو لیکر دکھانے گیا تھا، کھیلنے جا رہے تھے، پیروں پر گر پڑا کہ ایک نظر دیکھ لیجئے، مگر اُس نے بات تک نہ سُنی۔ بھگوان بیٹھے سُن رہے تھے، اب معلوم ہوگا کہ بیٹے کا غم کیسا ہوتا ہے۔ کئی

لڑکے ہیں ؟

منگلی۔ نہیں جی، یہی تو ایک لڑکا ہے۔ سنا ہے سب لوگوں نے جواب دیدیا۔ گنگو گوالا، مدّو بہنا، سُنے مصر سب ہار کر چلے آئے۔

بوڑھا۔ بھگوان بڑا کارساج ہے۔ ارے تم سے کیا کہوں، اس کے پیروں پر گر گر دیا، اس کے پیروں پر پگڑی اتار کر رکھدی۔ مگر اسے جرا بھی دیا نہ آئی۔ میں تو اسکے دروازے پر ہوتا تب بھی بات نہ پوچھتا، ایسے لوگوں کی یہی سزا ہے۔

منگلی۔ تو نہ جاؤ گے ؟ ہم نے تو سنا تھا تم سے کہہ دیا۔

بوڑھا۔ بہت اچھا کیا، سنکر کلیجہ ٹھنڈا ہوگیا، آنکھیں ٹھنڈی ہوگئیں۔ تم جاؤ، آج چین کی نیند سوؤنگا۔ (بڑھیا سے) جرا تماکو لے لے، ایک چلم اور پیونگا۔ اب معلوم ہوگا لالہ کو، ساری صاحبی بھول جائیگی، ہمارا کیا بگڑا، کچھ لڑکے کے مرجانے سے راج تو نہیں چلا گیا، تمہارا تو راج سونا ہوجائے گا۔ اسی لڑکے کے واسطے سب کا گلا دبا دبا کر دھن جوڑا تھا نہ۔ اب کیا کروگے ؟

منگلی چلا گیا، بھگت نے چلم اٹھالی اور پڑوس کے حلوائی کی بھٹی سے آگ رکھ لایا، پھر کواڑ بند کرکے اطمینان سے چلم پینے لگا۔

بڑھیا نے کہا۔ اتنی رات گئے جاڑے پالے میں نیچنے آیا تھا، موئے کو شرم بھی نہ آئی۔

بوڑھا۔ رات نہیں دوپہر بھی ہوتی تو میں نہیں جاتا۔ اُس کی سواری دروازے پر آتی تو بھی نہ جاتا۔ بھول نہیں گیا ہوں، پتا کی صورت آنکھوں میں پھر رہی ہے۔ اس نرموہی نے ایک نجر بھی تو نہیں دیکھا۔ کیا میں نہ جانتا تھا کہ وہ نہ بچے گا ؟ کھوب جانتا تھا، وہ بھگوان نہیں تھا کہ اسکے ایک نجر دیکھ لینے سے امرت برس جاتا۔ نہیں کھالی من کی دوڑ تھی۔ جرا تسکین ہوجاتی۔ بس اسی لئے اُس کے پاس دوڑا گیا تھا۔ اب کسی دن پھر جاؤنگا، اور کہونگا۔ کیوں صاحب ! کہئے کیا رنگ ہے ؟ دنیا مجھے بڑا کہیگی، کہے، کوئی پروا نہیں۔ چھوٹے آدمیوں میں تو سب عیب ہوتے ہی ہیں، بڑوں میں کوئی عیب نہیں ہوتا، وہ دیوتا ہوتے ہیں.....

اسی سال کی عمر میں بھگت کے لئے یہ پہلا موقعہ تھا کہ ایسے ساہنے کی خبر سُنکر بھی وہ گھر سے باہر نہیں نکلا۔ ماگھ پوس کی اندھیری رات، بھیٹھ بیساکھ کی دھوپ اور لو، ساون بھادوں کے موسلا دھار مینہ، کسی کی اس نے کبھی پروا نہ کی۔ وہ فوراً گھر سے نکل پڑتا تھا، بے منت، بے غرض، معاوضہ کا خیال کبھی دل میں آیا ہی نہیں، نہ کبھی کسی نے کچھ دیا ہی۔ یہ معاوضہ کا کام ہی نہ تھا۔ جان کا کیا معاوضہ۔ یہ ایک کارِ ثواب تھا، اُسے جو دیا

آتی تھی اسکا لازمی استعمال سیکڑوں مایوسوں کو اس کے منتروں نے زندگی عطا کردی تھی، پر آج وہ گھر سے باہر قدم نہیں نکال سکتا۔ اپنے کانوں سے یہ خبر سنکر بھی اطمینان سے سونے کی کوشش کر رہا ہے۔

بڑھیا نے کمل اوڑھکر لیٹتے ہوئے کہا۔ تماکھو کے ڈھائی پیسے ہوگئے۔ آج دیتی ہی نہ تھی۔

بھگت نے کچی تجائی اور کچھ دیر کھڑا رہا، پھر بیٹھ کر کچھ سوچتا رہا، بعدازاں لیٹ گیا، یہ خبر اُس کے جگر پر بوجھ کی طرح لکھی ہوئی تھی۔ اُسے معلوم ہوتا تھا اُسکی کوئی چیز کھوگئی ہے۔ جیسے سارے کپڑے گیلے ہوگئے ہیں، یا پیروں میں کیچڑ لگا ہوا ہے، جیسے کوئی اُسکے دل کے اندر بیٹھا ہوا اُسے گھر سے نکلنے کے لئے تحریک کر رہا ہے۔ بڑھیا ذرا دیر میں خراٹے لینے لگی۔ بوڑھے بولتے بولتے سوجاتے ہیں اور چوہے کا بنگیا سنکر جاگ اُٹھتے ہیں۔ بھگت کو جب اطمینان ہوگیا کہ بڑھیا سوگئی ہے تو وہ اُٹھا، اپنی لکڑی ٹٹول کر اُٹھائی اور دھیرے سے کواڑ کھولے۔

بڑھیا چونک پڑی، بولی۔ کہاں جاتے ہو؟

'کہیں نہیں' دیکھتا تھا کتنی رات گئی ہے۔

'ابھی بہت رات ہے۔ سوجاؤ'

'نیند نہیں آتی'

'نیند کا ہیکو آئیگی، من تو چڈھا بابو کے گھر پر لگا ہوا ہے'

چڈھا بابو نے میرے ساتھ ایسی کونسی نیکی کردی ہے جو وہاں جاؤں، وہ آکر پیروں پڑیں تب بھی نہ جاؤں'۔

مانو چاہے نہ مانو، پر تم اُٹھے اسی ارادہ سے تھے۔

نہیں رے، ایسا پاگل نہیں ہوں کہ جو مجھے کانٹے بوئے اسکے لئے پھول بوتا پھروں۔

بڑھیا پھر سوگئی، بھگت نے کواڑ لگا دیئے اور پھر آکر بیٹھا۔ مگر اس کے دل کی حالت اُس کتے کی سی ہو رہی تھی جو رات کو کسی اجنبی کی آہٹ پاکر مالک کے منع کرنے پر بھی بھونکنا نہیں چھوڑتا، زور سے چاہے نہ بھونکے مگر آہستہ آہستہ غرّاتا رہتا ہے۔ بھگت کا نفس اُسے اپنی پوری طاقت سے روک رہا تھا پر اُسکے وجود کا ایک ایک ذرہ ہوا کے جھونکے سے اُڑے ہوئے پتے کی طرح اُس بدنصیب نوجوان کی طرف اڑا جا رہا تھا جو اس وقت مر رہا تھا۔ اور جس کے لئے ایک ایک لمحہ کی دیر یا یافت کے امکان کو اور دُور ٹال رہی تھی۔

اُس نے پھر کواڑ کھولے، اتنے آہستہ سے کہ بڑھیا کو خبر نہ ہوئی۔ باہر نکل آیا، اُسی وقت محلہ کا چوکیدار گشت لگا رہا تھا۔ بولا کیسے اُٹھے بھگت آج تو بڑی سردی ہے۔ کہیں جا رہے ہو کیا؟

بھگت نے کہا۔ نہیں جی جاؤنگا کہاں، دیکھتا تھا کہ ابھی کتنی رات ہے، بھلا کے بجے ہونگے؟

ایک بجا ہوگا اور کیا، ابھی تھانے سے آرہا تھا تو چڈھا کے بنگلے پر بڑی بھیڑ لگی تھی، اُن کے لڑکے کا حال تو تم نے سُنا ہوگا۔ کالے نے چھو لیا ہے، چاہے مرجھی گیا ہو، تم چلے جاؤ تو ساعت بچ جائے۔ سنا دس ہجار تک دینے کو تیار ہیں۔ نہ دس ہجار دیں گے دس سو تو دینگے۔'

'میں تو نہ جاؤنگا چاہے وہ دس لاکھ بھی دیں، مجھے دس ہجار لیکر کرنا ہی کیا ہے۔ کل کو مرجاؤنگا تو کون بھوگیگا میں تو اُنکے دروازے پر ہوتا تب بھی نہ جاتا۔ ایسے بیدردوں کی سجا یہی ہے۔'

چوکیدار چلا گیا۔ بھگت نے آگے پیر بڑھائے، جیسے کسی مخمور آدمی کا اپنے فعلوں پر قابو نہیں ہوتا، وہ کہتا کچھ ہے، زبان سے نکلتا کچھ ہے، وہ اپنی دانست میں پاؤں سنبھال کر رکھتا ہے پر وہ لغزش کرتے ہیں، وہی حالت بھگت کی تھی۔ نفس انتقام پر تلا ہوا تھا، پر عمل پر اُسکا قابو نہ تھا۔ جس نے کبھی تلوار نہیں چلائی وہ ارادہ کرنے پر بھی تلوار نہیں چلا سکتا اُس کے ہاتھ کانپتے ہیں۔

دو میل کا راستہ تھا، بھگت لاٹھی کھٹ کھٹ کرتا چلا جاتا تھا، ادراک ثانی اولیٰ پر حاوی تھا۔ اولیٰ روکتا تھا، ثانی ٹھیلتا تھا۔ آدھا راستہ طے ہوجانے پر یکایک بھگت رُک گیا۔ نفس نے قوتِ عمل پر فتح پائی۔ ارے! میں اتنی دُور چلا آیا! اس جاڑے پالے میں مجھے مرنے کی ضرورت کیا تھی، آرام سے پڑا کیوں نہ رہا، نہ نیند آتی دو چار بھجن ہی گاتا ناحق اتنی دور دوڑا، چڈھا کا لڑکا رہے یا جائے، میری بلا سے، مجھے کیا کرنا ہے، دنیا میں ہزاروں مرتے ہیں، ہزاروں جیتے ہیں۔ مجھے کسی کے مرنے جینے سے مطلب، جس نے میرے ساتھ وزا بھی ساوک نہیں کیا، اس کے ساتھ میں کیوں سلوک کروں؟

مگر نفس کی یہ فتح عارضی تھی، وہ ادراک ثانی جو اُسے اتنی دور لایا تھا ایک دوسری ہی صورت میں نمودار ہوا جو نفس سے بہت مشابہ تھا۔

'میں وہاں کچھ سانپ کا منتر پڑھنے تھوڑا ہی جارہا ہوں، ذرا دیکھونگا لوگ کیا کرتے ہیں، ذرا ڈاکٹر صاحب کا رونا پیٹنا دیکھونگا، کس طرح سر پیٹتے ہیں، کس طرح پچھاڑیں کھاتے ہیں۔ ذرا دیکھونگا بڑے لوگ بھی ہمیں لوگوں کی طرح روتے ہیں، یا صبر کرجاتے ہیں۔ وہ لوگ تو دوّان ہوتے ہیں، من میں سمجھکر رہ جاتے ہونگے۔'

اس طرح نفس کو دھوکا دیتا ہوا، شیطان کو بہکاتا ہوا وہ چلا جارہا تھا کہ دو آدمی راستہ سے گذرے، دونوں میں ڈاکٹر چڈھا ہی کا ذکر ہو رہا تھا۔ ایک نے کہا چڈھا بابو کا گھر اُجڑ گیا، دوسرا بولا، کُسل بھی ہے کہ ابھی بیاہ نہیں ہوا تھا بھگت کی چال اور بھی تیز ہوگئی، ضعف کے مارے قدم نہ اُٹھتے تھے، مگر ہمت ہوا سے باتیں کر رہی تھی۔ سر کا حصہ آتا گیا بڑھتا جاتا تھا گویا اب منہ کے بل گر پڑیگا، اس طرح کوئی بیس منٹ چلا ہوگا کہ ڈاکٹر صاحب کا بنگلہ نظر آیا۔ بجلی کی بتیاں روشن تھیں

گرسناٹا چھایا ہوا تھا، نالہ وشیون کی صدائیں بھی نہ سنائی دیتی تھیں۔ اس کا کلیجہ دھک دھک کرنے لگا، کہیں دیر تو نہیں ہوگئی۔ وہ دوڑنے لگا، اپنی عمر میں وہ اتنا تیز کبھی نہ دوڑا تھا، بس یہی معلوم ہوتا تھا گویا اس کے پیچھے موت دوڑی آرہی ہے۔

(۴)

کیلاش بیجان پڑا ہوا تھا جسم ٹھنڈا ہوگیا تھا، ہونٹ سیاہ پڑ گئے تھے۔ زندگی کی کوئی علامت باقی نہ تھی، مگر کوئی بند آواز سے نہ روتا تھا۔ گریۂ خاموش ڈوبنے والی امید کی آخری شعاع تھی۔

یکایک بھگت نے برآمدہ میں پہونچکر پکارا۔ ڈاکٹر صاحب نے سمجھا کوئی مریض آیا ہوگا، کسی اور وقت انھوں نے اس آدمی کو دتکار دیا ہوتا۔ رات کے وقت وہ کسی مریض کو نہ دیکھتے تھے۔ مگر آج وہ فوراً گھر میں سے نکل آئے اور رقت آمیز انداز سے بولے، کیا ہے بھئی، آج تو ہمارے اوپر ایسی مصیبت آپڑی ہے کہ کچھ کہتے نہیں بنتا، پھر کبھی آنا۔

بھگت نے کہا، سب حال سُن چکا ہوں بابو صاحب، اسی لئے تو آیا ہوں۔ جرا میں بھی دیکھ لوں، چھوٹے بھیا کہاں ہیں۔ بھگوان بڑا کارساج ہے، کون جانے اب بھی اُسے دیا آجائے۔

ڈاکٹر چڈھا نے مایوسانہ انداز سے کہا۔ اچھی بات ہے چلو دیکھ لو۔ تین چار گھنٹے ہوگئے ہیں، ہم تو نراس ہوگئے۔

بھگت نے اندر جا کر ایک منٹ تک لاش کو دیکھا۔ تب مُسکرا کر بولا، ابھی کچھ نہیں بگڑا ہے بابو جی، واہ بھگوان چاہیں گے تو آدھ گھنٹہ میں بابو جی اُٹھ بیٹھیں گے۔ جرا کہاروں سے کہئے پانی تو بھریں۔

بوڑھے کا لہجہ اتنا یقین انگیز تھا کہ ڈاکٹر صاحب کو بھی کچھ امید پیدا ہوگئی۔ بولے، بوڑھے بابا بس یہی سمجھ لیجئے کہ ہم سب عمر بھر آپ کے غلام بنے رہیں گے۔ اس لڑکے پر ہم اپنا سب کچھ نچھاور کرنیکو تیار ہیں۔

مسز چڈھا نے ہاتھ باندھکر کہا۔ دادا، یہی ہماری جنم بھر کی کمائی ہے، بس اور کیا کہوں۔

بوڑھے بھگت کے پاس ایک ایسی جڑی تھی کہ سانپ کیسا ہی زہریلا ہو اُسکا زہر زائل ہوجاتا تھا۔ اس جڑی کے ساتھ ہی وہ ایک منتر بھی پڑھتا تھا۔ اس منتر میں کچھ ایسی تاثیر تھی کہ پہلے ہی دم میں مارگزیدہ کی آنکھیں کھلجاتی تھیں۔ بھگت کو اپنے رَدِّ زہر کی طاقت پر پورا اعتماد تھا۔ آج تک اُسے کبھی ناکامی نہوئی تھی، اس لئے وہ اس قسم کی خبر پاتے ہی اضطراری طور پر گھر سے نکل پڑتا تھا۔ وہ آدھ گھنٹہ تک کھڑا منتر پڑھتا رہا۔ ایکبار منتر ختم ہوجانے پر وہ کیلاش کو جڑی سونگھا دیتا تھا، ادھر کہار لوگ کیلاش کے سر پر پانی انڈیلتے چلے جاتے تھے، دو بجتے بجتے کیلاش نے آنکھیں کھولدیں اور اُٹھ بیٹھا۔

بھگت نے پوچھا۔ بابو یہاں کسی کو پہچانتے ہو؟

کیلاش نے ادھر ادھر نظر دوڑا کر کہا۔ ہاں صاحب، سب کو پہچانتا ہوں، وہ پاپا ہیں، یہ ماما ہیں، وہ مزانی ہیں۔

مسز چڈھا بھگت کے پیروں پر گر پڑیں۔ ڈاکٹر چڈھا دوڑ کر کیلاش کے گلے سے لپٹ گئے، چاروں طرف سے احباب نے مبارکباد دینا شروع کیا۔ بھیتر باہر ہلچل مچ گئی۔ کمرہ میں دوستوں کا ایسا ہجوم ہوا کہ تل رکھنے کی بھی جگہ نہ رہی۔ ہر شخص بھگت کے درشنوں کا مشتاق تھا۔ ڈاکٹر صاحب نے لپک کر اپنا سیف کھولا اور گنیوں سے بھری ہوئی ایک تھیلی نکال لائے۔ وہ اُسے بھگت کے پیروں پر رکھ دینا چاہتے تھے۔ مگر جب تھیلی لیکر کمرہ میں پہونچے تو بھگت کا کہیں پتہ نہ تھا۔ چاروں طرف بھگت کی تلاش ہونے لگی۔ کہاں گئے، کہاں گئے" ابھی تو یہیں کھڑے تھے، بھیتر باہر سب جگہ چھان ڈالی گئی، مگر بھگت کا کہیں پتہ نہ تھا۔

مسز چڈھا نے کہا کوئی دیوتا تھا۔

احباب نے کہا، ہاں معلوم تو ایسا ہی ہوتا ہے۔

پھر جشن شروع ہوا، نغمہ کی صدائیں بلند ہوئیں اور باجے بجنے لگے۔

پریم چند

اقوال بھرتری

سونے کے پہاڑ سے ہم کو کیا مطلب، اور چاندی کے کیلاش سے کیا واسطہ ان کے اوپر کھڑے ہوئے درخت جیسے کے تیسے ہی بنے رہتے ہیں ہم تو اس ملیاچل چندن کی عظمت کے قائل ہیں جس کی خوشبو سے نیم، ڈھاک، ببول وغیرہ کے درختوں میں بھی چندن کی خوشبو آنے لگتی ہے۔

دنیا میں وہی آدمی دیوتا ہے جو دوسروں کی بھلائی کے لئے اپنا نقصان برداشت کرے۔ معمولی انسان وہ ہے جو اپنا بھی بھلا چاہے اور دوسروں کا بھی خیر خواہ ہو۔ لیکن جو شخص دوسروں کو بیوجہ نقصان پہونچائے اُسے ہم نہیں کہہ سکتے کہ کس قسم کا انسان ہے۔

پہاڑوں اور جنگلوں میں جنگلی حیوانوں کے ساتھ پھرنا اچھا ہے مگر بیوقوفوں کے ساتھ بہشت میں بھی رہنا اچھا نہیں۔

شیام سندر لال نگم

باپ

ایک قصّہ

(از جناب سُدرشن صاحب)

(۱)

لالہ راجہ رام نے دفتر سے آتے ہی خشمگیں لہجہ میں اپنی بیوی سے کہا۔ "شادی نے آج پھر چوری کی"۔
کوشلیا لڑکی کے لئے کرتا سی رہی تھی۔ خاوند کی آواز سنکر اُس نے سر اٹھایا۔ اور حیرت سے بولی۔ "بڑا باجی لڑکا ہے، ہر روز مار کھاتا ہے، مگر اس کی آنکھیں نہیں کھلتیں۔ آج کیا چرایا ہے؟"
راجہ رام۔ کل رات جیب میں سوا روپیہ رکھا تھا۔ آج دفتر جا کر دیکھا، تو روپیہ تھا چونی نہ تھی۔ بس جناب کے ہاتھ لگ گئی ہوگی۔ کہاں ہے ذرا بلاؤ تو پوچھوں"
کوشلیا کا کلیجہ دھڑکنے لگا، اُس نے سمجھ لیا، کہ آج پھر لڑکے کی خیر نہیں۔ زبردستی مسکرا کر بولی، تم کپڑے تو بدل لو۔ دفتر سے تھک کر آئے ہو۔ آتے ہی غصہ کرو گے تو صحت خراب ہو جائیگی"
راجہ رام۔ تمہاری باتیں میں خوب سمجھتا ہوں، تم چاہتی ہو میں اُسے کچھ نہ کہوں، مگر یہ کبھی نہ ہوگا، میں آج اُس کی ہڈیاں توڑے بغیر نہ رہونگا۔ بولو کہاں ہے؟
کوشلیا: کہیں کھیلنے گیا ہے۔ ابھی آجاتا ہے۔ جلدی کیا ہے۔ جب آئے مار لینا۔
راجہ رام بس میں نے بات کی اور تمہیں زہر چڑھا۔
کوشلیا کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔ میں نے تمہیں کیا کہا ہے جو آتے ہی گرجنے لگے۔ تمہارا لڑکا ہے چاہے مارو، چاہے کاٹو۔ میری کیا مجال کہ اُف کروں۔
راجہ رام اتنا نہیں سوچتی کہ لڑکا ہاتھ سے نکل جائیگا، اسے ٹیڑھی نگاہ سے بھی دیکھوں تو رونے لگتی ہو۔
کوشلیا نے کوئی جواب نہیں دیا۔ سر جھکا کر زمین کی طرف دیکھنے لگی۔

راجہ رام۔ تمہیں تو یہ وہم ہوگیا ہے کہ مجھے بچوں سے پیار نہیں۔ تم ماں ہو مگر آخر میں بھی تو باپ ہوں۔

آخری بات سُنکر کوشلیا کو پھر بولنے کی جرأت ہوئی۔ غصہ سے منہ پھلا کر بولی۔ "باپ ہو۔ مگر باپ کی محبت تو تم میں کبھی نہ دیکھی۔ غریب بچہ تمہاری شکل دیکھکر سہم جاتا ہے۔ اور محبت کی نگاہ کو ترستا ہے۔ مارنا جانتے ہو پیار کرنا نہیں جانتے۔"

راجہ رام کو ہنسی آگئی۔

کوشلیا اور بھی تیز ہو کر بولی "کیا مجال جو کبھی اس کو پیار سے گود میں لیا ہو۔ یا ہنسکر دو باتیں ہی کرلیں ہاں مارنے کو ہر وقت طیار رہتے ہیں۔ معلوم نہیں۔ معصوم بچہ اپنے دل میں کیا کہتا ہوگا۔

راجہ رام۔ یہی کہ یہ میرا باپ نہیں ہے۔

کوشلیا چلو (ذرا ٹھہر کر) اگر میں کل مرجاؤں، تو ان بچوں کا کیا ہوگا؟ رو رو کر جان دیدیں، جب بھی تم سے امید نہیں کہ تم انھیں چپ بھی کرالوگے۔

راجہ رام۔ تو اب تم مرنے پر بھی آمادہ ہوگئیں۔

کوشلیا۔ کیسے آدمی ہو، ہر وقت تنے ہی رہتے ہو۔

راجہ رام۔ یہ تمہارا غصہ اب اتریگا بھی یا نہیں۔

کوشلیا۔ پرماتما نے بچے دیدیے۔ یہ عقل نہ دی کہ بچے شرارتیں بھی کیا کرتے ہیں۔ اب اس عمر میں تمہاری سمجھ کہاں سے لے آئیں۔

راجہ رام۔ اگر حکم ہو تو آج سے مارنا چھوڑ دوں۔

کوشلیا۔ کیوں چھوڑ دو؟ میں یہ کبھی نہ کہوں گی۔ باپ کی طرح مارو، مگر باپ کی طرح پیار بھی تو کرو۔

راجہ رام اور جسے پیار کرنا نہ آئے وہ کیا کرے۔ میرے خیال میں مار پیٹ نہیں کر دیتا ہوں۔ پیار تم کرلیا کرو۔ اب میں ہی سارے کام کیسے کرلوں۔

کوشلیا۔ بس یہی تو تم میں عیب ہے۔ ہر ایک بات کو ہنسی میں اڑا دیتے ہو۔

راجہ رام۔ تو ہنسنا بھی جرم ہوگیا۔

کوشلیا۔ یہاں سارا دن انتظار کرتے رہتے ہیں۔ اور تم آتے ہی کوئی نہ کوئی ایسی بات کر دیتے ہو کہ تن بدن میں آگ لگ جاتی ہے۔

راجا رام۔ (ہنسکر) چلو آج شادی کو کچھ نہ کہیں گے۔ اور کیا کہتی ہو۔

کوشلیا کو بھی ہنسی آگئی۔ محبت آمیز نگاہوں سے راجا رام کی طرف دیکھکر بولی، "اپنے کمرے میں چلکر کپڑے بدلو، اتنے میں مَیں دودھ گرم کرلاؤں۔"

شادی کے سر سے آفت ٹل گئی۔

(۲)

لالہ راجا رام سیدھے سادے آدمی تھے۔ گھر کا سیاہ وسفید سب کوشلیا کے ہاتھ میں تھا۔ وہ جو چاہتی تھی کرتی تھی۔ راجا رام اُس میں کبھی دخل نہ دیتے تھے، ان کو یہ بھی علم نہ تھا کہ گھر میں کیا ہے کیا نہیں، اُن کو دو روٹیاں کھانے سے غرض تھی۔ وہ کماتے تھے کوشلیا خرچ کرتی تھی۔ اسی طرح ان کی متاہل زندگی کے سات آٹھ سال گذر گئے۔ کوشلیا کو ان سے کوئی شکایت نہ تھی، سکھی سہیلیوں میں بیٹھتی تو اُن کی تعریف کے پل باندھ دیتی کہتی پرماتما ایسا خاوند سب کو دے، اُن میں کوئی عیب نہیں، یہاں تک کہ حقہ بھی نہیں پیتے، ذرا بلند آواز سے بولوں تو دب جاتے ہیں۔ لیکن ایک کانٹا تھا جو اُس کے دل میں ہمیشہ کھٹکتا رہتا تھا۔ اُن کو بچوں سے محبت نہیں تھی، وہ کبھی اُن کو گود میں لیکر پیار نہ کرتے تھے، کبھی بازار نہیں لے جاتے تھے، معمولی معمولی باتوں پر بھی دھکاتے اور زور زور سے بولنے لگتے، جیسے کسی سے لڑ رہے ہوں، کوئی ملنے جلنے والا اپنے بچے کو ساتھ لے آتا، جب بھی اس کی پروا نہ کرتے۔ کوشلیا کہتی، تمہاری اتنی عمر ہوگئی پر تمہیں یہ عقل آج تک نہ آئی کہ کوئی گھر میں آئے تو اس کے بچے کے سر پر پیار سے ہاتھ پھیر دینا اُس کی سب سے بڑی تواضع ہے۔ وہ تمہارے پاس بیٹھے رہتے ہیں تم اُن کی بات بھی نہیں پوچھتے، سوچتے ہونگے بڑا مغرور ہے، معلوم نہیں دفتر کا کام کیسے کرلیتے ہو، وہاں بھی غلطیاں کرتے ہوگے۔ راجہ رام یہ باتیں سنتے تو قہقہہ لگا کر ہنس پڑتے، کوشلیا کو بھی ہنسی آجاتی مگر اُس کے دل کی فکر دُور نہ ہوتی۔

اتوار کا دن تھا۔ لالہ راجہ رام دھوپ میں لیٹے ایک اخبار دیکھ رہے تھے۔ اتنے میں کوشلیا لڑکی کو لئے ہوئے آکر ان کی بغل میں بیٹھ گئی۔ اور اخبار چھین کر بولی۔ لو سنو! تمہاری بیٹی نے آج ایک نئی بات سیکھی ہے۔

راجہ رام۔ معلوم ہوتا ہے۔ اخبار نہ دیکھنے دوگی، بڑا دلچسپ مضمون تھا۔

کوشلیا۔ اس کی بات اس سے بھی دلچسپ ہے۔

راجہ رام۔ بھائی کو بلانا سیکھا ہوگا۔

کوشلیا۔ واہ! میری بیٹی کیا ایسی معمولی باتیں سیکھتی ہے، تمہارا دل خوش کردیگی۔

یہ کہکر کوشلیا نے شکنتلا سے کہا۔ کیوں بیٹی شنتی! تو مرے گی یا نہیں؟

شنّی نے ماں کی طرف دیکھکر زور سے سر ہلاکر کہا۔ "ہاں"

راجہ رام کو ہنسی آگئی۔

کوشلیا - تو مرنا جانتی ہے؟

شنّی نے پھر اسی طرح بڑے زور سے سر ہلایا اور طفلانہ انداز سے کہا: ہاں۔

کوشلیا۔ کیسے مریگی؟ بابوجی کو مرکر دکھادے۔

شنّی اپنا ناٹک دکھانے کے لئے جھٹ گود سے اُتر آئی۔ اس کے بعد اس نے ماں کے سر سے دوپٹہ اتار کر اوڑھ لیا اور زمین پر چت لیٹ گئی۔

راجہ رام ہنستے ہنستے لوٹے جاتے تھے۔

کوشلیا۔ (آہستہ سے) ذرا دیکھتے جاؤ۔ (بلند آواز سے) شنّی! اری او شنّی!! باپ رے باپ کیسی لڑکی ہے۔ پتہ نہیں، کہاں چلی گئی، (یکایک چونک کر) ارے، یہ تو یہاں لیٹی ہوئی ہے۔

شنّی نے اسی طرح لیٹے لیٹے مگر سر ہلاکر جواب دیا۔ چھنّی نہیں چھنّی۔ نہیں - ماں! چھنّی نہیں!

کوشلیا۔ (بلند آواز سے) تو کیا شنّی مرگئی؟

شنّی - (سر مار کر) ہاں (آخری لفظ کو لمبا کرکے) چھنّی مل دئی!

راجہ رام نے ہنس کر بیٹی کو زمین سے اُٹھالیا اور منہ چوم کر کہا۔ "کیوں بٹیا! مرنے کی کیا ضرورت ہے، تیری ماں کو بڑا صدمہ ہوگا، اب نہ مرنا۔

شنّی نے دونوں ہاتھوں سے باپ کا منہ پکڑلیا اور اُن کی آنکھوں میں اپنا عکس دیکھکر کہنے لگی۔

"وہ وہ چھنّی۔ وہ وہ چھنّی!"

کوشلیا نے خاوند کو بیٹی سے پیار کرتے دیکھا تو اس کے قلب پر ایک کیف کا عالم طاری ہوگیا۔ وہ کسی دوسری دنیا میں پہونچگئی۔ اتنی مسرت اسے دو ہزار کا زیور لیکر بھی حاصل نہ ہوتی، وہ یہی چاہتی تھی اُس کی سب سے بڑی آرزو یہی تھی۔ وہ خاوند کا پیار مانگتی تھی، مگر اپنے لئے نہیں، اپنی اولاد کے لئے۔ کیسا پاکیزہ، کیسا سرور بخش اور کیسا انبساط انگیز منظر تھا! باپ بیٹی سے پیار کرتا تھا اور ماں سامنے کھڑی دیکھتی اور خوش ہوتی تھی۔

یکایک کوشلیا کو شادی کا خیال آیا۔ گھر میں مٹھائی بٹ رہی ہو تو ماں کو سارے بچوں کا خیال آتا ہے وہ نہیں برداشت کرسکتی کہ ایک بچہ ساری مٹھائی اڑالے دوسرا بالکل محروم رہ جائے۔ آج اس کے یہاں

باپ کی محبت بٹ رہی تھی، پتہ نہیں کتنے دنوں بعد۔ بہن اپنا حصہ لے چکی تھی، اب بھائی کی باری تھی۔

کوشلیا نے دوپٹہ اوڑھکر شنی کو گود میں لیا اور جلدی سے نیچے اُتر گئی، وہاں شادی کا نندسے کنکوا بنا رہا تھا کوشلیا نے اُس کا منہ دھویا۔ نئے کپڑے پہنائے، سر میں تیل ڈالا۔ کنگھی کی اور آہستہ سے کہا۔ جا! جاکر بابو جی کو کپڑے دکھا آ۔

شادی نئے کپڑے پہنکر دل میں پھولا نہ سماتا تھا۔ مگر باپ کے پاس جانے کی بات سنکر اس کا چہرہ اُتر گیا وہ آہستہ آہستہ سیڑھیوں پر چڑھنے لگا۔ اس کا دل اس طرح دھڑک رہا تھا جیسے طالب علم امتحان دینے جارہا ہو مگر کامیاب ہونے کی کوئی امید نہ ہو۔

شادی آہستہ آہستہ باپ کے سامنے جاکر کھڑا ہو گیا، لالہ راجہ رام اس وقت پھر اخبار دیکھ رہے تھے اُنکو معلوم بھی نہ ہوا کہ لڑکا آکر کھڑا ہے۔ شادی بہت دیر تک چپ چاپ انتظار کرتا رہا۔ اس کے بعد جب اس نے دیکھا کہ بابو جی تو میری طرف معلوم نہیں کب تک دیکھیں گے تو خطاوارانہ انداز سے ڈرتے ڈرتے بولا۔ بابو جی! نئے کپڑے!!

لالہ راجہ رام نے چونک کر سر اٹھایا اور پھر اخبار پڑھتے ہوئے بولے "کیا ہے شادی!"

شادی نے پہلے اپنے کپڑوں کی طرف دیکھا، پھر بابو جی کی طرف اور تب آہستہ سے کہا "نئے کپڑے"

لالہ راجہ رام نے سر اٹھائے بغیر مگر مسکرا کر جواب دیا۔ تم نے نئے کپڑے پہنے ہیں، بہت اچھا کیا۔ اب جاؤ جاکر کھیلو، میں اخبار پڑھ رہا ہوں۔

شادی کی جان چھوٹی۔ لیکن کوشلیا کا اطمینان نہیں ہوا، وہ سیڑھیوں کے پاس کھڑی یہ سارا تماشا دیکھ رہی تھی۔ شادی نیچے اُترنے لگا تو اُس نے اُسے پھر پکڑ لیا اور بغل میں لیکر آہستہ سے اُس کے کان میں کہا۔ پیچھے سے جاکر بابو جی کی گردن میں باہیں ڈال دو۔

شادی پھر اداس ہو گیا۔ وہ سوچتا تھا۔ نئے کپڑے پہنے ہیں، چلکر اپنے ہمجولیوں پر رعب جماؤں گا۔ لیکن ماں نے پھر اسی سرد مہر باپ کی طرف ڈھکیل دیا۔ جو اخبار پڑھتا تھا۔ پیار نہ کرتا تھا۔ اس پر جیسے کوئی بڑی بھاری مصیبت ٹوٹ پڑی۔ کمزور طالب علم دوسری دفعہ پھر امتحان دینے چلا اس کے قدم لڑکھڑا رہے تھے، چہرے کا رنگ اڑا جاتا تھا۔ حسن اتفاق سے ایک مرتبہ پاس ہو گیا تھا۔ کیا اب دوسری مرتبہ بھی پاس ہو جائے گا؟ نہیں اسے اس کی ذرا بھی امید نہ تھی۔

لیکن مجبوراً پھر گیا۔ اور باپ کی پیٹھ کی طرف جاکر کھڑا ہو گیا، مگر گردن میں باہیں ڈالنے کی جرأت نہیں

نہ تھی، کہیں باپ خفا نہ ہو جائے، ایک مرتبہ ہنسکر ٹال دیا لیکن اب جان نہ بچے گی۔ اُس نے سیڑھیوں کی طرف دیکھا، اگر ماں نہ ہو تو بھاگ جاؤں، جان چھٹ جائے، پھر دیکھا جائیگا۔ مگر وہ وہیں کھڑی تھی، اور اشاروں سے کہہ رہی تھی۔ دیکھتا کیا ہے جلدی سے لپٹ جا۔

اب شادی کے لئے کوئی اور چارۂ کار نہ تھا، اُس نے جان پر کھیل کر اپنی ننھی ننھی باہیں کھولیں اور بڑے زور کے ساتھ باپ کی گردن سے لپٹ گیا۔

راجہ رام اخبار کے دلچسپ مضمون میں محو تھے، اُن کے ہاتھ سے اخبار گر گیا، چونک کر بولے "ارے کون؟ شادی!" شادی نے اُن کی طرف مسکرا کر دیکھا، لیکن یہ مسکراہٹ آزادی کی مسکراہٹ نہ تھی، جس کے پیچھے قہقہہ چھپا رہتا ہے۔ یہ وہ مسکراہٹ تھی جو خوف کے سایہ میں پلتی ہے اور قدم قدم پر لرزتی ہے جیسے چاندنی رات میں بادل چھا جائیں، اُس وقت چاندنی کیسی پھیکی دکھائی دیتی ہے۔ کیسی بے نور۔ یہی حال شادی کی مسکراہٹ کا تھا۔

راجہ رام نے شادی کی طرف ناراضگی سے دیکھا اور کڑک کر کہا۔ "جاؤ! جا کر کھیلو، نئے کپڑے پہنے ہیں تو کیا مجھے اخبار نہ پڑھنے دو گے؟"

شادی سہم کر چلا آیا اور آہستہ آہستہ نیچے اُتر گیا، جیسے کسی نے منہ پر تھپڑ مار دیا ہو۔ کوشلیا کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ طالب علم کے فیل ہونے پر اُسکا استاد بھی رنجیدہ ہو جاتا ہے۔ اُس نے آہ سرد بھری اور اپنی کوٹھری میں جا کر چارپائی پر لیٹ گئی۔ اس وقت اس کی آنکھیں تم تھیں اور دل میں ایک آگ سی لگی ہوئی تھی۔ رہ رہ کر سوچتی تھی کیسے بیدرد ہیں، انھیں بچوں سے ذرا بھی پیار نہیں، اگر ہنسکر دو باتیں کر لیتے تو ان کا کیا نقصان ہو جاتا۔ اس طرح دھمکا دیا جیسے کوئی فقیر کا لڑکا بھیک مانگنے آیا ہو۔ انھیں اخبار کا خیال ہے بچے کا خیال نہیں، اتنا بھی نہ سوچا کہ غریب کا دل چھوٹا ہو جائیگا۔

کوشلیا کی آنکھوں کے آنسو اس کے رخسار پر بہنے لگے۔

شکنتلا نے ماں کے چہرے پر اپنے ملائم ملائم ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ "ماں!"

کوشلیا نے اُس کی طرف غمناک آنکھوں سے دیکھا اور اُس کا منہ چوم کر بولی۔ "کیوں بیٹی کیا ہے؟"

شکنتلا نے دل کو موہ لینے والے انداز میں جھوم جھوم کر کہا۔ "چھپی نہیں۔ چھپی نہیں۔ ایں ایں۔"

کوشلیا کی آنکھیں بیٹے کی بدنصیبی پر اشکبار تھیں، لیکن اس کے ہونٹ بیٹی کی باتوں پر ہنس رہے تھے جیسے بعض وقت برکھا میں دھوپ نکل آتی ہے۔

مگر راجہ رام اپنے اخبار کے دلچسپ مضمون کے مطالعہ میں مستغرق تھے۔ کوشلیا کے دل میں رنج و راحت کے کیسے جذبات پیدا ہو رہے ہیں۔ اس کا انھیں ذرا بھی علم نہ تھا۔

(۳)

اس کے چند دن بعد راجہ رام کے مکان پر ایک جلسہ ہوا، اُن کے دفتر کے کلرکوں نے انھیں ایام میں ایک سوسائٹی HAPPY CLUB قائم کی تھی، اس کلب کے بیشتر ممبر گانے بجانے والے اور خوش باش آدمی تھے۔ ہر ہفتہ کی شب کو کسی نہ کسی ممبر کے مکان پر جمع ہوتے اور دو گھڑی دل بہلاتے۔ لالہ راجہ رام گانا بجانا قطعاً نہ جانتے تھے لیکن اُنھیں گانا سننے کا بیحد شوق تھا HAPPY CLUB کے ممبر بن گئے۔ آج اُن کے ہاں اسی کلب کی میٹنگ تھی، اندر باہر دوڑتے پھرتے تھے جیسے اُن کے بیٹے کا بیاہ ہو۔ تارا چند گاتا تھا، ہنس راج ہارمونیم بجاتا تھا۔ اور لوگ ہمہ تن محو ہو کر سنتے اور مستانہ وار جھومتے تھے۔ تارا چند کوئی ماہر فن نہ تھا اور نہ اُسے علم موسیقی کے اصول و قواعد سے واقفیت تھی۔ لیکن اس کی آواز ایسی شیریں اور لوچدار تھی کہ سُنکر لطف آجاتا تھا۔ لوگ کہتے تیری آواز میں جادو ہے جبھی تو دل موہ لیتا ہے۔ گاتے گاتے جب اس کی آواز نیچے اُترتی اور رفتہ رفتہ اس قدر نیچے چلی جاتی کہ اُسے سننا بھی دشوار ہو جاتا تو ممبران عش عش کر اُٹھتے۔ مگر راجہ رام کا اس طرف ذرا بھی خیال نہ تھا۔ اُن کی تمام تر توجہ ممبروں کی خاطر تواضع میں لگی ہوئی تھی۔ سوچتے تھے کوئی کمی نہ رہ جائے، کل کو کوئی یہ نہ کہے کہ راجہ رام کے ہاں کا انتظام ٹھیک نہ تھا، کسی کو سیگریٹ دیتے تھے کسی کو دیا سلائی کی ڈبیا کسی کو پان سپاری۔ اتنے میں ایک آدمی نے کہا۔ بابو تارا چند کا گلا بیٹھا جاتا ہے۔ انھیں الائچی اور مصری لادو، ورنہ محفل سونی ہو جائیگی۔

بابو تارا چند نے ہنسکر اُس بابو کی طرف دیکھا اور کہا۔ شکریہ

لالہ راجہ رام بھاگے بھاگے اندر گئے اور بیوی سے بولے، "الائچی اور مصری کہاں ہے؟"

کوشلیا نے سبزی کترنا بند کر دیا اور اٹھکر الماری سے مصری اور الائچی کی پلیٹ نکالکر خاوند کو دیتے ہوئے بولی "یہ کون گا رہا ہے؟"

راجہ رام۔ بابو تارا چند ہے۔

کوشلیا۔ خوب گاتے ہیں۔ آواز بڑی میٹھی ہے۔

راجہ رام۔ کیا کہنے ہیں، سبھی مست ہو رہے ہیں۔

یہ کہکر وہ واپس مڑنے کو تھے۔ کہ کوشلیا نے آہستہ سے کہا، "ذرا ایک بات تو سنتے جاؤ"

راجہ رام۔ (ٹھہر کر) کیا کہتی ہو، جو کچھ کہنا ہو جلد کہو، دیر ہوگئی تو لوگ طعنے ماریں گے۔ کہیں گے معلوم ہوتا ہے مصری گھر میں نہ تھی۔ بازار سے لائے ہو۔

کوشلیا۔ ارے تو کیا یہ لوگ اتنے بُرے ہیں۔ دوسروں کی عزت کا خیال ہی نہیں کرتے۔

راجہ رام۔ ایک دفتر میں کام کرنے سے بے تکلفی ہو ہی جاتی ہے۔ کہو کیا کہتی ہو۔؟

کوشلیا۔ بچوں کو بھی لیجاؤ۔ بار بار جاکر دروازے سے جھانکتے ہیں۔

راجہ رام۔ جھانکنے دو۔ اندر جاکر کیا کرینگے۔ آواز باہر سے بھی سنائی دیتی ہے اور بالکل صاف۔

کوشلیا۔ ایک طرف بٹھا دینا، بیٹھے رہیں گے۔

راجہ رام۔ اور جو کوئی شرارت کی تو پھر؟

دونوں بچے سامنے کھڑے اپنی "قسمت کا فیصلہ" سننے کے منتظر تھے۔ کوشلیا نے پوچھا "اندر جاکر شرارت تو نہ کروگے؟"

شادی۔ (پُرامید لہجہ میں) چپ چاپ بیٹھے رہیں گے۔

راجہ رام۔ تم چپ چاپ بیٹھنا جانتے ہی نہیں، چپ چاپ کیسے بیٹھوگے؟"

شادی نے سر جھکا لیا اور ایک کونے میں منہ چھپا کر رونے لگا۔ مگر شنی اتنی جلدی ہمت ہارنے والی نہ تھی اس نے باپ کی ٹانگوں سے لپٹ کر کہا "چھنی نہیں یں۔۔۔۔ چھنی نہیں یں یں۔۔۔"

اور پھر ماں کا دوپٹہ پکڑ کر اُسے زور زور سے کھینچنے لگی۔ اور منہ بسورنے لگی جس کا مطلب یہ تھا کہ انہیں کہو لے چلیں۔

کوشلیا نے کہا۔ نہیں شرارت کرینگے، لیجاؤ۔

راجہ رام کا دل نہ مانتا تھا، کہ یہ بچے وہاں خاموش بیٹھ سکیں گے۔ مگر بیوی کے سامنے بولتے ہوئے ڈرتے تھے کہ اگر اسے غصہ چڑھ گیا تو ابھی کرٹکنے لگے گی۔ اس کی آواز باہر تک سنائی دیگی، سارا مزہ کرکرا ہو جائے گا۔ باہر جلسہ ہو رہا ہے یہاں ہنگامہ شروع ہو جائیگا۔ مجبور ہو کر بولے۔ "اچھا آجاؤ، مگر خبردار شور نہ مچانا"

شادی کے بہتے ہوئے آنسو رک گئے، چہرے پر ہنسی آگئی، کرتے سے آنکھیں صاف کرتا ہوا بولا، "نہیں کریں گے"۔

راجہ رام۔ شنی کو اٹھا لو، اور چلے آؤ۔

شادی بہن کو اٹھا کر باہر لے گیا، اور مردانہ کمرہ میں ایک طرف ہو کر جا بیٹھا۔ پاس ہی شنی کو بھی بٹھالیا۔ شنی

نے اپنی متحیر آنکھوں سے اتنے آدمی دیکھے تو ڈر گئی، اور اُٹھکر شادی کی گود میں جا بیٹھی۔

راجہ رام مصری اور الائچی تقسیم کرنے لگے، جب تک دُور تھے تب تک شنّی خاموش رہی مگر جب بالکل قریب آگئے تو اس کا صبر و قرار جاتا رہا۔ اُس کے لمبے لمبے سُنہرے بال اُس کی آنکھوں پر پڑ رہے تھے۔ اُس نے ایک ہاتھ سے اُنھیں پرے ہٹایا اور دوسرا ہاتھ باپ کے سامنے پھیلا کر بے صبری سے کہا "میں!"

جو پاس بیٹھے تھے وہ ہنسنے لگے۔ راجہ رام نے مصری کی تین چار ڈلیاں اُس کے ہاتھ پر رکھ دیں اور کہا۔ یہ لو یہ "میں" کی مصری ہے، چپ چاپ کھا لو، مگر شور نہ مچانا، نہیں تو مار پڑیگی"۔

شادی کے دل میں کچھ کچھ حسد ہونے لگا، اُس کی نگاہیں مصری پر تھیں، وہ اپنی زبان ہونٹوں پر پھیرتا تھا، اُسے امید تھی ابھی مجھے بھی ملتی ہے، مگر راجہ رام آگے بڑھ گئے۔ اور اُسے مصری نہ ملی، شادی اُداس ہوگیا۔ اس کا چہرہ اتر گیا۔ سوچنے لگا سب کو ملی ہے مجھے ہی نہیں ملی۔ یہ کیوں؟ اگر ماں ہوتی تو یہ بے انصافی کبھی نہ کرتی، جب بڑا ہونگا اور روپیہ کماؤنگا تو دس پندرہ روپے کی مصری لے آؤنگا۔ اور پیٹ بھر کر کھاؤنگا، دوسروں کو بھی دونگا مگر بابوجی کو ایک ڈلی بھی نہ دونگا۔ مانگیں گے تو کہونگا تم نے بھی تو مجھے نہیں دی تھی، اب شنّی سے مانگو۔

مگر بڑا ہونے کا، روپیہ کمانے کا اور پیٹ بھر کر مصری کھانے کا وقت ابھی بہت دور تھا۔ اور شنّی کی مصری بڑی تیزی سے ختم ہو رہی تھی، شادی نے اُس کی آنکھ بچا کر ایک ڈلی اُٹھالی اور منہ میں رکھ لی۔ اگر شنّی نہ دیکھتی تو معمولی بات تھی۔ مگر اُس نے دیکھ لیا اور مچل گئی۔ شادی اُسے پیار سے مناتا تھا اور وہ غصہ سے اس کا منہ نوچتی تھی کہ میری مصری تو نے کیوں کھائی؟ اس کے بعد وہ زمین پر لیٹ گئی اور چیخ چیخ کر رونے لگی۔ گانے میں ذرا سا شور بھی مخل ہو تو اس کا لطف جاتا رہتا ہے۔ تارا چند نے گانا بند کر دیا اور کہا، "یہ روتی کیوں ہے؟"

کئی آدمیوں نے شنّی کو چپ کرانے کی کوشش کی مگر وہ چپ نہ ہوئی، بلکہ اور بلند آواز سے رونے لگی، جہاں گانا ہوتا تھا وہاں رونا مچ گیا۔ محفل میں بدمزگی پھیل گئی۔ لالہ راجہ رام کسی کام سے گھر کے اندر گئے تھے واپس آئے تو یہ منظر دیکھا۔ لپک کر شنّی کے پاس پہونچے، اور اُسے شرربار نگاہوں سے دیکھکر بولے "کیوں، کیا ہوا جو یوں چلّا رہی ہے۔"

ایک آدمی نے کہا، "بچی ہے، نرمی سے بولو نہیں تو ڈر جائے گی"۔

شنّی سہم گئی، اس کی آنکھوں کے آنسو آنکھوں ہی میں رک گئے۔ ڈرتے ڈرتے بولی "مچھادی"!

جس کا مطلب یہ تھا کہ شادی نے میری مصری چھین لی ہے۔

راجہ رام کے تن بدن میں آگ لگ گئی، لیکن دوسروں کے روبرو کیا کہتے۔ خون کا گھونٹ پیکر رہ گئے۔ اور آہستہ سے مگر سختی کے لہجہ میں بولے۔ دونوں باہر چلے جاؤ۔

بچے ہماری زبان سمجھیں یا نہ سمجھیں مگر آنکھیں پہچاننے میں کبھی غلطی نہیں کرتے، شنّی بھی سمجھ گئی کہ اگر اس وقت فند کی تو پٹ جاؤنگی، چپ چاپ بھائی کی گود میں چلی گئی شادی اسے لیکر باہر نکل گیا مگر راجہ رام کا غصہ ابھی فرو نہ ہوا تھا۔ انھوں نے صحن میں جاکر شادی کو کان سے پکڑ لیا اور غصہ سے بولے۔ کیوں پاجی! تو نے اس سے مصری کیوں چھینی، لوگ کیا کہتے ہونگے۔ یہی کہ اس نے کبھی مصری کا منہ نہیں دیکھا

شادی نے شنّی کو گود سے اتار کر زمین پر کھڑا کر دیا۔ اور مجرم کی طرح سر جھکا کر چپ چاپ زمین کی طرف دیکھنے لگا۔ جیسے اُس کی قوت گفتار سلب ہوگئی ہو۔ راجہ رام اس کے سامنے کھڑے غصہ سے دانت پیس رہے تھے۔

شنّی نے مار پیٹ کے یہ آثار دیکھے تو روتی ہوئی بھاگ گئی اور باورچی خانہ میں جاکر ماں سے بولی۔ ماں! بابو، چھادی۔ ماں!۔ بابو۔ چھادی، یعنی بابوجی شادی کو مار رہے ہیں۔

کوشلیا نے جلدی سے باہر نکلکر دیکھا تو راجہ رام لڑکے کو بُری طرح مار رہے تھے۔ ایسی بے رحمی سے بچے کو کوئی پرایا بھی نہ مارتا۔ ماں کا دل بیتاب ہوگیا، شادی پٹتا تھا اور دم نہ مارتا تھا۔ مبادا باپ کو اور غصہ چڑھ جائے۔ گرماں کو دیکھکر اس کی چیخیں نہ رک سکیں۔ کسی ہمدرد کے سامنے ہم اپنے قابو میں نہیں رہتے۔ کوشلیا نے شادی کا ہاتھ پکڑ کر اُسے اپنی طرف کھینچ لیا اور کہا "کیا اب مار ہی ڈالو گے؟"

راجہ رام۔ (ہانپتے ہوئے) "میں نے کتنی مرتبہ کہا تھا کہ انھیں باہر نہ بھیجو شرارت کرینگے۔ اُس وقت تو مانتی ہی نہ تھیں۔"

کوشلیا۔ تو کس کا خون کر آیا ہے جو اسے ہلاک کرنے پر تُل گئے ہو۔ یہ کہکر کوشلیا نے اپنے دوپٹے کے آنچل سے شادی کے آنسو پونچھنے لگی۔

راجہ رام۔ کس کا خون کیا ہے؟ سارے جلسے کا خون کیا، ساری میٹنگ کا خون کیا۔

کوشلیا۔ (قدرے بلند آواز سے) "بہت اچھا کیا، خوب کیا، عمدہ کیا، یہ گھر ہے، ناٹک کا منڈپ نہیں ہے، ایسے جلسے کرنے ہوں تو باہر جاکر کیا کرو۔ یہاں بچے شور مچائیں گے، کھیلیں گے، جو چاہیں گے کریں گے۔"

راجہ رام۔ (طنزیہ پیرایہ میں) ذرا اور بلند آواز سے بولو، ابھی تمہاری آواز باہر نہ سنائی دیتی ہوگی۔

کوشلیا۔ ہزار بار سنائی دے، مجھے کسی کی پروا نہیں۔

راجہ رام۔ لوگوں کو تماشا دکھانے کا ارادہ ہے تمہارا! شرم تو نہ آتی ہوگی،

کوشلیا۔ کیا دنیا بھر کی شرم میرے ہی لئے رہ گئی ہے۔ جب تمہیں نادان بچے کو اس طرح مارتے ہوئے شرم نہیں آتی تو مجھے اُسے بچاتے ہوئے کیوں شرم آئے؟

راجہ رام۔ (ذرا گرم ہوکر) دیکھو! میں بے شرم ہوں بے غیرت نہیں ہوں، میں سوچتا ہوں، جھگڑا نہ بڑھ جائے، تم سر پہ سوار ہوئی جاتی ہو، مگر میں صاف کہے دیتا ہوں کہ میں تمہیں اس طرح اپنے روبرو بکواس نہ کرنے دونگا۔"

کوشلیا۔ اور میں بھی تم سے صاف کہے دیتی ہوں کہ میں تمہیں اس طرح بچوں کو مارنے کی کبھی اجازت نہ دونگی، اگر کوئی ہڈی وڈی ٹوٹ گئی تو مصیبت میرے سر پر ٹوٹے گی۔ تمہارا کیا ہے، تم تو دفتر چلے جاؤ گے۔

راجہ رام نے بیوی کی طرف دیکھا تو ڈر گئے، منہ کی بات منہ ہی میں رہ گئی۔ اس وقت کوشلیا کے چہرہ پر غصہ تھا۔ آنکھوں میں آگ کے شرارے۔ اُنھوں نے غصے کی حالت میں بھی سمجھ لیا کہ اگر ایک لفظ بھی کہا تو بارود کے ڈھیر پر دیا سلائی کا کام دیگا۔ انھوں نے سر جھکا لیا اور مردانے میں چلے گئے۔ وہاں سناٹا چھایا ہوا تھا۔ راجہ رام کے چہرے کا رنگ اڑ گیا۔ اُن کی لڑائی کی باتیں ان کے دوستوں نے سُن لی تھیں۔ ندامت سے بولے "گانا کیوں بند کر دیا، گاؤ نا؟"

ہیپی کلب کے ممبروں نے ایک دوسرے کی طرف پُرمعنی انداز سے دیکھا۔ گویا نگاہوں ہی نگاہوں میں مشورے ہونے لگے کہ یہاں تو میاں بیوی میں جھگڑا ہوگیا، اب ٹھہریں یا چلتے بنیں۔

راجہ رام سیدھے سادے آدمی تھے مگر بیوقوف نہ تھے۔ ان نگاہوں کے معنی سمجھنے میں انھیں بھی دیر نہ لگی شرم سے چہرہ سرخ ہوگیا، تاہم سنبھل کر بولے، گائیے نا؟ آپ تو چپ ہی ہوگئے؟"

تارا چند نے پھر گانا شروع کیا، ہنس راج کی انگلیاں پھر ہارمونیم کے سُروں پر دوڑنے لگیں۔ ادھر یہ راگ رنگ کا جلسہ ہو رہا تھا، ادھر گھر کے اندر شادی سسکیاں بھر بھر کر رو رہا تھا۔ اور کوشلیا اسے گلے سے لگا کر چپ کرانے کی کوشش کر رہی تھی، مگر اُس کے آنسو نہ رکتے تھے۔

(۴)

صبح کو شادی بخار میں بے ہوش پڑا تھا۔ اُسے تن بدن کی سُدھ نہ تھی، راجہ رام نے دیکھا تو ڈر گئے، اور اپنی حماقت پر پچتانے لگے کہ ناحق مارا، اب کوشلیا شیر ہو جائے گی، کہے گی اس وقت مارتے تھے اب سرہانے بیٹھکر علاج کرو۔ کوشلیا کے سامنے اُن کی آنکھیں نہ اٹھتی تھیں، نہ اُس سے بات چیت کرنے کی جرأت تھی۔ اُن کو اندیشہ تھا کہ میں نے بات کی اور کوشلیا نے کڑکنا شروع کیا۔ کوشلیا کی کڑک اُن کے لئے بجلی کی کڑک سے بھی بھیانک تھی۔ بغیر کچھ کہے سُنے ڈاکٹر کو بلا لائے، اور اُس سے راہ میں ساری کہانی بیان کر دی۔ ڈاکٹر نے آکر شادی کو دیکھا اور نسخہ لکھنے لگا۔

کوشلیا نے پردہ کی آڑ سے مدھم آواز میں شوہر سے کہا، پوچھو کوئی ہڈی وڈی تو نہیں ٹوٹ گئی؟

ڈاکٹر۔ نہیں صرف ڈر گیا ہے، اسی وجہ سے بخار ہو گیا ہے۔

کوشلیا۔ کب تک اُتر جائے گا؟

ڈاکٹر۔ ایک دو دن میں، گھبرانے کی بات نہیں ہے۔ (نسخہ دیتے ہوئے) دن میں تین مرتبہ دوا دو ٹھیک ہو جائے گا۔

مگر تین دن گذر گئے اور بخار نہ اُترا۔ کوشلیا کو کسی پہلو کل نہ پڑتی تھی، تمام رات جاگتی رہتی تھی۔ ایک طرف بیمار بچے کی تیمارداری کرنا پڑتی تھی، دوسری طرف شکنتلا کو سنبھالنا پڑتا تھا۔ چوتھی رات راجہ رام نے کہا، "آج میں جاگونگا تم جاکر آرام کرو۔"

کوشلیا۔ تم کو جاگنے کی عادت نہیں، بیمار ہو جاؤ گے"

راجہ رام۔ نہیں ہونگا، تم جاکر سو رہو۔

کوشلیا۔ (غصہ سے) تمہیں خواہ مخواہ تکلیف ہوگی

راجہ رام۔ قصور بھی تو میرا ہی ہے۔

کوشلیا۔ صبح دفتر نہ جا سکوگے۔

راجہ رام۔ چھٹی لے لونگا۔

کوشلیا کا غصہ اتر گیا۔ خاوند کی طرف محبت آمیز نگاہوں سے دیکھکر بولی "میں تمہیں جاگنے دونگی۔ جاؤ جاکر آرام کرو۔ ورنہ کل سارے دن طبیعت خراب رہے گی (ٹائم پیس کی طرف دیکھکر) دس بج گئے ہیں کب تک بیٹھے رہوگے۔"

راجہ رام ۔ معلوم ہوتا ہے تم نے بیمار ہونے کا فیصلہ کرلیا ہے۔

یہ کہکر سونے چلے گئے۔ کوشلیا نے شادی کی نبض پر ہاتھ رکھکر دیکھا اور آہ سرد بھری ۔ جسم ابھی تک تپ رہا تھا، اس کے دل میں بُرے بُرے خیال آنے لگے۔ کہیں بچے کو کچھ ہو نہ جائے، پرماتما غریب کو بخش دے۔ ہم نادار ہیں، ہمارے پاس دولت نہیں، ہمارا روپیہ پیسہ یہی بچے ہیں۔ یہ سلامت رہیں، ہمیں کچھ نہ چاہیئے۔

گھڑی میں دس بج گئے، شادی نے کروٹ بدلی اور چلاّکر کہا۔ "ماں! پانی"۔

کوشلیا نے پیار سے شادی کے منہ پر ہاتھ پھیرا اور اُسے اپنی بانہہ کا سہارا دیکر بٹھا دیا۔ "پہلے دوا پی لو، پھر پانی ملیگا"۔

شادی "نہ پہلے پانی دو۔ بڑی پیاس لگی ہے"

کوشلیا ۔ "دوا کب پیوگے۔ دس بجے دوا دینی ہے"۔

شادی ۔ پہلے پانی دو۔ یہ کہتے کہتے شادی کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ کوشلیا بیتاب ہوگئی۔ ہم بیمار بچے کو آزردہ نہیں کرسکتے۔ اس نے شادی کو پانی پلاکر لٹا دیا، اور کہا۔ دوا ذرا ٹھہر کر دوں گی۔

شادی ۔ ماں! (منت سے) میرے ساتھ لیٹ جاؤ۔

کوشلیا لیٹ گئی۔ شادی نے اپنا سر اس کی چھاتی میں چھپا لیا۔ اور اپنا ہاتھ اُس کے منہ پر رکھدیا۔

ماں کی مامتا جاگنا چاہتی تھی، مگر قدرت کے قاعدے اٹل ہیں۔ تھوڑی دیر کے بعد کوشلیا کو نیند آگئی اب اُسے تن بدن کا ہوش نہ تھا۔ ادھر راجہ رام اپنی چارپائی پر کروٹیں بدلتے تھے مگر ان کو نیند نہ آتی تھی وہی قدرت جس نے ماں کو سُلا دیا تھا باپ کو جگا رہی تھی۔ راجہ رام سونا چاہتے تھے، وہ سونے کی کوشش کرتے تھے مگر نیند اُن سے کوسوں دُور تھی۔ اُن کے دل میں ایک گھبراہٹ تھی، سینہ میں آگ سی دہک رہی تھی، ایسی حالت میں نیند کہاں؟ آخر اُٹھ بیٹھے۔ مگر اپنی خواہش سے نہیں۔ کسی غیبی طاقت کے اشارہ سے اُن کو معلوم نہ تھا کہ میں کیا کر رہا ہوں، کدھر جا رہا ہوں، لیکن اُن کے پاؤں چل رہے تھے جیسے اُن پر کسی نے مسمریزم کا عمل کر دیا ہو، وہ برہنہ بدن، برہنہ پاؤں گھر سے نکلے اور اپنے قریبی مندر کی طرف روانہ ہوگئے۔

رات کا وقت تھا ایک بج چکا تھا۔ چاروں طرف سناٹا تھا۔ لوگ اپنے اپنے بستروں پر سو رہے تھے ماں کی آنکھیں بھی جھپک گئیں تھیں مگر باپ کی محبت بیمار بیٹے کی سلامتی کے لئے پرارتھنا کرنے کو ننگے بدن ننگے پاؤں مندر کی طرف بھگائے لئے جا رہی تھی۔

لیکن مندر کے دروازے بند تھے اور پجاری اپنی کوٹھری میں آرام کی نیند سو رہا تھا۔

راجہ رام مندر کی سیڑھیوں پر اوندھے منہ گر پڑے۔ اور بیٹے کی سلامتی کے لئے رو رو کر پرارتھنا کرنے لگے۔ اُن کے آنسوؤں سے سنگ مرمر کی سفید سیڑھیاں تر ہو گئیں۔

یہ وہی بے پروا، بے درد باپ تھا جسے اپنے بچوں سے ذرا محبت نہ تھی، اور جس نے اُن کو گود میں لیکر کبھی پیار نہ کیا تھا۔ جو صرف مارنا جانتا تھا آج وہ رات کے اندھیرے اور سناٹے میں اپنے بچے کی زندگی کیلئے اونچے گھر والے نیلی چھت والے پرماتما سے پرارتھنا کرنے آیا ہے۔ اور اس حال میں کہ اُسے اپنے جسم کا بھی دھیان نہیں۔

صبح کو جب کوشلیا کی آنکھ کھلی، تو ساڑھے سات بج چکے تھے، اُسے اپنے آپ پر غصہ آیا کہ میں اتنی دیر کیوں سوئی رہی۔ تب اُس نے آہستہ سے شادی کی پیشانی پر ہاتھ رکھا اور اس کی آنکھیں مسرت سے چمکنے لگیں شادی کا بخار اُتر چکا تھا اور وہ آرام سے سو رہا تھا۔ کوشلیا جلدی سے اٹھکر خاوند کو یہ خوشخبری سنانے کے لئے اس کے کمرے کی طرف دوڑی۔ مگر اُن کا بستر خالی تھا۔ جوتا، کمبل۔ کپڑے سب وہیں تھے صرف راجہ رام نہ تھے۔ کوشلیا نے مکان کا چپہ چپہ ڈھونڈا، مگر اُن کا کہیں پتہ نہ تھا۔ یکایک اس کی نگاہ زینے کی طرف گئی، دروازہ چوپٹ کھلا تھا کوشلیا کا کلیجہ دھڑکنے لگا۔

اتنے میں کہاری نے اوپر آکر کہا۔ "بھوجی! بابو جی ننگے پاؤں، ننگے بدن مندر کی سیڑھیوں پر اوندھے منہ پڑے رو رہے ہیں، اور کسی کے اُٹھائے نہیں اُٹھتے۔"

کوشلیا نے یہ خبر حیرت کے ساتھ سُنی اور آن واحد میں اُس پر صورت حال روشن ہو گئی، وہ ماں تھی اُسے باپ کی محبت پہچاننے میں ایک لمحہ کی بھی دیر نہ لگی۔ آج اُسے معلوم ہوا کہ جسے وہ چشمۂ خشک سمجھے ہوئے تھی دراصل گہرا ساگر تھا۔ اوپر ریت تھی۔ نیچے پانی لہریں مارتا تھا، اُس نے ریت دیکھی، ریت کے نیچے پانی نہ دیکھا، مگر آج وہ پانی ریت کے پردے کو پھاڑ کر باہر چھلک رہا تھا۔ جیسے فوارے سے پانی کی دھاریں پھوٹتی ہیں۔ اُس کی آنکھوں میں فخر، محبت، خوشی کے آنسو بہنے لگے۔ اُس نے کہاری سے کہا۔ تو ذرا بچے کے پاس بیٹھیں اُن کو لے آؤں۔

یہ کہکر وہ باہر جانے کے لئے جلدی جلدی کپڑے پہننے لگی۔

سُدرشن

غرور کی شکست

از مسٹر سری نرائن نگم - ایم - اے ایل ایل بی

مشرق و نیز مغرب مین یہ عام خیال ہے کہ شیطان ہمیشہ گناہ کی ترغیب دیتا رہتا ہے - اور انسان کو بہکا کر ہر وقت بدی کی طرف لیجاتا ہے - گویا انسان کی تمام بداعمالیون کا وہی ذمہ دار ہے اور خدا اور انسان دونون سے ہر دم برسر جنگ رہتا ہے - مگر اس ڈرامہ مین اس عام نظریہ کی تردید کیگئی ہے اور ..... شیطان کو ایک نئی حیثیت سے پیش کیا گیا ہے - جسمین وہ معصیت کیطرف راغب کرنے کے بجائے انسان کو نیکی کی طرف مائل کرتا ہوا ظاہر کیا گیا ہے اس تخیل کے مطابق شیطان کا قصور صرف اسکا تحت و غرور ہے - وہ ایک نیک نیت اور نیک طینت لیکن پُرغرور ہستی ہے - اسکی خودپسندی و خودپنداری کی کوئی حد نہ تھی - اسی لیے وہ راندہ درگاہ ایزدی ہوا اور اسکا غرور توڑنے کے خاطر دربار خداوندی سے اسکو یہ سزا ملی ہے کہ جس ہستی سے اس نے نفرت و حقارت کا اظہار کیا ہے اُسی کی کمزور و خاکسار اولاد کو دنیا مین جاکر گناہ کے غار عظیم سے نکالکر نیک نفسی کے راستہ کی طرف لیجائے - جس روز بنی نوع آدم نیکی کی شاہراہ پہ چلنے لگے اُسی دن اسکی سزا کا خاتمہ ہوگا اور نجات ابدی حاصل ہوگی - اسی وجہ سے شیطان حتی المقدور انسان کو بدی سے بچاتا ہے اور جب وہ اپنی کوشش مین ناکام رہتا ہے تو اسکو بے انتہا روحانی کوفت اور قلبی اذیت پہونچتی ہے - اسکے ساتھ ہی شیطان کو اس پر بھی حیرت ہوتی ہے کہ انسان جیسی فسق و فجور مین ڈوبی ہوئی ہستی کو اشرف المخلوقات کا درجہ دیکر فرشتون کو اسے سجدہ کرنے کا حکم دیا گیا ! مگر اسے اپنے جدوجہد نجات ہی کے دوران مین ان سخت مشکلات کا تجربہ ہوجاتا ہے جو عمل خیر مین انسان کے سدراہ ہین - سچ ہے آدمی حوادث روزگار کا کھلونہ اور حالات گردوپیش کا پتلا ہے -

اشخاص ڈرامہ

۱- شیطان

۲- بیلزیبب
۳- میمن } شیطان کے معین و معاون

۴- الگزینڈر اسمتھ- ایک نیک دل انگریز رئیس و ممبر پارلیمنٹ -

۵- روزا - اسکی نوجوان بیوی -

۶- یوجین - الگزینڈر کا دوست جس کو وہ دولتمند ساہوکار سمجھتا ہے - لیکن جو شیطان ہی ہے -

مقام - انگلستان کا کوئی شہر - وقت - ایک دن و رات -

پہلا ایکٹ

سین اوّل

[وقت دن - ایک بلند عمارت کا آراستہ کمرہ - شیطان داخل ہوتا ہے - اسکی اونچی پیشانی اور سیاہ و چمکدار آنکھوں سے ذہانت ٹپکتی ہے - اسکا قد و قامت بلند خط و خال موزون - لیکن چہرہ سے رنج و یاس کے آثار نمایاں ہیں - انگریزی فیشن کے تازہ ترین لباس میں -]

(دھیمی آواز سے) افسوس میری سب کوششیں بیکار ہوئیں - انسان روز بروز بدی کی طرف مائل ہو رہا ہے جسقدر میں اُسے برائیوں سے بچانے کی کوشش کرتا ہوں اسیقدر وہ گناہ کے دلدل میں پھنستا جاتا ہے - آہ وہ بھی کیسا بُرا دن تھا جب میں نے اس خاک کے پتلے کو سجدہ کرنے سے انکار کیا لیکن (غصہ ہوکر) اس سرکش و نافرمان ہستی کو سجدہ - نہیں - ہرگز نہیں - ہزار بار نہیں - جبکی سرشت ہی بد ہے - جسے نیک و بد کی تمیز ہی نہیں - اسے سجدہ کرنا گناہ کبیرہ ہے (پھر دھیمی آواز سے) لیکن آخر اس سزا کا کب خاتمہ ہوگا - لاکھوں برس اسی طرح گزر گئے مگر ابھی تک نجات کا دن دور نظر آتا ہے - اور اب تو مجھے روز بروز مایوسی ہوتی جاتی ہے - یا خدا آخر کبھی اس قید ہستی سے رہائی بھی ہوگی - کبھی اس سزا کا خاتمہ بھی ہوگا -

(کوچ پر سر تھام کر بیٹھ جاتا ہے - تھوڑی دیر کے بعد میز پر رکھی ہوئی گھنٹی بجاتا ہے بیلزیبب داخل ہوتا ہے)

بیلزیبب - کیا حکم ہے - ؟

شیطان - کوئی نئی خبر ؟

بیلزیبب - (خاموش رہتا ہے)

شیطان چپ کیون ہو ؟

بیلزیبب - اِس بڈھے نے خودکشی کرلی -

شیطان - آہ (کچھ وقفہ کے بعد) مگر تمہارے امداد واعانت کے باوجود . . . . .

بیلزیبب - میرے پہنچنے سے قبل ہی اسکا کام تمام ہوگیا تھا -

شیطان - اور کہین سے کچھ خبر آئی ؟

بیلزیبب - جونس نے آج پھر شراب پی کر اپنی بیوی کو مارا - اُسکے ہمسایوں نے بیچ بچاؤ کرنا چاہا تو وہ اور بھی برافروختہ ہوگیا - آخر یہانتک بات بڑھ گئی کہ پولیس نے اسکا چالان کردیا -

شیطان - لیکن کیا تمہاری نصیحتین بالکل بیکار ثابت ہوئین - ؟

بیلزیبب - جب تک وہ ہوش مین رہتا ہے میری باتون کو غور سے سنتا ہے - اپنے کئے پر شرمندہ بھی ہوتا ہے - اور آیندہ کے لیے توبہ کرتا ہے - لیکن شراب کی بوتل دیکھتے ہی سب باتین ہوا ہوجاتی ہین - جام مے کے سامنے سارے عہد وپیمان ٹوٹ جاتے ہین -

شیطان - اور اُن مقدمہ بازون کا کیا حال ہے - ؟

بیلزیبب - کون مائیکل اور ایڈورڈ ؟ ان کے سرون پر تو مقدمہ بازی کا جنون سوار ہے عدالتی دوادوش سے نہ تھکے ہین اور نہ تھکین گے - مین نے بارہا مصالحت کی کوشش کی لیکن بے سود -

شیطان - اچھا جاؤ - جہانتک ہوسکے ان دونون احمقون مین مصالحت کی کوشش کرو - اور ہان ذرا میمن کو بھیجدینا - (جاتا ہے اور تھوڑی دیر مین میمن داخل ہوتا ہے)

میمن - کیا حضور نے مجھے یاد کیا ہے -

شیطان - ہان اس بنک کا کیا حال ہے ؟

میمن - اسکا تو دیوالہ نکلگیا - خزانچی ایک بڑی رقم لیکر روپوش ہوگیا ہے - پولیس نے بڑی تلاش وتفتیش کی لیکن - لیکن کہین پتہ نہ ملا -

شیطان - اُف ! صبح سے شام تک وہی داستان - وہی کہانی - اب یہ مصیبت مجھ سے برداشت نہیں ہوسکتی ہے ! یا خدا ! مین تو یہ کیفیت دیکھتے دیکھتے دیوانہ ہوجاؤن گا - گوشت وپوست کا ایک لوتھڑا جسے خود اپنے نفع ونقصان کی پہچان نہین جو اپنے ذرا سے فائدے کے لیئے اپنے صدہا بھائیون کا گلا کاٹنے کو تیار ہے - جس کو اپنے عیش وآرام کے واسطے اپنے ہمجنسون پر انتہائی مظالم برپا کرنے سے بھی عار نہین ہوتا کیا ایسی ناپاک وشرارت انگیز ہستی انسان کہے جانے کے قابل ہے خودغرض، بدباطن

بد طینت جو اپنے کمزور بھائیوں کو ان خدائی نعمتوں سے محروم کرتی ہے جو خلق اللہ کے آرام و آسائش کے لیے پیدا کی گئی ہیں۔ جو اوسنے نفع پر اپنا دین و ایمان سبھی برباد کرنے کے لیے تیار ہو۔ تف تجھ پر ہزار بار تف (یمین کو کھڑا ہوا دیکھکر) این ابھی تک تم گئے نہیں۔ اچھا دیکھو شرابی جونس کی بیوی آج بے آب و دانہ پڑی ہوئی ہے۔ اسکا شوہر حوالات میں ہے۔ اس کو اپنی طرف سے پانچ پاونڈ دے آؤ۔

(یمین جاتا ہے)

(دھیمی آواز میں) آہ میں بھی کیسا بدنصیب ہوں۔ اپنے مقدس وطن سے دور اس سرزمین گناہ میں دربدر خاک اڑاتا پھرتا ہوں ان نفس کے بندوں کو جنکا ضمیر کور باطن ہے اور جن سے مجھے دلی نفرت ہے کب تک میں نیکی کی ترغیب دیتا رہوں گا۔ اور کب تک ان آنکھ کے اندھوں اور کان کے بہروں کو راہ راست پر لانے کی کوشش کرتا رہونگا۔ اے خداوند ارض و سما، اے خالق دو عالم اے رب قدیر آخر میری سزا کبھی ختم بھی ہوگی۔ آخر میرا قصور کبھی معاف بھی ہوگا۔ کیا واقعی میرا گناہ ایسا عظیم تھا۔ کیا غرور کی اتنی سخت سزا واجب ہے۔ پروردگار عالم تو حاضر و ناظر ہے۔ سب کچھ دیکھتا اور سب کچھ جانتا ہے۔ تجھے معلوم ہے کہ میں اپنے فرائض منصبی میں کسقدر مستعد رہتا ہوں۔ میں تیری ہی مرضی پر چل رہا ہوں اور تیری ہی مرضی ہے کہ جس سے مجھے نفرت تھی اُسی کی اولاد کے ذریعہ میری نجات ہو۔

(پردہ گرتا ہے)

دوسرا سین

[الگزینڈر کا ڈرائنگ روم۔ ایک جانب دیوار پر یوجین کی تصویر آویزان ہے۔ موجود۔ روزا الگزینڈر کی حسین بیوی عمر تقریباً پچیس ۲۵ سال دراز قد چھریرا بدن بڑی بڑی آنکھیں ستوان ناک شام کے لباس میں بوقت شام)

روزا جاکر یوجین کی تصویر کے سامنے کھڑی ہو جاتی ہے۔

روزا۔ (دھیمی آواز میں) یوجین۔ تمہاری چمکدار آنکھیں مجھے کیوں اپنی طرف کھینچے لیتی ہیں۔ ان میں کونسی قوت ہے جو مجھے بے اختیار کئے دیتی ہے۔ کیسا جادو ہے جو میرے تن بدن پر مسلط ہو رہا ہے۔ ان کو دیکھکر میری روح تڑپ اُٹھتی ہے۔ میری ساری کوشش بیکار اور میری تمام جدوجہد ختم ہو جاتی ہے۔ جیسے مقناطیس کے آگے سوئی کی کوئی حقیقت نہیں ویسے ہی ان کے سامنے میری قوت ارادی بے بس ہو جاتی ہے۔ میرے اعضا بھی میرے کہنے میں نہیں رہتے۔ یوجین! کاش تم کو میرے دلکی حالت معلوم ہوتی۔

[کسی کے آنے کی آہٹ سنکر پیچھے ہٹ کر فوراً ایک صوفہ پر بیٹھ جاتی ہے یوجین اور اسکا شوہر الگزینڈر آپسمین باتین کرتے ہوئے آتے ہین۔ الگزینڈر: فربہ اندام چہرہ سرخ، یوجین بڑھکر روزا سے مصافحہ کرتا ہے۔ دونون ایک دوسرے کی مزاج پرسی کرتے ہین اور قریب پڑے ہوئے صوفون پر بیٹھ جاتے ہین۔]

روزا۔ (یوجین سے) آپ فرانس سے کب واپس آئے۔

یوجین۔ ایک ہفتہ کے قریب ہوا۔ مین خود شرمندہ ہون کہ اب تک حاضر خدمت نہ ہوسکا لیکن اسطرف مجھے سر اُٹھانے کی بھی مہلت نہ تھی۔

روزا۔ آپ کی خودغرضی کی بھی کوئی انتہا ہے۔ ایسی خاموشی سے کھسک گئے کہ کسی کو کانون کان بھی خبر نہ ہوئی ایک عرصہ سے ہم لوگ فرانس جانے کا ارادہ کر رہے ہین۔ مجھے معلوم ہوتا تو مین بھی الگزینڈر سے آپ کے ساتھ چلنے کو کہتی کیون الگزینڈر ٹھیک ہے۔

الگزینڈر۔ (جمائی لیتے ہوئے) ہان پیاری! مین تمہاری خواہش رد نہ کرتا۔

روزا۔ خیر ابھی شبنہ کو میرا ارادہ ایک پک نک کا ہے۔ کوئی پہاڑی مقام ہو۔ صاف چشمہ اور عمدہ سینری کیلئے آپکو منظور ہے؟

یوجین۔ بسر وچشم۔

الگزینڈر (گھڑی دیکھکر) روزا مجھے ایک ضروری جلسے مین شریک ہونا ہے۔ دوست یوجین! اسوقت معافی چاہتا ہون! کل ملینگے۔ گڈ اُیوننگ۔

یوجین۔ گڈ اُیوننگ۔

(یوجین و روزا باتین کرتے ہین)

روزا۔ یوجین تمنے میرا نیا البم دیکھا ہے؟

[البم میز پر رکھا ہے روزا اُسے لانے کیلئے جاتی ہے اور البم لیکر واپس آتی ہے اور اپنا صوفہ قصداً یوجین کے صوفہ سے قریب کردیتی ہے۔ لیکن اس انداز سے کہ کسی غیر معمولی بات کا احساس نہیں ہونے پاتا ہے صوفہ پر بیٹھ جاتی ہے اور ایک تصویر دکھلاکر)

یہ دیکھکر کوہ الپس کی سربفلک چوٹیون کا منظر۔ کتنا دلکش! کیسا بینظیر ہے! پچھلے موسم گرما مین مین اور الگزینڈر سوئٹزرلینڈ گئے تھے یہ تصویر میری ہی کھینچی ہوئی ہے۔ جب مین نے ان برف سے ڈھکی ہوئی چوٹیون کو پہلی بار دیکھا تھا۔ اسوقت کی کیفیت مین تم سے کیا بیان کرون۔ ایک لمحے

تک تو میرا دل دہڑکتا ہی رہا لیکن اسکے بعد زبردست خواہش پیدا ہوئی کہ جس طرح ہو دوڑ کر ان چوٹیون کے اوپر پہونچ جاؤن۔ (کچھ سوچکر دفعتًا) یوجین تمکو معلوم ہے پرسون شب کو لزلی کے یہان رقص وسرود کا جلسہ ہونے والا ہے۔ تمہاری رائے مین مجھے کس لباس مین جانا چاہیئے۔

یوجین۔ تم ہر لباس مین بھلی معلوم ہوتی ہو۔

روزا۔ یہ تمہاری نری خوشامد ہے۔ اور تم صرف مجھے خوش کرنے کیلئے ایسا کہہ رہے ہو۔

یوجین۔ نہین، نہین۔ یہی حقیقت حال ہے۔

روزا۔ تو کیا جو کچھ تم کہتے ہو دل سے کہتے ہو۔

یوجین۔ (ذرا پریشان ہوکر) واقعی آپ کو اسمین شک ہی کیون ہوتا ہے۔

[روزا دفعتًا کھڑی ہوجاتی ہے۔ یوجین کے کندھے پر ایک ہاتھ رکھکر]

روزا۔ یوجین نہ معلوم کیون میرا دل بیٹھا جاتا ہے۔ میرا سر چکر کھا رہا ہے [غش کا بہانہ کرکے ہاتھ پاؤن ڈھیلے کرلیتی ہے یوجین اسے گرتا ہوا دیکھکر مجبورًا اپنی آغوش مین لے لیتا ہے اور آہستہ سے صوفہ پر لٹاکر اسکا سر اپنی گود مین رکھ لیتا ہے روزا کی گرم گرم سانس اسکے گالون کو مس کرتی ہے اسکی نرم ونازک جسم کے احساس سے اسکا خون سرعت سے دوڑنے لگتا ہے۔ یوجین اپنی آنکھیں پھیر لیتا ہے۔ پھر آہستہ سے پکارتا ہے۔

یوجین۔ روزا۔ روزا۔

روزا۔ (آنکھین کھولکر) یوجین!

یوجین۔ شکر ہے۔ تم ہوش مین تو آئین۔ خدمتگار کو بلاؤن!

روزا۔ نہین۔ (پھر آنکھین بند کرلیتی ہے)

[دفعتًا یوجین روزا کے لبون کا بوسہ لینے کے لیے جھکتا ہے۔ لیکن فورًا ہی اس فعل کی اہمیت کو محسوس کرکے سنبھل جاتا ہے اور روزا کا سر جلدی سے اپنے زانو سے ہٹا دیتا ہے اور بہ عجلت تمام کمرہ سے باہر نکل جاتا ہے۔]

(پردہ گرتا ہے)

تیسرا سین

[شیطان کا کمرہ رات کا وقت شیطان داخل ہوتا ہے (چہرہ سے فکر تردد کے آثار نمایان ہین میز پر رکھی ہوئی گھنٹی کو زور سے بجاتا ہے۔ بیلز بیب اور میمن داخل ہوتے ہین]

بیلزیبب - ارشاد!

میمن - ارشاد!

شیطان - فوراً سفر کی تیاری کرو۔ ایک گھنٹہ کے اندر مین یہان سے باہر چلا جانا چاہتا ہون تم دونون کو بھی ساتھ ہی چلنا ہوگا - اور ہان مالک مکان کو خط لکھدو اور جسقدر کرایہ باقی ہو بھیجدو۔

میمن - حضور کس طرف تشریف لے جائین گے۔

شیطان - کہین بھی انگلستان کے باہر۔

بیلزیبب - کیا زیادہ عرصہ تک باہر رہنا ہوگا۔

شیطان - ہان۔ کچھ عرصہ تک کے لئے تو باہر ہی قیام رہے گا۔

(دونون جاتے ہین)

شیطان - (دھیمی آواز سے) آہ مین نہین جانتا تھا کہ میرا دل اتنا کمزور ایسا بودا ہے۔ مجھے نہین معلوم تھا کہ مین اتنی آسانی سے ایک عورت کا شکار ہو جاؤن گا۔ میری سرشت نور سے ہوئی ہے اور وہ ایک فانی ہستی جو آج ہے کل نہین۔ مین ہزارہا سال سے انکے درمیان رہتا ہون ان کے حرکات و سکنات سے بخوبی واقف ہون۔ مگر کیسے شرم کی بات ہے کہ کل تک جس ہستی کو مین حقارت کی نگاہ سے دیکھتا تھا آج اُسی کے ایک فرد سے مین مغلوب ہوگیا ہون۔

[غور و فکر مین پڑ جاتا ہے کچھ وقفہ کے بعد جوش مین آکر]

آہ اب مین سمجھا! یہ واقعہ ایک غیبی بشارت ہے۔ افسوس میرا غرور بیجا تھا۔ اور اسی کی سزا مجھے مل رہی ہے۔ مین اپنے زہد و تقوے کے گھمنڈ مین کسی کو خاطر ہی مین نہ لاتا تھا۔ اسی کے بل پر مین نے آدم کو سجدہ کرنے سے انکار کیا۔ کل تک مجھے تعجب تھا کہ پروردگار عالم نے مجھے کیون اس جرم و خطا کے پتلے کو سجدہ کرنے کا حکم دیا تھا۔ مین اپنے کو اس نقش فنا سے کہین بہتر سمجھتا تھا۔ مگر آج مجھے اپنی کمزوری۔ اپنی بے بسی کا احساس ہوگیا۔ واقعی دنیا کی منزل کٹھن ہے۔ عمل کی راہ بڑی دشوار گزار ہے۔ اور انسان کے سامنے سخت مشکلا ہین طرح طرح کی ترغیبات حائل ہین۔ قسم قسم کی برائیان اسکو اپنی طرف کھینچتی ہین۔ ان کے باوجود بھی جو انسان اس جادۂ ہستی مین نیکی و نیک نفسی پر ثابت قدم رہین اور اپنے فرائض یاد رکھین وہ ہزار تحسین کے مستحق ہین۔ (اپنا چہرہ ہاتھون سے چھپا لیتا ہے)

(پردہ گرتا ہے)

سری نرائن نگم

چھوٹی لین

(از مسٹر رام سرن نگم - ایم - ایس - سی -)

(۱)

جناب میرا مطلب ریلوے کی چھوٹی لین سے ہے جسکو انگریزی مین METER GAUGE کہتے ہین۔ خدا رکھے اس چھوٹی لین مین بہت سی خوبیان ہین پولیس کی طرح اسمین گورنمنٹ کے تلنگے نہین ڈھلتے نہ بڑی لین کی طرح روپیہ کمایا جاتا ہے اسکا اصلی مقصد صرف خلق اللہ کو آرام پہونچانا ہے مثل مشہور ہے "کم کھانا و غم کھانا" یہی اسکا مدعا ہے۔

یون تو ہر شخص کے چار دوست چار دشمن ہوتے ہین مگر سچ پوچھئے تو چھوٹی لین کا دلسے کوئی بدخواہ نہین ہے۔ آپ اس پر نہ جائیے کہ اخبارون مین آئے دن لوگ اسکے دکھڑے رویا کرتے ہین۔ یہ تو آجکل کے اخبارون کی معمولی شبیدہ بازیان ہین یا درنامہ نگار اصحاب کے ادنے کرشمے ہین۔ جب کبھی کونسلون کی کارروائیون۔ ممبرون کے سوال و جواب ملکی۔ قومی صوبہ داری و پیشہ وری کانفرنسون کی روئداد اور متعدد یونیورسٹیون کے امتحانات کے نتائج سے جگہ بچی تو بیچارے ایڈیٹران اخبارات کیلئے اسکے سوائے اور چارہ کار ہی کیا ہے کہ ادنے سے ادنے معاملات کو بڑھا گھٹا کر اپنے ناظرین کے تفنن طبع کا سامان مہیا کرین۔ جھوٹے قصے فرضی افسانے چھاپین۔ من گھڑت کہانیان اور مصنوعی شکائتین شائع کرین۔ بیچاری چھوٹی لائن بھی اس خوئے بد کا شکار ہے۔ اور جب اخبارون کو اور کچھ چھاپنے کو نہین ملتا ہے تو اس غریب ریل کے متعلق گمنام شکایتی خطوط چھاپنا شروع کر دیتے ہین۔ لیکن ذرا غور فرمائیے اگر یہ خطوط اصلی نامہ نگارون کے لکھے ہوئے ہون یا ان کے شکائتین سچ اور درست ہون تو پھر نامہ نگارون کو اپنے نام پوشیدہ رکھنے کی کیا ضرورت پیش آئے اور یہ تحریرین تہیخانہ کے بچون کی طرح گمنام کیون رہین۔ اس پر طرہ یہ ہے کہ ان خطوط کے اوپر صاف اور واضح طور پر لکھا ہوتا ہے کہ "اڈیٹر اخبار نامہ نگارون کی رائیون کا ذمہ دار نہین" مین پوچھتا ہون کہ مراسلہ گمنام اور اسکے شائع کرنے والے صاحب بری الذمہ پھر ان تحریرون کی کیا وقعت ہوسکتی ہے۔ آخر ریلوے کمپنی کیون ان کا لحاظ کرے۔ یہی وجہ ہے کہ ڈائرکٹر صاحبان ان تحریرات پر مطلق دھیان نہین دیتے اور اسمین تعجب کی بات ہی کیا ہے۔ آخر بڑے بڑے بادشاہون تک

مخالف ہوا کرتے ہین۔ بغض وحسد رنج وکینہ کا جواب ہی کیا ہوسکتا ہے "جواب جاہلان باشد خموشی" یہی طرز عمل چھوٹی لین کے افسران کا ہے۔ آپ خدا نخواستہ یہ نہ سمجھ لیجئے گا کہ انکی موشی نیم رضا اور کمپنی کے سکوت سے کہیں یہ قیاس کرلیجیگا کہ حکام چھوٹی لین نے کبھی کسی معاملے مین اپنا قصور تسلیم کرلیا ہے۔ نہ جناب یہ نہ ہوگا۔ اول تو چھوٹی لین مین کوئی نقص ہی نہین ہوسکتا ہے اور پھر اگر خدانخواستہ کوئی قصور بھی ہو تو افسران اسکے طرف توجہ دیکر کب بات کا بتنگڑ بنانے لگے۔ لیکن سچ پوچھئے تو آجتک جتنی شکائتین ہوئی ہین سب غلط اور بے بنیاد اسی لیئے مین بزبان معصوم ریلوے کی حمایت کے لیے مستعد ہون۔

آپ نے اکثر دیکھا ہوگا کہ جب کبھی کسی وجہ سے کسی دفتر کا کوئی ملازم برخاست کردیا جاتا ہے تو اسکے متعلق بیسیون گمنام خطوط اخبارون مین نکلنے لگتے ہین مگر یہ سب خطوط اسی برخاست شدہ ملازم کے لکھے ہوتے ہیں اسی سے ان کی وقعت نہیں ہوتی اور ہونا بھی نہ چاہیئے۔ اسی طرح ایک صاحب نے ایک خط مین لکھا ہے کہ اس ریل کی بے توجہی موجودہ تہذیب کیلئے باعث شرم ہے۔ مگر مین اس شرمیلے نامہ نگار سے صاف صاف عرض کئے دیتا ہون کہ اسکا یہ لکھنا سراسر فضول ہے۔ کمپنی اب بھی توجہ ہے اور رہے گی۔ اگر کسی کا یہ خیال ہے کہ اس طرح دھمکانے سے کمپنی مرعوب ہوجائے گی۔ اور وہ اپنے خیال کے مطابق اسکو ترقی پر مائل کرسکے گا۔ تو وہ صریحاً غلطی پر ہے۔ جسکو آپ "ترقی" یا "ریفارم" سمجھتے ہین وہ کمپنی کے نزدیک تنزلی ہے۔ آپ ان خیالات خام کو دل سے نکالدیجئے چھوٹی لین مین شروع ہی مین انتہائی ترقی ہوچکی ہے اور اب اس مین کسی ترمیم وتنسیخ کی گنجائش نہین ہے۔ "این خیال است ومحال است وجنون" آفرین ہے کمپنی کی بلند ہمتی اور مستقل مزاجی پر کہ وہ ان بزدلانہ حملون کا مطلق خیال نہین کرتی بلکہ نفرت کی نگاہ سے دیکھتی ہے۔ ایک لطف اور ہے۔ شکائتین تو ہندوستان کے اخبارون مین نکلتی ہین مگر ڈائرکٹران سات سمندر پار انگلستان مین رہتے ہین۔ درحقیقت وہ اسی شرط سے منتخب کئے جاتے ہین۔ کہ کبھی کوئی ہندوستانی اخبار نہ دیکھینگے اب رہے ملازمان وہ اس بارے مین کوئی خط وکتابت نہین کرسکتے۔ غرض یہ تمام فضول شکائتین یون ہی رہ جاتی ہین۔ کوئی قضیہ ہوتا ہے نہ قصہ جسطرح شب ہجر کے فرضی مصائب کی معشوق کو خبر نہین ہوتی ہے اسی طرح ڈائرکٹران کمپنی بیکار باتون پر کان نہین دیتے ہین

بعض اصحاب کو یہ شکایت ہے کہ چھوٹی لین کا کوئی ٹائم ٹیبل نہین نکلتا۔ لیکن ذرا غور فرمائیے تو آپ اس اعتراض کو غلط بلکہ سراسر غلط پائین گے۔ ہر اسٹیشن پر اردو ہندی مین نہ سہی انگریزی مین ضرور کسی نہ کسی وقت ٹائم شیڈٹ آویزان کیا گیا ہے۔ پھر تبلائے ٹائم ٹیبل کی کیا ضرورت ہے؟ چھوٹی لین

کوآئے دن کی تبدیلیون سے نفرت ہے اسکے اوقات مستقل ہین جو کافی غور و فکر کے بعد ہمیشہ کیلئے قائم کئے گئے ہین اور ہر شخص کو ان سے واقف ہونا ضروری ہے۔ ورنہ لاعلمی کا علاج تو قانون کے پاس بھی نہین ہے۔ خیر کچھ ہو چھوٹی لین شروع سے اخیر تک ایک وضع پر قائم ہے۔ وہ دوسری ریلون کی طرح لوگون کا روپیہ فضول برباد کرنا گناہ سمجھتی ہے۔ آخر بار بار نئے ٹائم ٹیبل چھاپنے سے سوائے اسکے اور کیا فائدہ ہے کہ وقتاً فوقتاً آپکے ردّی کی ٹوکری کیلئے سامان مہیا ہوتا رہے۔ یہ فعل عبث ہے اور چھوٹی لین کے افسران فضول نمود و نمائش کے خلاف ہین۔ وہ پبلک کو لوٹنا نہین چاہتے اور نہ متلون طبع واقع ہوئے ہین۔ سچ پوچھئے تو ان کا رویہ بالکل درست ہے آپ نے دیکھا ہوگا کہ اکثر جنتریون اور پتروں مین طلوع و غروب آفتاب کے اوقات درج رہتے ہین مگر آپ نے کبھی کسی شخص کو ان معلومات سے فائدہ اُٹھاتے بھی دیکھا؟ لوگون کو معلوم ہے کہ سرکاری کارڈ آدھ آنہ اور لفافہ ایک آنہ کو ملتا ہے۔ بلا ٹکٹ خطوط بیرنگ ہو جاتے ہین اور ان کا دوچند محصول ڈاک دینا پڑتا ہے۔ بیس روپیہ سے زائد روپیہ کے وادوستد پر ایک آنہ کا ٹکٹ لگانا ضروری ہوتا ہے۔ آپ ہی فرمائیے کہ ان معلومات کے واسطے کتنے لوگ پوسٹل گائیڈ یا اسٹامپ ایکٹ کی ورق گردانی کرتے ہین پھر چھوٹی لین سے ٹائم ٹیبل کی اشاعت کا لوگ کیون مطالبہ کرتے ہین؟

اس کمپنی کے اغراض و مقاصد اشتہاری نہین ہین اور روپیہ کمانے کی ادنے تدبیرین اس کو بالکل پسند نہیں جس طرح اور بہت سے مقررہ پیمانے ہین اسی طرح چھوٹی لین کے اوقات آمد و رفت بھی سمجھ بوجھکر معین ہو چکے ہین جب ان مین کوئی تبدیلی ہی نہین ہوتی تو پھر ٹائم ٹیبل کی کیا ضرورت ہے؟

ایک شکایت یہ بھی سننے مین آئی ہے کہ جنکشنون مین چھوٹی لین کا دوسری ٹرینون کے وقت سے میلان نہین ہوتا ہے۔ خوب! یہ الزام بیچاری چھوٹی لین کے سر فضول لگایا جاتا ہے۔ درحقیقت مسافرون کو جنکشن تک پہونچا دینے کے بعد چھوٹی لین کا کام ختم ہو جاتا ہے اب یہ اور کمپنیون کا کام ہے کہ اپنی مسافرون کے آرام و آسائش کا لحاظ رکھین وہان تو ہر ماہ وقت تبدیل ہوا کرتے ہین جس طرح چاہین اپنے ریلون کے اوقات درست کرلین اور مسافرون کو ناحق پریشان نہ کرین۔ مگر غور کیجئے تو اسمین بھی ایک مصلحت مضمر ہے لوگ اسی طرح کانپور۔ لکھنؤ وغیرہ کی سیر اور کاشی پراگ وغیرہ کے اشنان کر سکتے ہین دوسرے اس سے یکہ ٹانگہ والون کی بھی پرورش ہو جاتی ہے۔ اگر مختلف ریلون کے اوقات ملا دیئے جائین تو اسٹیشن پر مسافرون کا ہجوم ہی نہ ہونے پائے اور صدہا دوکاندار و خوانچہ والے جن کی معاش کا دارومدار صرف مسافرون کے سود اسلف پر ہے بھوکون مر جائین۔

کبھی کبھی اخبارون مین یہ بھی مطالبہ کیا جاتا ہے کہ چھوٹی لین کو بڑا کر دیا جائے مگر مجکو اس بیجا مطالبے پر سخت حیرت ہوتی ہے۔ یہ کوئی سرکاری پوسٹ کارڈ یا لفافہ نہین ہے کہ کل چھوٹا تھا آج بڑا ہو گیا آپ پہلے گنگا جمنا کے پاٹ کو ذرا کم و بیش کر دیجئے۔ یا گیندے یا تلسی کے پودھے کو پیپل کے درخت کے برابر اونچا کر دیجئے۔ یہ ناممکن ہو تو اتنا ہی کر دکھائیے کہ روپیہ کے سولہ آنہ کے بجائے بیس آنے ملنے لگین اسکے بعد چھوٹی لین کے توسیع و ترقی کا مطالبہ کیجئے۔ میرا خیال تو یہ ہے کہ اگر خدانخواستہ کبھی ہماری چھوٹی لین کو بڑی لین بننا پڑے۔ تو پھر دیکھئے گا لوگ چھوٹی لین کا نام لیکر خون کے آنسو روئین گے۔ آپ چھوٹی لین کے چھوٹے چھوٹے ڈبّون میں چند ساتھیون کے ساتھ بیٹھ جائیے پھر دیکھئے آپکو اپنے مکانون کا لطف آئیگا۔ مجھے تو اس بات کا دلی افسوس ہے کہ معترضین اس لین کے محاسن پر غور نہین کرتے ہین۔ قد و قامت کی بحث چھیڑ دیتے ہین۔

بڑا سا قد تو شاعرون کو بھی پسند ہوتا ہے۔ پھر معلوم نہیں کہ لوگ اس لین کا قد و قامت بڑھانے کے کیون درپے ہین یہ تو بیگاتی ریل یا فینسی ریل ہے۔ اسکی خوبصورتی اسمین ہے کہ یہ چھوٹی لین ہے۔

بعض لوگون کا ایک اور اعتراض ہے کہ اسکی رفتار سست ہے مگر یہ اسکی وضعداری ہے کہ ابتک آہستہ خرام بلکہ خرام کی قائل ہے اور اسکی رفتار بال بچّون بڈھون بیماروں سب کیلئے خاص طور پر موزون ہے۔ آخر جلدی کیا ہے اسمین بیٹھکر سفر کرکے آپ قدرتی نظارون کی بھی مفت مین سیر کر سکتے ہین۔ یہ رئیسون کی سواری ہے اسطرح چلتی ہے کہ پیٹ کا پانی بھی ہلنے نہین پاتا ہے۔ جناب یہ کوئی آندھی روگ نہین ہے۔ چھوٹی لین ہے اور مین تو طوفان میل کی تیز رفتاری کا سخت مخالف ہون۔ اسکے رفتار ہی کی بدولت آپ محض کیمرہ سے چلتی ہوئی ٹرین کا فوٹو بھی لے سکتے ہین۔ اور اگر آپکو واقعی تیز رفتار سواری کی ضرورت ہے تو ریل کا سفر ہی ترک کیجئے اور موٹر کے خطرون کا سامنا کیجئے ہوائی جہاز پر سیر و تفریح کا بندوبست کیجئے اور ہفتہ مین دو بار ولایت کیا بہشت برین کی سیر کر آیئے۔ آخر یہ چھوٹی لین ہے۔ کوئی گھوڑ دوڑ کی گھوڑی نہین ہے اور یہ بھی تو سوچئے کہ کہ اس بیچاری ریل کو روزانہ کتنا طول و طویل سفر کرنا پڑتا ہے تھوڑا فاصلہ ہو تو بلاسے اپنی رفتار تیز ہی کر دے۔ دوسری ریلون مین دیکھئے کہ مسافرون پر ہر وقت رعشہ طاری رہتا ہے۔ لکھنے پڑھنے کا کام نہین کر سکتے ریل کا ہچکولہ ہے زلزلہ ہے آپ گھڑی کے پنڈولم کی طرح اِدھر اُدھر جھوم رہے ہین۔ چھوٹی لین کو دیکھئے کہ مسافرون کو حرکت کا احساس ہی نہین ہوتا۔ مین نے تو یہ بھی سنا ہے کہ اسی وجہ سے سالگذشتہ کے جلسہ ڈائرکٹران مین یہ مسئلہ زیر

تھا کہ جب کبھی چھوٹی لین ٹھہرے تو ہر درجہ مین مسافرون کو اسکی اطلاع دینے کے لیے ایک بجلی کی گھنٹی بجا کرے تاکہ لوگون کو اس بات کا یقین ہوجائے کہ گاڑی واقعی کھڑی ہے۔ چلتی نہین۔

بہرحال یہ بات تو چھوٹی لین ہی کو نصیب ہے کہ مسافر چاہین تو چلتی ہوئی گاڑی پر آسانی سے چڑھ اُتر سکتے ہین اسی لیے اسکے پائیدان خاص طور پر نیچے بنائے گئے ہین۔ اور پختہ سڑک کے کنارے کنارے تار وغیرہ کی حدبندی کے بغیر اسکی ریل دوڑائی گئی ہے گویا لاین بھر مین اسکا پلیٹ فارم موجود ہے یہ رعایتین اور ریلون مین کہان میسّر ہین؟

دنیا مین ناشکرون کی کمی نہین ہے۔ چنانچہ یہ شکایت بھی سننے مین آتی ہے کہ چھوٹی لین اکثر لیٹ ہوجاتی ہے مگر اسمین کسی کا کیا قصور ہے۔ یہ شکایت سخت بیجا ہے۔ بات یہ ہے کہ اس معاملے مین اسنے ہندوستانی طرز عمل کو مدنظر رکھا ہے۔ وقت کی پابندی نہ رئیسون سے ہوسکتی ہے اور نہ غریب دہاتیون سے ممکن ہے۔ پھر تھوڑی تاخیر تو شان امارت مین داخل ہے۔ بہرحال اس سے عوام کی آرام و آسائش ہی مقصود ہے اور جو لوگ وقت پر یا وقت کے پہلے آئین وہ شوق سے مسافرخانے اور ویٹنگ روم مین آرام کرین کمپنی اسکے لیے ان سے کوئی کرایہ طلب نہین کرتی۔ اگر آپکو اسٹیشن آنے مین دیر ہوجائے تو آپ دو چار میل دوڑ کر بھی چھوٹی لین پر بیٹھ سکتے ہین۔

چھوٹی لین مین حفظان صحت کا خیال رکھا ہے کون نہین جانتا کہ چلتی ہوئی سواری مین پڑھنا آنکھون کے لیے مضر ہے۔ اسی وجہ سے یہ اپنے گاڑیون مین رات کے وقت بہت مدھم روشنی کرتی ہے تاکہ مسافر فضول کتب بینی سے اپنی آنکھین خراب نہ کرلیں۔

کمپنی ایک اور معاملے مین بھی پبلک کا بڑا خیال رکھتی ہے۔ اسی کے گودام ایسے ہین جہان عرصہ تک آپ کا مال بلاکرایہ رکھا جاتا ہے یہ بات اور کسی ریل مین ممکن نہین کہ آپ کچے پھل بھیجین اور وہ مقام مقصود پر پختہ ہوکر پہونچین۔ اسپر لطف یہ کہ اسکے ملازمین چکھ کر یہ بھی دیکھ لیتے ہین کہ پھل خراب تو نہین ہوگئے ہین۔

غرض اس غریب پرور لین کی کہان تک تعریف کیجائے۔ اس کی وضعداری دیکھئے۔ اب تک ایک ہی رنگ پر قائم ہے۔ یہ نہین کہ اور ریلون کی طرح آج سرخ رنگ لیا۔ کل سبز رنگ چھوٹی لین کو اس تلوّن سے سخت نفرت ہے۔ اسکو اپنی یک رنگی پر ناز ہے۔ اور لوگ کچھ کہین یہ اسی رنگ پر قائم رہے گی۔

اُردو ہندی اور رسالہ زمانہ

(از مصور فطرت حضرت خواجہ حسن نظامی صاحب دہلوی)

اُردو اور ہندی زبانین دونون ایک ہی ہین ان مین وہی لوگ فرق سمجھتے ہین جو ان دونون کی باہمی مناسبت سے واقف نہین ہین یا ان دونون کے میل جول پر غور نہین کرتے۔

اُردو ہندی کے مسئلہ پر بہت کچھ لکھا گیا ہے اور لوگ اسپر غور کر چکے ہین کہ اُردو اور ہندی بلحاظ بول چال کے دو نو ایک ہی ہین ان مین جدائی بہت ہی تھوڑی ہے البتہ رسم خط کا فرق ایک خاص فرق ہے مگر اسکے لیے ہندو مسلمانون کا آپسمین بگاڑ ہونا بہت نامناسب ہے۔ مسلمانون کو یہ خیال کرنا چاہیئے کہ ہندی رسم الخط ہندوستان کا ہے جو ہمارا موجودہ وطن ہے اور ہمارے ہندو پڑوسیون اور ملکی بھائیون کا رسم الخط ہے اسواسطے ہمین بھی اس رسم الخط کی ترقی اور حفاظت مین حصّہ لینا چاہیئے ہندو بھائیون کو یہ خیال کرنا چاہیئے کہ اُردو زبان سنسکرت اور برج بھاشا سے نکلی ہے لہذا اُردو کی ترقی وحفاظت بھی ایک لحاظ سے ہندی برج بھاشا ہی کی ترقی وحفاظت ہے۔ رہا اُردو کا رسم الخط سو یہ بھی ہندؤن کو اجنبی اور غیر نہ سمجھنا چاہیئے۔ کیونکہ اُردو کا رسم الخط اگرچہ عربی وفارسی سے نکلا ہے تاہم ایشیائی رسم الخط ہونے کے اعتبار سے ہندوستان کے ہندؤن کا حریف نہین ہوسکتا۔

کانپور کا رسالہ زمانہ ان ہندو رسالوں میں ہے جنھون نے سالہاسال کی عملی محنت سے ثابت کیا ہے کہ اُردو زبان محض مسلمانون ہی کی زبان نہین ہے بلکہ ہندو قوم بھی اُسکو اپنے ملک کی زبان کی طرح عزیز رکھتی ہے۔

مجھے ہندوستان کے اُردو رسالون مین ایسا کوئی بھی رسالہ معلوم نہین ہے جس کے ہر نمبر مین مشترکہ طور پر ہندو مسلمان مضمون نگارون نے سالہاسال لگاتار مضمون لکھے ہون اور رسالہ زمانہ کی یہ خصوصیت اُردو زبان کی تاریخ مین سب سے اونچے درجہ پر لکھنی چاہیئے۔

جب ان کو اپریشن کے زمانہ مین ہندو مسلمان ایک دل اور ایک زبان ہوکر کام کر رہے تھے اُس سے سالہاسال پیشتر کانپور کا رسالہ زمانہ ہندو مسلمانون کا عملی اتحاد اُردو لٹریچر کی اشاعت سے ثابت کر رہا تھا۔ اور جب ترکِ موالات کی تحریک کمزور ہوئی اور ہندو مسلمانون کا ایکا ٹوٹا اور ہر قوم دوسری قوم

سے دل برداشتہ ہوگئی۔ اور اعلےٰ طبقوں سے لیکر ادنےٰ درجوں تک کے ہندو مسلمان ایک دوسرے کے حریف نظر آنے لگے اُسوقت یہی کانپور کا رسالہ زمانہ ہندو مسلم اتحاد کا لٹریری جھنڈا ہاتھ مین لیئے میدان مین کھڑا رہا۔ اور مسٹر پریم چند جیسے بے تعصب ہندو اپنی قوم کو لٹریری تعصبات سے بچانے کے لیے قلم کی تلوار کھینچکر میدان عمل مین آ گئے۔

اسلیے مین یقین کرتا ہون کہ کانپور کے رسالہ زمانہ کا یہ یادگاری نمبر ہر ہندو مسلمان کی ذاتی تقریب مسرت کی یادگار سمجھا جائیگا۔ کیونکہ زمانہ نے بڑی سے بڑی آزمائش کے ایام مین اپنی لٹریری بے تعصبی کو فضا کے زہریلے اثرات سے بچانے مین کامیابی حاصل کی اور ثابت کردیا کہ اُردو زبان نہ ہندؤن کی زبان ہے نہ مسلمانون کی زبان ہے بلکہ ہندوستانی اقوام کی مشترکہ زبان ہے۔ اور اس کی ترقی و حفاظت مین دونو قومین شریک ہین اور دونو کو شریک ہونا چاہیئے۔ اور رسالہ زمانہ کی جوبلی ہندو مسلمانون کے مشترکہ لٹریچر کی جوبلی ہے۔ اور ہم سب جب زمانہ کو مبارکباد دینے کے لیے جمع ہون تو درحقیقت اپنے آپ کو مبارکباد دینے والے ہونگے۔

حسن نظامی دہلوی

حضرت اکبر اور رسالہ زمانہ

زمانہ کو حضرت اکبر مرحوم کی پہلی نظم چھاپنے کی عزت جنوری ۱۹۰۴ء میں نصیب ہوئی تھی۔ ہمارے مرحوم محسن ان دنون علیل تھے لیکن ایڈیٹر زمانہ کا فرمائشی خط پہونچا تو آپنے اشعار ذیل عنایت فرمائے اور لکھا کہ میں اس اثنا میں علیل رہا اور ہول گذرِ زمانہ کا لفظ خیال میں تھا۔ رات کو ایک مصرع ذہن میں گذرا چلیں گے ہم بھی اُسی رخ جدھر زمانہ چلے۔ مناسب وقت اسکا دوسرا مصرع بھی لگ گیا اور اسی طرح دو چار شعر بھی ہوگئے وہ اشعار یہ ہیں۔

فلک کے سامنے کیا دم مجال بہانہ چلے — چلیں گے ہم بھی اُسی رخ جدھر زمانہ چلے
میں جانتا ہوں مجھ چھوڑنیگے آپ چال اپنی — کسی کا کام چلے اے حضور یا نہ چلے
خدا کے واسطے ساقی یہی نگاہ کرے — چلا ہے دور تو پھر کیون تمکے چلا نہ چلے
کھلا ہو باغ قناعت میں غنچۂ خاطر — خدا بچائے کہیں حرص کی ہوا نہ چلے
نصیب ہو نہ سکی دولت قدم بوسی — ادب سے جوم کے حضرت کا آستانہ چلے
فروغ عشق کا لیے آہ کے نہیں ممکن — نہ پھیلے بوئے گلستان اگر ہوا نہ چلے
خودی کے حس سے بھی ہو نہ آشنا اکبر — کہا رہوں کہ مجھے بھی مرا پتا نہ چلے

زمانہ کی سلور جوبلی

(از منشی رام دیال صاحب سکسینہ فنانشل سکریٹری دربار جاورہ)

بفضل ایزد متعال جنوری ۱۹۲۸ء مین رسالہ زمانہ کے زندگی کے پچیس سال پورے ہوتے ہین اور کارپردازان زمانہ نے اس واقعہ مسرت انتما کی یادگار مین سلور جوبلی منانے کا اہتمام فرمایا ہے۔ فی الحقیقت زمانہ نے جس استقلال و ثابت قدمی۔ علو ہمتی اور اولوالعزمی سعی، جفاکشی قابلیت و خوش انتظامی سے پچیس سال تک مسلسل ملک و قوم کی ادبی و علمی خدمات انجام دی ہین وہ مسلمہ طور پر اُسی کا حصہ ہین۔ اور اس پر اوپیٹر صاحب اور مہتمان زمانہ جسقدر ناز و فخر کرین بجا ہے۔

ہندوستان مین جوبلی منائے جانے کی رسم اب رواج پکڑتی جاتی ہے۔ عیسائی مذہب اور بالخصوص رومن کیتھلک فرقہ مین یہ رسم بہت قدیم ہے۔ اور صدیون سے منائی جاتی ہے۔ ابتداً جوبلی ہر پچاسوین سال انعقاد پذیر ہوتی تھی۔ اس موقعہ پر غلام آزاد کئے جاتے تھے نزاعات مدت العمر کا تصفیہ ہوتا تھا۔ اسکے بعد سو سال کی میعاد کچھ عرصہ تک مقرر رہی۔ پھر پچیس سالہ منائی جانے لگی۔ اب لوگ دنیاوی کاروبار کے واقعات و تقاریب کی یادگار مین بھی یہ مقررہ اوقات کی خوشیان منانے لگے ہین۔ فرمانروایان ملک اپنی تخت نشینی کے پچیس سالہ پنجاہ سالہ و شصت سالہ مدت پر خاص اہتمام و شان کے ساتھ جوبلیان مناتے ہین۔ شادی کی جوبلی منائی جاتی ہے۔ کارخانون مین جوبلی کے جلسے ہوتے ہین۔ رسالہ جات بھی اپنی عمر کے ۲۵ یا ۵۰ سال گزار کر یہ خوشی مناتے ہین۔ چنانچہ ابھی دو تین سال ہوئے کہ مشہور انگریزی رسالہ انڈین ریویو مدراس نے اپنی سلور جوبلی منائی تھی۔ مجھے یاد ہوتا ہے کہ اُسوقت مین نے اڈیٹر صاحب زمانہ کے ذریعہ تحریر عرض کیا تھا کہ اب عنقریب یہ یوم مبارک رسالہ زمانہ کے لیے بھی آنے والا ہے۔ آپ بھی جوبلی منائیے گا۔ شکر ہے کہ وہ دن آگیا۔

ویسے تو زمانہ کی ابتدا کیا اور انتہا کجا۔ لیکن کانپور کا رسالہ زمانہ ۱۹۰۳ء مین عالم وجود مین آیا بریلی مین اسکی پیدایش ہوئی اور اس کا آنکھ کو نظر آنے والا کالبد ابتدائی آٹھ دس ماہ تک منشی شیو برت لال صاحب ایم۔ اے (جو اب مہرشی ہین اور رادھا سوامی دھام بنارس سے حق پرستی اور حقیقت کی تعلیم دے رہے ہین) کی غور و پرداخت مین پرورش پاتا رہا۔ اسکے بعد سے اسکی زندگی کی کفالت اڈیٹر صاحب حال (منشی دیانرائن صاحب نگم

بی۔ آے) کی تفویض مین آئی۔ اڈیٹر صاحب موصوف نے اِس آٹھ مہینہ کے بچّہ کو لیکر جس ناز و نعم سے پالا ہے اور اب پچیس سالہ جوان کر دکھایا ہے وہ ناظرین زمانہ سے مخفی نہین۔ انکے حق مین یہی منہ سے نکلتا ہے۔

ع این کار از تو آید و مردان چنین کنند"

زمانہ ابتداً ایک سال تک معمولی کاغذ پر معمولی کتابت و طباعت کے ساتھ شائع ہوا اسکے بعد اڈیٹر صاحب حال کی سپردگی و اہتمام مین جن محاسن صوری و معنوی سے اسکی آراستگی ظہور مین آئی ہے۔ زمانہ کی فائلین اُسکی شاہد ہین۔ میرا خیال ہے کہ بیسویں صدی کے ابتدائی پچیس سال کی یہ ایک نہایت قیمتی اور مستند تاریخ ہے یا لائبریری۔ اِسکو آپ اس زمانہ کے علم ادب کی سائیکلوپیڈیا "قاموس المشاہیر" اور تذکرۂ شعرا کہئے تو بجا ہے یا مخزن مضامین گوناگون اور معدن معلومات فراوان سمجھئے۔ یا گلدستۂ نظم ہائے دلکش اور تصاویر رنگین و سادہ کا نظر فریب البم کہئے۔ الغرض وقت موجودہ کا کوئی مبحث تجارتی و اقتصادی۔ کوئی سوال علمی و ادبی۔ کوئی معاملہ قومی و ملّی۔ اور کوئی مسئلہ سیاسی و ملکی ایسا نہوگا جسپر اسکی فائلون مین بلاغت و فصاحت کے ساتھ تنقید و توضیح نہ کی گئی ہو۔ اپنے وقت کا کوئی مشہور لیڈر یا صاحب علم و فضل نہین۔ کوئی شاعر نہین کوئی ناثر نہین جس کی شبیہہ و حالات اسمین شایع نہ ہو چکے ہون۔ اسکے صفحات کے بعض مضمون نگارون کی قسمتین بنا دین۔ بہت سے شعرا کو مشہور عام کر دیا۔ بندگانِ خدا کی بیشمار معاملات مین اِس نے صحیح رہبری اور اُنکے خیالات و جذبات کی راست ترجمانی کی۔ اس طرح ملک و قوم پر اور زبان اُردو پر اسکے احسانات عظیم ہین۔

اِس مدت مین بیشمار رسالے نکلے اور چند روزہ بہار دکھا کر پردۂ غیب مین جا چھپے۔ لیکن رسالہ زمانہ کی رفتار ایسے مستحکم اُصولون پر قائم ہوئی کہ ابتک غیر متزلزل چلی آتی ہے۔ حوادث روزگار اور مالی نقصانات اسکے حصّے مین بھی رہے۔ مگر پرماتما کے فضل و کرم کی شریک حالی اور کارپردازون کی نیک نیتی سے یہ رسالہ خود کو سنبھالے رہا اور زندہ ہے۔ آسمان ادب اُردو پر اسکے کارنامے چاند و سورج بنکر روشن ہین۔

ناظرین آئین اور اڈیٹر صاحب و کارکنان زمانہ کو اُن کی پچیس سال کی مستحسن کارگزاری اور زمانہ کی کامیاب زندگی پر تہ دل سے مبارکباد دین۔ اور دست بدعا ہون کہ وہ اپنے اس جوان سال رسالہ کی کسی دن گولڈن اور ڈائمنڈ جوبلی بھی منائین۔ (آمین)

رام دیال سکینہ

خمخانۂ ریاض

فکر تازہ لسان الملک حضرت ریاض خیرآبادی مدظلہ العالی

تیسرے فاقے ہمین دانۂ انگور ملے
ہم یہ سمجھے کہ بھرے ساغر بلّور ملے

کتنے کعبے ملے رستے مین کئی طور ملے
ان مقامات سے ہمکو وہ بہت دور ملے

درِ جنت کھلے، تسنیم ملے، حور ملے
نیم وا مجکو تری نرگسِ مخمور ملے

نشہ انکو ہے جوانی کا مجھے نشۂ مے
ہم انھین اور وہ نشہ مین ہمین چور ملے

ایسے بھی کتنے ہین اللہ خدا کے بندے
اس خدائی سے الگ سب بتِ مغرور ملے

نہ سہی جلوہ ترا جلوۂ محبوب سہی
یا خدا دیکھنے کو وہ رخِ پرنور ملے

دست و پا چار دن حنا بستہ ہین تیرے اے شوخ
کیون نہ کھل کھیلے کوئی جب کوئی مجبور ملے

وہ بھی بخشے گئے ہم بادہ کشون کے ہمراہ
آج جنت مین ہمین ناصحِ مغفور ملے

مجھ سے کاوش تھی اُسے، تیری مژہ نے ڈالے
گھر سے گھر مجھے دلمین کئی ناسور ملے

متصل خلد کے خلوت کدۂ قبر بھی ہے
جاتے جاتے ہمین اک جام بکف حور ملے

یہ بھی قسمت نہ ملے دیر مین ناقوس کوئی
لے سرافیل ہمین پھونکنے کو صور ملے

آئے جنت وہین خود جانۂ سکین جنت مین
ایسے بھی تیری گلی مین کئی معذور ملے

خاک ہوکر نہ رہی خاک بھی ان کی باقی
خاک بن بن کے یون جم وکے قیصر و فغفور ملے

دعوتِ شیخ بھی تھی انجمن ساقی مین
آکے جنت مین بھی کھٹے انھین انگور ملے

ہے شب گور عدو بھی مگر اس مین سو حسن
زلف سے رنگ ترا اے شبِ دیجور ملے

عرش کو طور کو کعبے کو وہین سے دیکھون
دیکھنے کو مجھے وہ روضۂ پرنور ملے

آئی غربت مین اجل شام کو لے دامنِ صبح
اب کفن اور کفن کے لیئے کافور ملے

تیشہ بردوش وہان جاؤن کہ وہ کہتے ہین
کوہکن سے ہمین اچھا کوئی مزدور ملے

عید تک راہ پہ آجائین گے ناصح رندو
رمضان مین انھین افشردۂ انگور ملے

دور سے دلکو تجلی تری روشن کردے
یہ سیہ خانہ ہمین نور سے معمور ملے

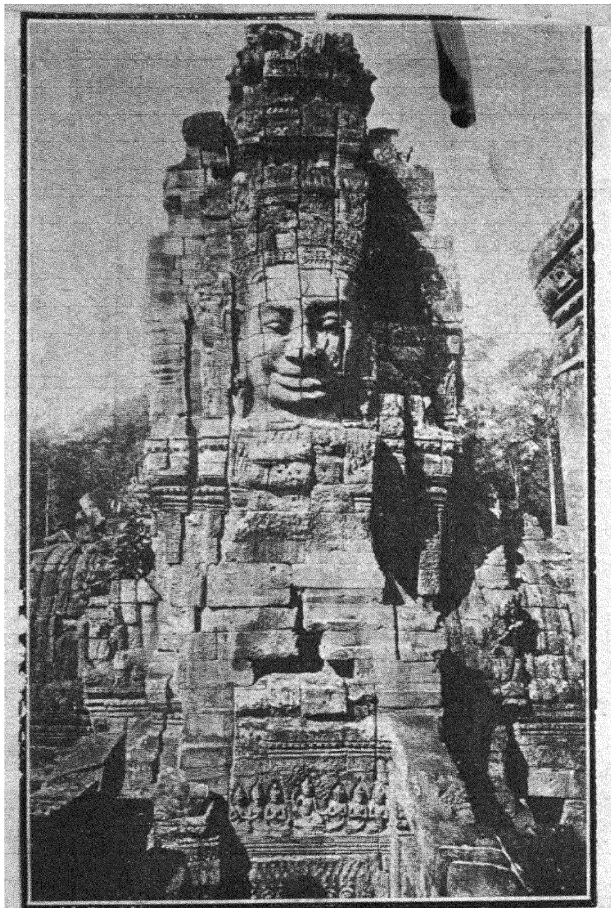

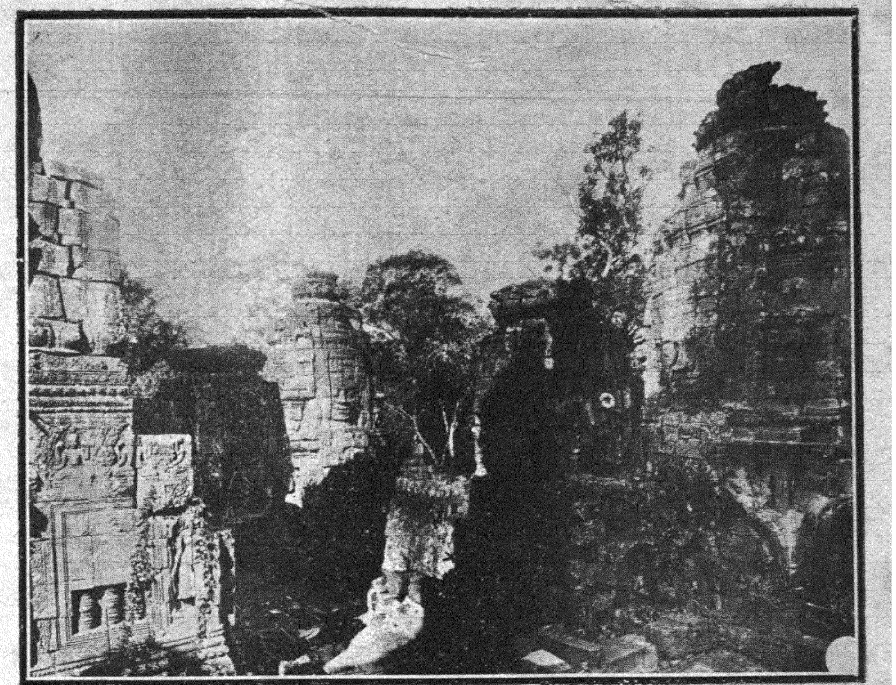

انگرورت کے مندر کي چاردیواري

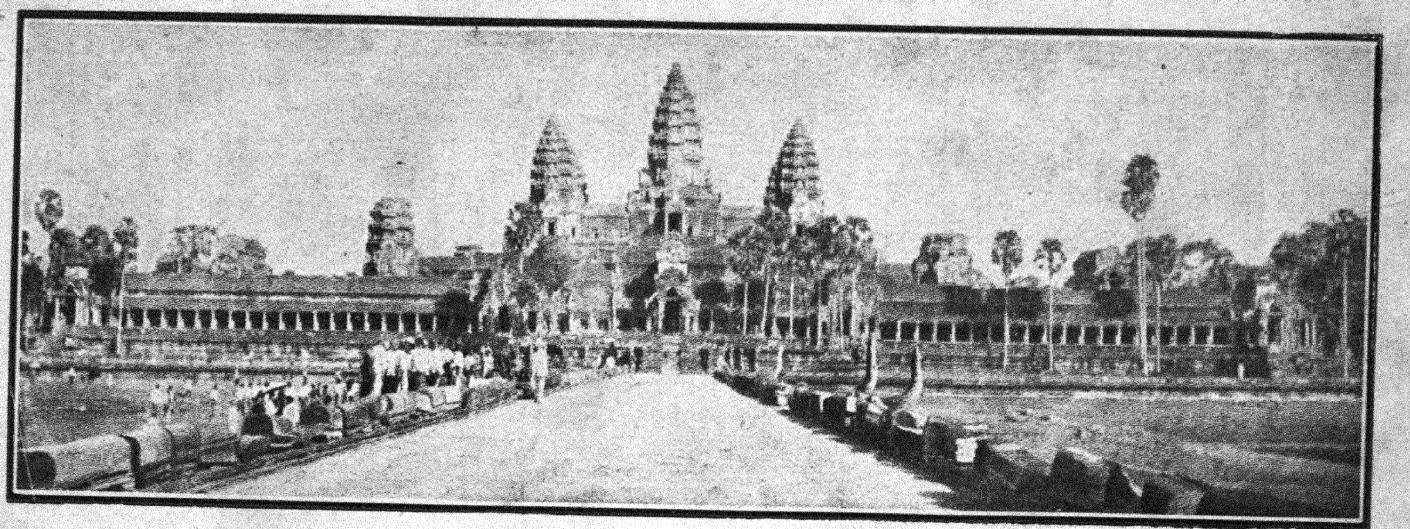

انگکورورت (واقعہ کمبوڈیہ) کے مندر کا عام منظر

یا تھے ہم نشہ مین چور اب پس توبہ یہ ہوا جلسے ہم پیتے تھے شیشے وہ ہمین چور ملے
اب خدائی مین بتون کی ہون بپا جلسے حشر ہمکو ہر دیر مین ناقوس لئے صور ملے
نام جو کچھ ہو انھین کہتے ہین سب لوگ ریاض
آج ہمکو وہ بڑے شاعر مشہور ملے

ہلال رمضان

نازک مہ نو کچھ خط ساغر ساعیاں ہے ساقی ہمین تیرے لب رنگین کا گمان ہے
پینے کو مہ صوم مین راتون کو ملے گی موج مئے گلرنگ ہلال رمضان ہے

رندون کا رمضان

میخانے مین ہر وقت ہے یونتو اثر عید انتیسوین کی شب کو ملے گی خبر عید
کوثر کی ہو تو کیا یہ ہے صوم ہے ساقی پینے کے نہین رند کبھی تا سحر عید

لذت افطار

کیا پوچھتے ہو صوم مین کیا ہوتا ہے مسجد مین مزا گھر سے سوا ہوتا ہے
وہ لذت افطار وہ کیف دم افطار میخانے کا ہر گھر مین مزا ہوتا ہے

رند ناکام کو کچھ نشہ سا ہو جاتا ہے یونہی سا نام کو کچھ نشہ سا ہو جاتا ہے
ہائے ری لذت افطار پس توبہ بھی بے پیئے شام کو کچھ نشہ سا ہو جاتا ہے

ضعف پیری و صوم

ان ہاتھون سے روز جام صہبا ٹوٹا ان ہاتھون سے بارہا مینا ٹوٹا
شرمائے خدا مرے بڑھاپے کو ریاض یہ ضعف ہے ایک بھی نہ روزا ٹوٹا

تشنگی صوم

روزہ رکھکر بلا کے دن کاٹے ہین مے سے دامن بچا کے دن کاٹے ہین
میخانے مین ہم تشنہ لبون نے ساقی سینے سے سبو لگا کے دن کاٹے ہین

یہ وقت وہ ہے کہ خم سبو پی لین پا جائین تو جھک کے حوض کوثر پی لین
خم کی ترے خیر کہدے اے پیر مغان روزہ کھولا ہے سانس بھر کر پی لین

شامِ رمضان

ہر روزہ دمِ صبح ہے خورشید سے بڑھکر — ہر روزہ سرِ شام ہے امید سے بڑھکر
پینے کا پلانے کا مزا ہمسے نہ پوچھو — شامِ رمضان ہے سحرِ عید سے بڑھکر

روزِ عید

کل تک کوئی تھا نے کا قطرا گھر میں — پانی سے کھلا کھلا جو روزا گھر میں
ساقی کی نگاہ لطف تھی جو عید کے دن — بہتے نظر آئے مے کے دریا گھر میں

ریاض خیر آبادی

جذبات عزیز

از سان الہند حضرت عزیز لکھنوی

دیکھنا تھا کیا دکھائی دے رہا ہے کیا مجھے — اب نگاہیں بھی مری دینے لگیں دھوکا مجھے
موجزن تھا بحرِ ہستی جبتک آنکھیں بند تھیں — اک سراب زیستی تھا ہوش جب آیا مجھے
سبزہ لیں طے کر چکا جب خارزارِ عشق کی — دیدہ بینا نظر آیا ہے ہر چھالا مجھے
ضبط سے کیا فائدہ اکسیر بننا چاہیئے — ہاں بھڑک اے شعلۂ دل اور جلاتا جا مجھے
زخمِ دل ہمت شکن ہے میں دکھاؤنگا مگر — مل تو جائے پہلے کوئی دیکھنے والا مجھے
جب دلِ بیتاب میں تابِ تحمل ہی نہ تھی — حاملِ بارِ امانت کیون بتایا تھا مجھے
بے نیازِ بندگی میں سخت کافر ہوگیا — اب دکھائیگا کہانتک شانِ استغنا مجھے

کثرت آرائے مظاہر اسقدر جوشِ نمود — بندگی کے واسطے کافی تھا اک جلوا مجھے
تنگ تھا مجھپر قفس کیا جانیئے کیسی بنی — ہمصفیر واک ذرا آواز تو دینا مجھے
بیکسوں کی قبر سے گزرا جو کوئی راہرو — شمع کشتہ سے صدا آئی جلاتا جا مجھے

قصۂ عہدِ جوانی پوچھتے ہو کیا عزیز
اتفاقاً آگیا تھا نیند کا جھونکا مجھے

عزیز

تتلی

از لسان القوم جناب صفی لکھنوی

تتلی! اے جامہ زیب تتلی! خوشرنگ نظر فریب تتلی
ننھی سی جان، پیاری تتلی! نیلی، پیلی، سفید، چتلی
تو حورِ جنان کی پنکھیا ہے یا پھول ہے پنکھڑی ہے، کیا ہے
نازک نازک ترے یہ بازو یا شوخیِ حسن کی ترازو
اُڑتی پھرتی ہے باغ بھر میں چپہ چپہ تری نظر میں
رمنہ تیرا ہے سبزہ و گل قبضے میں تری ہے جزو تا کل
تو پہلے تھی اِک ذلیل کیڑا ہمت کا مگر اُٹھا کے بیڑا
طے کر کے منازلِ کثافت پہنچی تا سرحدِ لطافت
تیری ہر وضع اب ہے دلکش ہو سادہ لباس یا منقش

قدرت کی یہ فیض گستری ہے کیڑا جو تھا اب وہی پری ہے
پرواز میں اِس قدر سُبک سیر ہمتا جسکا نہیں کوئی طیر

کچھ شرط سہی اُڑے بھنبھیری بازی میں رہے گی تو ہی میری
گل کے سر دوش تو جو چڑھ جائے حسن اُسکا چمن میں اور بڑھ جائے
نو شاخ سے جب اُڑے بصد ناز سمجھیں سب گل ہے گرم پرواز

گو ناگوں تتلیوں کی بہتات کب ہوتی ہے؟ خوب جب ہو برسات
اُن کے افسانے ہیں نرالے یہ بھی کہتے ہیں کہنے والے
ہیں بھیس میں تتلیوں کے روحیں مصروفِ بہار دیکھنے میں

رو سین آزاد کی ہوئی ہین ان کو نہ چھیڑو چھوئی موئی ہین
دیکھو یہ دیکھنے کی ہین چیز چھونا ان کا خلاف تمیز
کرتے ہو اگر پسند بچو! مٹھی مین کرو نہ بند بچو!
ان پریون کو جان سے نہ مارو آہستہ سے شیشے مین اتارو
جسمین کہ بھری ہوئی ہو کچھ خوب یعنی ان کی غذائے مرغوب
یہ عمر بسر کرین مع الخیر تم شوق سے بیٹھکر کرو سیر
راحت سے جو چاہتے ہو رہنا مانو اپنے صفی کا کہنا

اُن جانورون کو دو نہ ایذا
تم کو دیتے ہون جو نہ ایذا

صفی لکھنوی

غزل

قطع کی راہ جنون خوگر ایذا ہو کر ساتھ اس دل نے دیا آبلہ پا ہو کر
زندگی تیغ رہی ذوق نظر بازی مین بار ہا زہر چڑھا نشۂ صہبا ہو کر
کیجئے کس سے اس انداز تغافل کا گلہ جان لی تم نے مریضون کی مسیحا ہو کر
گریۂ وقت ولادت یہ خبر دیتا ہے روح قالب مین سمائی غم دنیا ہو کر
چشم تر! اشک مسلسل کی روانی دیکھی پاؤن پھیلائے ہین ہر قطرہ نے دریا ہو کر
قلعۂ دل کا نشان تک نہ رہنے پائی جھک پڑا لشکر مژگان جو صف آرا ہو کر
کیجئے پھر منزل ہستی و عدم مین کیا فرق کام کچھ بھی نہ کیا ہمنے جو پیدا ہو کر
اف ری آغاز محبت مین مآل اندیشی اہل دل باغ بھی جاتے ہین تو صحرا ہو کر
اسی انداز سے اک جام ادھر بھی ساقی! کف موسےٰ پہ جو چمکا ید بیضا ہو کر
جرأت حوصلہ دیدہ سے باز آ کلیم! اک تماشا نہ بنو محو تماشا ہو کر

جب صفی کعبۂ دل کی مرے بنیاد پڑی
جوش ذرون نے دکھایا تہ و بالا ہو کر

صفی لکھنوی

جذبات مہر

(از قلم حقیقت رقم جناب منشی سورج نرائن صاحب مہر دہلوی)

تہل ہے لفظِ ماسوا - سب مجھ مین ہین مین سب مین ہون
کوئی نہین مجھ سے جدا - سب مجھ مین ہین مین سب مین ہون
نام وصور ہین چیز کیا - سب مجھ مین ہین مین سب مین ہون
دونون کا مین ہون آسرا - سب مجھ مین ہین مین سب مین ہون
آئینہ خانہ ہے جہان - جو کچھ ہے میرا عکس ہے
مین جسطرف ہون دیکھتا - سب مجھ مین ہین مین سب مین ہون
ناظر ہون مین نظارہ مین - منظور مجھ سے ہست ہے
میری نظر کا کھیل سا - سب مجھ مین ہین مین سب مین ہون
کثرت مین وحدت کی ہے یہ - تمثیل مین ہون خواب مین
عالم ہے نقشہ خواب کا - سب مجھ مین ہین مین سب مین ہون
جز آب کیا ہے ہستی - امواج و گرداب و حباب
نام وصور کا فرق کیا - سب مجھ مین ہین مین سب مین ہون
جیسے کھلونے کھانڈ کے - ہین کھانڈ دیگر شے نہین
یون ہی تو بس جلوہ نما - سب مجھ مین ہین مین سب مین ہون
جیسے دہکتی آگ سے - شعلے ہون اُٹھ اُٹھ کر بلند
یون کائیناتین رونما - سب مجھ مین ہین مین سب مین ہون
ہستی کا بحر بیکران - بس مین ہی مین ہون مین ہی مین
امواج ہین ہر دو سرا - سب مجھ مین ہین مین سب مین ہون
لعل و جواہر فطرتاً - جس طرح اپنی آب دین
دنیا مین ہین میری ضیا - سب مجھ مین ہین مین سب مین ہون

ہان یہ عقیدہ شرک ہے، حق تا درہے مین اور ہون
مین ہون خدا مین ہون خدا سب مجھ مین ہین مین سب مین ہون
سر چشمۂ ہستی کا مین ہی مہر عالمتاب ہون
جو ہے سو میرا پرتو ہ سب مجھ مین ہین مین سب مین ہون

مہر دہلوی

آئینۂ حقیقت

از حضرت جگر مراد آبادی

اسی تلاش و تجسس مین کھو گیا ہوں مین
اگر نہیں ہوں تو کیونکر جو ہون تو کیا ہوں مین

شریک ہون نہ کسی چیز سے جدا ہون مین
بتا دے اے مری فطرت مجھے کہ کیا ہوں مین

فریب خوردۂ رنگینیٔ ادا ہوں مین
نظر کی چند شعاعون مین گھر گیا ہوں مین

محیط عشق مین آوارگی نہ پوچھ مری
ازل سے گرم رو عرصۂ بلا ہوں مین

گران ہے میری لطافت پہ یہ غبار وجود
اُسے بقا مری سمجھو اگر فنا ہوں مین

نبود و بود کا کل راز جسمین مضمر ہے
بساط عشق پہ وہ نقش ابتدا ہوں مین

ہر ایک شے نظر آتی ہے خود مری تصویر
جہان سے منظر فطرت کو دیکھتا ہوں مین

فتادگی مرا شیوہ شکستگی مری شان
خود اپنی راہ طریقت کا رہنما ہوں مین

کرشمہ سازی ہنگامۂ جہان معلوم
خود اپنے حسن صفاتی پہ مبتلا ہوں مین

بہ ظاہر ہین یہ حجابات ورنہ فرق نہین
ازل سے تا بہ ابد ایک سلسلہ ہوں مین

مجھے تلاش نہ کر اے بخودی شوق سجود
پہنچکے منزل مقصد پہ کھو گیا ہوں مین

دلیل ہے تری شوخی کہ بے نیاز ہے تو
گواہ ہے مری ہستی کہ خاکپا ہوں مین

ذرا جو پاؤن ہٹا جادۂ وفا سے کبھی
ہر ایک ذرہ پکارا کہ دیکھتا ہوں مین

جگر یہ ہرزہ سرائی مری یہ بد مستی
یقین ہے کسی مجذوب کی صدا ہوں مین

شاعر اور تنہائی

(از جناب محشر لکھنوی)

فرطِ تنہائی میں شاعر کے خیالات الحذر — دل مقیمِ صدر ہے اور فکر مصروفِ سفر
بند آنکھیں ہیں مگر دورہ میں ہے پیکِ نظر — سر بزانو ہے مگر عالم سے گویا بے خبر
کلکِ معنی ہاتھ میں تصویرِ مضموں سامنے
ہو گئے مشقِ سخن سے دُرِ مکنوں سامنے

قوتِ تخئیل ایک اِک سانس میں ہے کامیاب — کاوشیں ذہنِ رسا کی ہیں حجاب اندر حجاب
جنبشِ لب سے موافق طبع کے پایا جواب — بنگئیں کاغذ پہ شکلیں کیسی کیسی انتخاب
طبعِ رنگیں نے دل آویزی دکھائی کس قدر
جن کی جانب اہلِ دل کے کھنچتے ہیں قلب و جگر

ہمنفس کوئی نہ کوئی ہمنوا ہے آس پاس — جوشِ دل مثلِ خیالِ دلربا ہے آس پاس
نظم کا آئینہ صدق و صفا ہے آس پاس — وصل کی تصویر نقشہ ہجر کا ہے آس پاس
مقتضائے ذوقِ فطرت کہہ رہا ہے کیا کہوں
مختصر فرقت کے اسرارِ دلِ شیدا کہوں

ہاتھ میں کلکِ رقم اور جانب کاغذ نظر — قوتِ تحریر حالِ ما سوا سے باخبر
فکر کا مرکز کبھی عالم کبھی ہے عرش پر — اور کبھی فضلِ خداوندی سے اُسکے بھی ادھر
دور محسوسات کے آگے ہے جانے کا خیال
اُس جگہ یعنی حقیقی ہو جہاں لطفِ وصال

شادی و غم وصلت و فرقت کے منظر سامنے — گہرے گہرے نقش الفتہائے دلبر سامنے
عارضِ رنگیں ادا زلفِ معنبر سامنے — روح بھی جس پر نثار ایسا ہے پیکر سامنے
مِل گیا وہ جو کہ ڈھونڈھے سے کبھی ملتا نہ تھا
کچھ نہ پوچھو خلوتِ شاعر میں کیا تھا کیا نہ تھا

صفحۂ کاغذ ہے اور پورا تصور سوئے دوست — کھینچ ہی لی سعیِ باطن سے شبیہِ خوئے دوست
چشمِ دل کو بن گیا سرمہ جمالِ روئے دوست — بس گئی آکر دماغِ روح میں خوشبوئے دوست

چہرۂ مایوس پر رونق سی رونق آگئی
فرقتِ محبوب وصلت کا سماں دکھلا گئی

قوتِ تحریر سے عالم پہ قابو ہوگیا — نکتہ نکتہ دیکھنے والوں کو جادو ہوگیا
اتفاقاً جب رقم مضمونِ گیسو ہوگیا — دفعتاً دامن تمناؤں کا خوشبو ہوگیا

جان میں جاں آئی منہ مانگی مرادیں آگئیں
کوششیں جو دل سے کی تھیں وہ اثر دکھلا گئیں

خلوتِ شاعر ہے شاعر کے لئے باغِ جناں — فکرِ دنیا کی نہ کچھ تشویش جو رِ آسماں
آ نہیں سکتے خیال و خواب میں غم کے نشاں — دم بدم خود ساختہ نقشوں پہ ہے خندہ کناں

جملہ باتیں عقل کی عالم فراموشی کے ساتھ
کھینچ لی تصویرِ حسنِ دوست مدہوشی کے ساتھ

خود ہے گھر میں اور تصور بک رہا ہے بازار میں — فکر یہ کیا قیمتِ یوسف اٹھی اغیار میں
ہوگئی کس طرح بخیہ زخمِ دامن دار میں — کس نے کی تکمیل حسن و عشق کے اسرار میں

کس طرح ملبوسِ عصمت پر نہ دھبا آ سکا
بچ کے کیونکر خلوتِ حسرت سے کوئی جا سکا

دور ہی سے جو کوئی دیکھے وہ دیوانہ کہے — عقل و دانش سے سراسر غیر و بیگانہ کہے
شمعِ حسنِ دوست کا شیدا و پروانہ کہے — بات پر آئے تو پہروں غم کا افسانہ کہے

سننے والا ہو نہ ہو ذوقِ سخن سے کام ہے
بیٹھ کر خلوت میں لطفِ انجمن سے کام ہے

کان میں اپنے شکستِ دل کی جب آئی صدا — چونک اٹھا پھر یہ سمجھا اور کوئی آگیا
دیکھ کر چاروں طرف مجبور چپکا ہو رہا — بھر کے آہِ سرد دل ہی دل میں یوں کہنے لگا

ہمنوا ہو کر مرے غم خانے میں آتا ہے کون
شکر کی جا ہے کہ اس ویرانے میں آتا ہے کون

اُف ری اُلجھن پھر اُٹھایا اور پھر رکھا قلم — آ رہا ہے کام ایسے وقت میں کیا کیا قلم
لکھ لیا جلدی سے پھر کچھ اور پھر رد کا قلم — کھینچتا ہے عالمِ تخئیل کا نقشہ قلم

ذہن میں جو بات آئی ہو گئی صورت گری
لفظیں کاغذ پر ہیں یا شرحِ مزاجِ دلبری

الغرض شاعر کو تنہائی ہے اک تازہ حیات — کچھ نہیں مطلب کسی سے بس قلم ہے اور دوات
بے تکلف لکھ دیے کاغذ پہ تسلی دار دات — کافی و وافی مخاطب ہے فقط خالق کی ذات

زندگی محشر کی بھی اکثر گذرتی ہے یوں ہی
زلفِ محبوبِ سخن آراستہ کرتی ہے یوں ہی

محشر لکھنوی

کلام حسرت

تحسین ہے لب پر ترے دشنام نہیں ہے — الزام تمنا کوئی الزام نہیں ہے
خوبی تری بے قید ہے خواہش مری بیجد — ان دونوں کے آغاز کا انجام نہیں ہے
ایسا کوئی دنیا میں نہیں عشق نظر باز — اے حسن دلارا جو ترا رام نہیں ہے
بیٹھے ہیں تری یاد میں کونین سے فارغ — اب ہمکو کسی چیز سے کچھ کام نہیں ہے
پر نور مے عشق دل روشن عرفاں — آئینہ عالم ہے مرا جام نہیں ہے
برپا ہیں بہر سمت حوادث کے تلاطم — دریا مری قسمت پہ کا آرام[1] نہیں ہے

دیوانہ ہوں ساقی کی نظر کا مری مستی
حسرت گرو بادہ گلفام نہیں ہے

[1] دریا آرام نیست فارسی محاورہ ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ دریا متلاطم ہے۔

صدائے بیداری

از مصورِ فطرت عشرت جوشؔ ملیح آبادی

یہ نا سرزمین ہند پر نکبت برستی ہے — زبان پر رفعتوں کا ذکر ہے فکر دن میں پستی ہے
یہ نا آج ہم میدان وحشت میں رجز خواں ہیں — عدو بھی سر پہ ہے آپس میں بھی دست و گریباں ہیں

مگر راتوں کو جب فکرِ وطن میں سر جھکاتا ہوں
فضائے سرد میں دھیمی سی اک آواز پاتا ہوں

یہ آواز اس لطافت سے مرے کانوں میں آتی ہے — صبا جس طرح زیرِ شاخِ سنبل گنگناتی ہے
فلک پر جس طرح روح الامین کی بال جنبانی — برستا ہو کہیں کچھ دور جیسے خواب میں پانی
جگاتی ہے سحر جس طور سے فنون کو دریا میں — ہوا کی سرسراہٹ جس طرح گنجانِ صحرا میں
حقیقت کیا بتاؤں اس صدائے روح افزا کی — نہاں ہیں جس کے اندر گرد شیں امروز فردا کی

یہ مشرق محو ہے صبح تجلی زار ہونے میں
یہ روح ایشیا مصروف ہے بیدار ہونے میں

جوشؔ ملیح آبادی

کمال بزدلی ہے پست ہونا اپنی آنکھوں میں
اگر تھوڑی سی ہمت ہو تو پھر کیا ہو نہیں سکتا
ابھرنے ہی نہیں دیتی یہاں بے مائگی دل کی
نہیں تو کون قطرہ ہے جو دریا ہو نہیں سکتا

چکؔ بست لکھنوی

غبارہ

(از چودھری جگت موہن لال صاحب رواں ایم۔اے۔ایل ایل۔بی)

زمیں سے جانبِ بامِ فلک رواں ہے تو
رحیلِ منزلِ بے جادہ و نشاں ہے تو

ہوا پہ اِک فرسِ شعلہ جست کر کے چلا
کہ کوئی طائرِ زرّیں اوڑان بھر کے چلا

بلندیوں کی طرف بنکے برقِ طور چلا
کمالِ شوق سے دامن میں بھر کے نور چلا

حسیں پری کوئی مست مئے صبوح چلی
نکل کے قالبِ خاکی سے جیسے روح چلی

تپِ دروں سے غبارِ سرابِ دشت ہے تو
فضائے چرخ پر آوازِ بازگشت ہے تو

پڑا ہے یا کسی میکش کا صبرِ رندانہ
اُلٹ گیا ہے مئے آتشیں کا پیمانہ

فلک کو اہلِ زمیں کا پیام ہے کوئی
کہ دستِ ساقیِ کوثر میں جام ہے کوئی

یہ کوئی آگ کا اڑتا ہوا شرارہ ہے
کہ آسمان کا ٹوٹا ہوا ستارہ ہے

ڈھلک کے دیدۂ سالک سے کوئی اشکِ نیاز
چلا ہے ہونے کو دامانِ عفو پر ممتاز

نظر فروز تعلق بہار ہے تیری
حریف۔ زندگیِ مستعار ہے تیری

فنا کے دوش پہ کچھ اس طرح سوار ہے تو
کہ بیکسوں کا چراغِ سرِ مزار ہے تو

قدم قدم پہ سنبھلتا ہے ڈگمگاتا ہے
قدم قدم پہ مچلتا ہے لوٹا جاتا ہے

خبر بھی ہے تجھے۔ انجام تیرا کیا ہوگا
موادِ زیست ترا باعثِ فنا ہوگا

قدم بڑھائے ہوئے۔ ہاں۔ قدم بڑھائے ہوئے
گدازِ نفس سے دامن مگر بچائے ہوئے

رواں تو ہے سوئے منزل مگر یہ ڈر ہے مجھے
مری طرح کہیں جلنے سے پہلے جل نہ بجھے

جگت موہن لعل رواں

شفق

از منشی مہاراج بہادر صاحب برق دہلوی بی اے

دید کے قابل ہے رنگِ ارغواں زارِ شفق
دلربا ہے سرخیٔ دامانِ زرتارِ شفق

آسمان پر موجزن جوئے شرابِ سرخ ہے
یا محیطِ چرخ زنگاری شرابِ سرخ ہے

نقش بستہ آفتابِ شام کی تنویر ہے
جلوۂ آخر کی اک مٹتی ہوئی تصویر ہے

آئینے مین چرخ کے ہے عکسِ تصویرِ بہار
تابش افزائے نظر ہے یا فروغِ شعلہ زار

روئے زیبائے عروسِ شام کا پرتو ہے یہ
گوشۂ مغرب منوّر جس سے ہے وہ ضو ہے یہ

از سرِ نو پھوٹ نکلا ہے شبابِ چرخ پیر
یا مئے احمر ہے زیبِ شیشۂ ابرِ مطیر

رنگ لایا ہے شفق بنکر شہیدون کا لہو
لوحِ گردون سے عیان ہین نقشِ خون آرزو

جلوۂ زرّین فضا مین جاذبِ نظارہ ہے
منظرِ رنگیں نگاہِ شوق کا گہوارہ ہے

قصرِ فردوسِ برین کا دلنشیں نقشہ ہے یہ
یا بہارِ بوستانِ خلد کا خاکہ ہے یہ

سرخ جوڑا لیلیٰ شب نے کیا ہے زیبِ تن
روزِ روشن سے ہے ہم آغوش چوتھی کی دلہن

دیکھ لے، چشمِ تماشا جو! یہ جلوہ دیکھ لے
کلکِ صنّاعِ حقیقی کا کرشمہ دیکھ لے

اے شفق! اے نقشِ دل آویزیٔ رنگِ حسن
اے طلسمِ رنگ! اے آئینۂ نیرنگِ حسن

پرتوِ مہرِ مبین کا راز سربستہ ہے تو
یا سرِ طاقِ فلک رنگین گلدستہ ہے تو

برق کی چشمک تری رنگین ادائی پر نثار
کہکشان کا نور اس جلوہ نمائی پر نثار

مایۂ تسکین ہے تو ذوقِ نظر کے واسطے
دامنِ گلچین ہے تو ذوقِ نظر کے واسطے

چرخ کے ابسلیٹ پر اک پردۂ رنگین ہے تو
زینتِ ودشِ فلک یا چادرِ زرّین ہے تو

کیف آور تیرا جلوہ ہے سکوتِ شام مین
آتشِ سیّال ہے لبریز تیرے جام مین

بادۂ گلرنگ کا تیرے مزا لیتا ہون مین
تشنگیٔ ذوقِ نظارہ بجھا لیتا ہون مین

تیری رنگینی سے عقدہ کھل گیا یہ اے شفق
دفترِ ہفت آسمان کا تو سنہری ہے ورق

جو دکھاتے ہی جھلک اُڑ جائے وہ سیماب ہے بے ثباتی کا مُرقع، جلوۂ بیتاب ہے
محو ہو جاتے ہین دم بھر مین ترے نقش و نگار ہے یونہی وقفِ خزان عمرِ دو روزہ کی بہار
جلوۂ گل تو ہے مشتاقِ تماشا کے لیئے
منظرِ عبرت نما ہے چشمِ بینا کے لیئے

برق دہلوی

گلاب

(از منشی نوبت رائے صاحب نظر مرحوم)

اے گلاب روح پرور! اے شہ گلہائے باغ قید ہستی میں کہاں ممکن مجھے تجھ سا فراغ
شبکو تو روشن میان باغ ہے مثلِ چراغ اور دن کو ہے مئے گلرنگ کا لبریز ایاغ
تیرے نظارے کو لیکن چشمِ بینا چاہیئے
دل بھی شرمندۂ ذوقِ تماشا چاہیئے

صبح کو تو کھولتا ہے آنکھ جب دم خواب سے منھ دھلاتی ہے ترا شبنم مصفّا آب سے
تخت پر جلوہ گر ہوتا ہے رعب و داب سے پھول سب نذرین دکھاتے ہین تجھے آداب سے
جگمگاتا ہے جو صحنِ باغ تیرے نور سے
پنجۂ خورشید لیتا ہے بلائین دور سے

بلبلوں کے دل محبّت سے تری لبریز ہین عاشقی کے ولولے دریائے طوفاں خیز ہیں
لب پہ وہ دلکش ترانے ہین دہن گلریز ہین حوصلے بڑھتے ہوئے دل کی اُمنگیں تیز ہیں
بجلیاں بھر دین دلون میں اضطراب شوق نے
مست اور بیخود کیا ان کو شراب شوق نے

نظر

(زمانہ نومبر ۱۹۱۹ء)

شاعر کا نصب العین

از جناب مرزا جعفر علی خاں صاحب اثر لکھنوی بی اے۔ پی۔ سی۔ ایس

اللہ اللہ فکر شاعر کی — اُن مقامات میں ہے گرم سفر
فہم و ادراک ہیں جہاں عاجز — صرف وجدان ہے جہاں رہبر
حیرتِ آئینہ بند معنی ہے — خود نظر بھی ہے اک حجاب نظر
تا کہ دل پر ہو مرتسم بکمال — نقش ابداع و صنع صورت گر
نقد ہو وہم نسیہ افسانہ — نہ رہے کچھ خیال نفع و ضرر
بے خودی میں جدھر نظر اُٹھے — وجد میں آئیں سقف و بام و در
قوتِ نطق جوش میں آئے — اور تخیل کے کھلیں جوہر
کلکِ ندرت طراز سے نکلیں — شعر آوازِ غیب کی ہو بکر
لفظ و معنی میں ہو وہ ربطِ لطیف — جیسے گرمی ہو شعلے میں مضمر
اور تاثیر کا یہ عالم ہو — دردمندوں کی آہ وقتِ سحر

گلشنِ قدس کی ہوا آئی — لیکے پیغام صد بہشت نظر
ایک انگڑائی شوق میں آئی — اور عالم تھا اور ہی منظر
لو نسیمِ سبک خرام چلی — نکہتِ گل کی اوڑھ کر چادر
علم و عرفان کے پھول کمہلاتی — ہوئی مائل سوئے طلسم صور
بحرِ ہستی میں ایک طوفان تھا — بند تھی موج موج کے اندر
ہر طرف تھا بلند شورِ خودی — گم ہوئی تھی تمیز خیر و شر
قطرہ قطرہ شکست کے ڈر سے — ایک حصن حصین تھا بے در
کارگاہِ حباب سے ناگاہ — رقص کرتی گذر گئی صرصر
وہ خودی تھی نہ وہ نمائش تھی — شرمساری تھی اور دیدۂ تر
قطرہ دریا سے ہمکنار ہوا — مٹ گیا اختلافِ ہمدیگر

اور سنکی ذرا سموم ہوئی رد مین جا نکلی جسطرف بس دہر
پھونکدی جو متاع کا سد تھی حرص جاہ وجلال شہرت وزر
بت پندار کو شکستین دین کیے غرقاب کذب کے دفتر
عاصیون کی اگر کفیل ہوئی ہوئین کافور ظلمتین یکسر
نہ ضلالت تھی اور نہ تاریکی دامن یاسمن تھا دامن تر

ایسے شاعر کا عشق ہے معبود عشق ہی ہے وصی و پیغمبر
عشق اوّل ہے عشق آخر ہے مبتدا ہے وہی وہی ہے خبر
پیکر عشق مین ہے جلوہ نما وجہ تخلیق کائنات بشر
حسن بھی عشق کا کرشمہ ہے ورنہ آتا نہ پردے سے باہر
جب ہوا سرنشین بزم مجاز شوخی آنکھون مین تھی ہنسی لب پر
اور حیا سے کبھی یہ چہرے کا رنگ تہہ ابر تنک ہو جیسے قمر
ہان کبھی اِسطرح بھی دیکھا ہے سرشوریدہ اور سنگ در
وہ نگار جبین کی رعنائی جیسے گلگونۂ شفق مین سحر
اور دل کی تپش کا یہ عالم مست کے ہاتھ مین بھرا ساغر
ہو رہی تھین تجلیان پیدا ہوک اُٹھتی تھی دل مین رہ رہ کر

وہی عاشق ہے اور وہی شاعر ایک مرکز ہے ایک ہی محور
کوئی شیدائے شاہد معنی کوئی مشتاق جلوۂ دلبر
ایک کو آپ جستجو اپنی اِک حقیقت مین محو سرتاسر

نہین شاعر کا کوئی نصب العین ہے تعیّن سے فکر بالاتر
ہان جو محسوس آپ کرتا ہے اُسکی دیتا ہے دوسرون کو خبر
وہ بھی صرف اسلیے کہ دنیا مین عام ہو شور عشق ذوق نظر
ماسوا اسکے ہرزہ کاری ہے غور بیکار فکر دردِ سر

قول شاعر لکیر پتھر کی گو نہ لائے دلیل دعوے پر
کیونکہ دل سے جو بات نکلے گی وہ کریگی ضرور دل پر اثر

پیام صلح

از میاں بشیر احمد صاحب بیرسٹرایٹ لاء اونیر ہمایوں لاہور

برپا ہے جنگ چار طرف دے پیام صلح
اُٹھا اور بنا دے دنیا کو دارالسلام صلح

صد حیف تم پہ صلح پسندو! ہزار حیف
آپس مین جنگ کرتے ہوئے لے کے نام صلح

ڈوبا ہوا ہے اشکِ ندامت مین جنگجو
اب جنگ ہو چکی ہے یہ ہے انتقام صلح

آپس مین بولنا بھی گوارا نہ ہو جنھین
کانون میں اُن کے آج سُنا دے سلام صلح

اب دوسرون کے مال کا کھانا حرام ہے
آیا ہے پاک دامنو! ماہِ صیام صلح

کیون ہو دروغِ مصلحت آمیز کا خیال
شہباز جنگ کے لئے پھیلا نہ دام صلح

گر جنگ ہو تو جنگ ہو اک صلح کے لئے
کر جنگ اُن کی جنگ سے لے کے نام صلح

بشیر احمد

چمن ہند

(از مولانا نور الحسن صاحب نیّر کاکوروی بی۔ اے۔ ایل ایل بی)

آج گلشن میں بہار آئی ہے کیا متوالی — نشہ میں پھول لگے جھومنے ڈالی ڈالی
بلبلیں بھول گئیں اپنی پریشاں حالی — پوچھنے نکلی ہیں پھولوں کا مزاجِ عالی
ایک گلدستہ میں ہیں مختلف انداز کے پھول
سحر جادو کی بنی ڈالیاں اعجاز کے پھول

پتی پتی میں کئی رنگ۔ ہر اک رنگ نیا — اُس پہ ہر رنگ سے ہر رنگ کا انداز جُدا
ہلکی ہلکی کہیں رنگت کہیں شوخی پیدا — بوٹے بوٹے میں رگیں رگ میں نمایاں ریشا
بسکے پھولوں میں نسیم سحری آتی ہے
صاف کھلتا ہے دد ھلن بن کے پری آتی ہے

نظر آیا جو یہ گلدستۂ پردیں تمثال — لے اڑا مجھکو خدا جانے کہاں پیک خیال
طائرِ فکر نے کچھ اور نکالے پر و بال — کھنچ گئی دیدۂ بینا میں مرے صورتِ حال
ہند کی مختلف اقوام کا نقشا دیکھا
کیا کہوں دیدۂ عبرت نے مرے کیا دیکھا

ہم میں ہندو بھی مسلماں بھی ہیں عیسائی بھی — ایک رشتے سے برابر کے ہیں سب بھائی بھی
مثل پھولوں کے میسر تو ہے یکجائی بھی — اُس پہ رہتی ہے سدا معرکہ آرائی بھی
غور سے دیکھو تو ہمدم نہیں ہمراز نہیں
ایک سے ایک کسی لَے میں ہم آواز نہیں

کاش اِس سلک کے گوہر نہ پریشاں ہوتے — چمنِ ہند کے یکجا گل و ریحاں ہوتے
بھائی بھائی کی طرح یکدل و یکجاں ہوتے — صورتِ عقدِ ثریا یہ درخشاں ہوتے
ان پہ پھر رشک سے غیروں کی نگاہیں اٹھیں
دل حمیدہ سے بے ساختہ آہیں اُٹھیں

طبع افسردہ کی پژمردہ کلی کھل جاتی — دردِ دل کے لئے دارو سے شفا مل جاتی
سالہا سال کی مہلک تپشِ دل جاتی — بالیقیں کشتیِ مقصد بہ ساحل جاتی

کیوں ترقی میں کسی ملک سے گھٹ کر رہتے
ہم جو اوروں سے نہ بڑھتے تو برابر رہتے

ہم بھی نورالحسن اس بزم میں ہمدم آتے — انھیں گل بوٹوں سے گلدستہ بنا کر لاتے
روز و شب میل و محبت کے ترانے گاتے — چمن خسے حور و ملک لعل و گہر برساتے

اور آتی یہ دعا غیب سے تو شاد رہے
تیرا اے ہند سدا یہ چمن آباد رہے

نورالحسن نیّر

کلام اصغر

(از حضرت اصغر گونڈوی)

شکوہ نہ چاہیئے کہ تقاضا نہ چاہیئے — جب جان پر بنی ہو تو کیا کیا نہ چاہیئے
ساقی تری نگاہ کو پہچانتا ہوں میں — مجھسے فریب ساغر و مینا نہ چاہیئے
تیغ ادا میں اسکے ہو اک روح تازگی — ہم کشتگانِ شوق کو مرنا نہ چاہیئے
یہ آستانِ یار ہو صحنِ حرم نہیں — جب کھدیا ہے سر تو اٹھانا نہ چاہیئے
سب اہل دید بیخود و حیران و مست ہیں — کوئی اگر نہیں ہے تو پردا نہ چاہیئے
اک جلوہ خال و خط سے بھی آراستہ سہی — واماندگیٔ ذوق تماشا نہ چاہیئے
خود آپ اپنی آگ میں جلنے کا لطف ہے — اہل تپش کو آتشِ سیّال نہ چاہیئے
کیا کم ہیں ذوق دید کی جلوہ طرازیاں — آنکھوں کو انتظارِ تماشا نہ چاہیئے
وہ بارگاہِ حسن ادب کا مقام ہے — جز درد و اشتیاق تقاضا نہ چاہیئے
ہستی کے آبِ رنگ کی تعبیر کچھ تو ہو — مجھکو فقط یہ خوابِ زلیخا نہ چاہیئے
اس کے سوا تو معنیٔ مجنوں بھی کچھ نہیں — ایسا بھی ربطِ صورتِ لیلیٰ نہ چاہیئے
ٹھہرے اگر تو منزلِ مقصود پھر کہاں — ساغر بکف گزرے تو سبھلنا نہ چاہیئے
اصغر صنم پرست سہی پھر کسیکو کیا — اہل حرم کو کاوشِ بجانہ چاہیئے

طاؤس

از جناب محمد یسین صاحب تسکین سورتوی

اے طائر بہشتی! اے تاجدار فطرت — رنگینیٔ مجسم!! رعنائیٔ خرامان!!
ہر بال و پر ہے تیرا نقش و نگار فطرت — تو ہے عروس گلشن، گل پوش و گل بدامان

رضوان نے تجکو پالا کاشانۂ ارم میں — غلمان تھے زیر طوبیٰ، گہوارہ دار تیرے
گودون میں لیکے تجکو کرتی تھین پیار حوریں — بوسون کے یہ نشان ہین نقش و نگار تیرے

اے صانع ازل کی نازک تریں نشانی — گلکاریون سے تجکو قدرت نے بھر دیا ہے
یہ رقص لاعبانہ، یہ لطف پرفشانی — فرش زمین کو تو نے فردوس کر دیا ہے

دم ہے بہار گستر یا کوئی چتر زرین — صد نیلم و زمرد جیمین جھلک رہے ہین
کیا ناز و تمکنت ہے، اُف رے خرام رنگین — ہر ہر قدم پہ تیرے غنچے چٹک رہے ہین

تو شمع انجمن ہے پھولون کی انجمن مین — روشن ہے نام تجھ سے رنگینیٔ جہان کا!
جو مو بمو چمن ہو وہ کیون رہے چمن مین — تو باغبان قدرت شاید کہ ہے یہان کا

جس وقت بولتا ہے راتون کی خامشی مین
ہو جاتی ہے لطافت پیدا کلی کلی مین

تسکین سورتوی

شاعر

(از پنڈت آنند نرائن صاحب ملّا ایم۔ اے۔ ایل ایل۔ بی)

(۱)

جلوۂ حُسنِ نہانی کا طلبگار ہوں میں — قصرِ دل جس نے بنایا ہے وہ معمار ہوں میں
آپ شیدا ہے جو اپنا۔ وہ پرستار ہوں میں — اپنی تخئیل کے پھندے میں گرفتار ہوں میں

فطرتِ انسان کی مضمر مرے جذبات میں ہے
چشمۂ آبِ بقا میرے خیالات میں ہے

(۲)

کب مری فکر رسا مائلِ افلاک نہیں — عزم پرواز پہ کب خاطرِ بیباک نہیں
طبع میری کبھی راغب سوئے خاشاک نہیں — میری تخمیر میں آمیزشِ گِل خاک نہیں

عالمِ غیب کی آواز ہے کانوں میں مرے
ہے جھلک گلشنِ فردوس کی آنکھوں میں مرے

(۳)

محرم اسرارِ حقیقت کا۔ کوئی ہے تو وہ میں — ترجماں دل کی حکایت کا۔ کوئی ہے تو وہ میں
آئینہ حُسن کی صورت کا۔ کوئی ہے تو وہ میں — پردہ در خوبیِ فطرت کا۔ کوئی ہے تو وہ میں

جلوہ زن شاہدِ معنےٰ مرے آہنگ سے ہے
رنگ سب گلشنِ ہستی کا مرے رنگ سے ہے

(۴)

شکل۔ تصویر میں لیلیٰ کی۔ عیاں میری ہے — لب پہ فرہاد کے فریاد و فغاں میری ہے
اس میں بھی خوبیِ اندازِ بیاں میری ہے — نام مجنوں کا کیا جس نے۔ زباں میری ہے

زیر و بم نغمۂ ہستی کا ہے تاروں پہ مرے
ہے نظر ایک زمانہ کی اشاروں پہ مرے

(۵)

رہروِ شوق کی میرے کوئی منزل ہی نہیں
مَیں وہ دریا ہوں جو شرمندۂ ساحل ہی نہیں
جس کو کہتے ہیں سکوں وہ کبھی حاصل ہی نہیں
ایک آفت ہے یہ سینہ میں مرے دل ہی نہیں
وہ حسیں کون ہے جس کا میں خریدار نہیں
مَیں وہ میکش ہوں جو توبہ کا گنہ گار نہیں

(۶)

مرے سینہ میں ہے جبتک دلِ شیدا باقی
دل میں جبتک ہے تپِ تابِ تمنا باقی
چشمِ ارماں میں ہے جبتک کوئی جلوا باقی
جستجو کا بھی رہے گا یہی سودا باقی
ساتھ لایا ہوں میں اپنے یہی تقدیر اپنی
اب تلک یاد ہے وہ خلد کی تقصیر اپنی

(۷)

طالبِ شمع بنوں مجھکو جو ملجائے شرر
شمع مل جائے تو پیدا ہو خیالِ اختر
ہاتھ لگجائے جو اختر تو ہو سودائے قمر
ماہ کے بعد رہے مہر کی خوبی پہ نظر
جو ٹھہر جائے کہیں پر وہ مری فکر نہیں
میرے مذہب میں قناعت کا کہیں ذکر نہیں

(۸)

قیدِ دستور سے آزاد ہے فطرت میری
مانتی ہی نہیں دنیا کی طبیعت میری
ایک عالم سے جدا ہے رہِ الفت میری
میرے سینہ کی اُمنگوں میں ہے قسمت میری
منحرف مجھ سے زمانہ ہو تو کچھ دُور نہیں
بات ٹل جائے مگر دل کی یہ منظور نہیں

(۹)

جس کو بس مَے سے غرض ہو وہ طبیعت ہی نہیں
ہو نہیں مَے نوش پر ایسی مجھے عادت ہی نہیں
میرے نزدیک پھر اُس مے میں لطافت ہی نہیں
جامِ صافی نہ ہو جبتک مجھے رغبت ہی نہیں
میں کبھی دل گلِ بیرنگ پہ دیتا ہی نہیں
دُرِ بے آب کسی دام پہ لیتا ہی نہیں

(۱۰)

حسنِ باطن کی ہوس مجھکو ستاتی ہی نہیں — صورت اچھی نہ ہو جبتک مجھے بھاتی ہی نہیں
رنگ جس میں نہیں بُو اُس کی لبھاتی ہی نہیں — میری فطرت مرے دل سے یہ بھلاتی ہی نہیں
حسنِ ظاہر جو نہیں خوبیِ پنہاں بھی نہیں
شکلِ یوسف نہ ہو جبتک مہِ کنعاں بھی نہیں

(۱۱)

داستانِ عشق و محبت کی سناؤں کیونکر — مَے الفت نہ پیوں خود تو پلاؤں کیونکر
چہرۂ نور سے پردہ کو اٹھاؤں کیونکر — جلوۂ حسن نہ دیکھوں تو دکھاؤں کیونکر
قیمتِ تازگیِ فکرِ سخن لیتا ہوں
اِس میں کیا عیب ہے کچھ پھول جو چُن لیتا ہوں

(۱۲)

خاطرِ جمع بایں راہ پریشاں کردم — نقدِ جاں باختم و صدقۂ ایماں کردم
بود ہر آں کہ زہوش و خرد ازاں کردم — تا دلے را بہ کف آرم ہمہ قرباں کردم
بہ لبِ شوق بسے لذتِ تلخیست مرا
مایۂ زیست ہمیں سینۂ زخمیست مرا

(۱۳)

آتشِ طورِ شرارِ غمِ دیرینۂ من — جامِ جمشید یکے پارۂ آئینۂ من
گر تو خواہی کہ بری فیضِ زگنجینۂ من — لحظۂ چشم بگرداں طرفِ سینۂ من
"شاعرم۔ حکم بہ پہنائے دو عالم دارم
نورِ افرشتہ و سوزِ دلِ آدم دارم"

آنند نرائن ملّا

ستی

(از منشی شیام موہن لال صاحب جگر بریلوی بی اے)

تیرگی بزمِ محبت کی مٹائی تو نے
دہر میں شمعِ وفا آکے جلائی تو نے
آگ اپنے دلِ مضطر میں لگائی تو نے
مشعلِ نورِ زمانہ کو دکھائی تو نے
نوعِ انساں کو رہِ عشق کی پہچان ہوئی
منزلِ زیست تیرے نور سے آسان ہوئی

حد سے جب بڑھنے لگی تیرگیٔ بزمِ شعور
ہوئی معبود کو اک شمع جلانا منظور
بھر دیا دل میں تیرے اپنی تجلّی کا وفور
تیرے پیکر کو بنایا گیا اک قالبِ نور
انجمِ چرخ میں یہ حُسنِ صفا تیرا ہے
ماہ و خورشید میں یہ جوشِ ضیا تیرا ہے

پاکدامانی و عصمت کو ہیں تجھ پر سو ناز
تیرے دامن پہ پڑھی آکے فرشتوں نے نماز
مایۂ عشق و وفا ہے ترے غم کا انداز
اب اسے کیا میں کہوں عین حقیقت کہ مجاز
اپنی ہی آگ میں تو جل کے فنا ہوتی ہے
منزلِ حق کے لیئے راہ نما ہوتی ہے

سمتِ مغرب سے اُٹھا ہے وہ قیامت کا غبار
بزمِ اخلاق ہوئی جاتی ہے اُف تیرہ و تار
مٹ چلے حسن و وفا حسن حیا کے آثار
اب لگائے ہیں نظر تیری طرف اہلِ دیار
ہاں ذرا سوزِ دروں آج دوبالا ہو جائے
پھر زمانہ میں وہ اگلا سا اُجالا ہو جائے

جگر بریلوی

پریت کا گیت

(از ابوالاثر مولانا حفیظ جالندھری مدیر مخزن لاہور)

اپنے من میں پریت
بسالے
اپنے من میں پریت

من مندر میں پریت بسالے — چھوڑ دے مسجد اور شوالے
دل کی دنیا کرلے روشن — آنکھوں میں یہ جوت جگالے
پریت ہے تیری ریت پرانی — بھول گیا او بھارت والے!

بھول گیا او بھارت والے
پریت ہی تیری ریت
بسالے
اپنے من میں پریت

اپنے من میں پریت
بسالے
اپنے من میں پریت

کرودھ کپٹ کا اترا ڈیرا — چھایا چاروں کھونٹ اندھیرا
شیخ۔ برہمن، دونوں رہزن — ایک سے بڑھ کر ایک لٹیرا
ظاہر داری کی سنگت میں — کوئی نہیں ہے سنگی تیرا

کوئی نہیں ہے سنگی تیرا
من ہی تیرا میت

بسالے

اپنے من میں پریت

اپنے من میں پریت

بسالے

اپنے من میں پریت

بھارت ماتا ہے دکھیاری دکھیارے ہیں سب نر ناری

تو ہی اُٹھالے سُندر مُرلی تو ہی بن جا شام مُراری

تو جاگے تو دنیا جاگے جاگ اُٹھیں سب پریم پجاری

جاگ اُٹھیں سب پریم پجاری

گائیں تیرے گیت

بسالے

اپنے من میں پریت

اپنے من میں پریت

بسالے

اپنے من میں پریت

نفرت اک آزار ہے پیارے دُکھ کا دارو پیار ہے۔ پیارے!

آجا اصلی روپ میں آجا تو ہی پریم اوتار ہے۔ پیارے!

یہ ہارا تو سب کچھ ہارا من کے ہارے ہار ہے۔ پیارے!

من کے ہارے ہار ہے پیارے

من کے جیتے جیت

بسالے

اپنے من میں پریت

اپنے من میں پریت
بسالے
اپنے من میں پریت

دیکھ بڑوں کی ریت نہ جائے سرجائے۔ پر میت نہ جائے
میں ڈرتا ہوں کوئی تیری جیتی بازی جیت نہ جائے
جو کرنا ہے جلدی کرلے تھوڑا وقت ہے بیت نہ جائے
تھوڑا وقت ہے بیت نہ جائے
وقت نہ جائے بیت
بسالے
اپنے من میں پریت

حفیظ جالندھری

کلام افسر

(از جناب جاہد اللہ صاحب افسر میرٹھی)

ہوں محوِ خواب اتنا کہ بے خود ہوں مست ہوں،
اب میں خدا پرست نہیں خود پرست ہوں،
وحشت میں کس کو صاحب دامن کا ہوش ہے
اتنا تو جانتا ہوں کہ دامن بدست ہوں،
یا محو ہو گیا ہوں میں خود اپنے شعر میں،
یا کیفِ گیر نغمۂ روزِ الست ہوں،
اللہ رے طلسم عناصر کی وسعتیں،
میں کیا ہوں اس طلسم کا اک بندوبست ہوں،
اتنی بھی کیف ریز خزاں میں نہ بہار،
ہر شاخ کو گماں ہے کہ ساغر بدست ہوں،
افسر مری نظر میں ہیں کل شب کی منزلیں
میں ایک رہ نوردِ شکوں مہ پرست ہوں،

افسر میرٹھی

خاک ہند

(از منشی تلوک چند صاحب محروم بی اے)

اے خاکِ پاک ہند! ہم اوجِ فلک ہو تو — اِس تیرگی پہ سُرمۂ چشمِ ملک ہے تو
انوارِ معرفت کی دکھاتی جھلک ہو تو — یعنی امین رازِ ازل آج تک ہے تو
ہر چند جیسی پہلے تھی ویسی نہیں ہے تو
عالم میں اب بھی کعبۂ جاپان و چیں ہے تو

کچھ رازِ ہست و نیست کھُلا تو کھُلا یہیں — عُقدے فنا بقا کے ہوئے آ کے وا یہیں
بیتابیٔ نہاں کی ہوئی ابتدا یہیں — تسکینِ رُوح کی ہوئی پیدا فضا یہیں
پہونچے یہیں کے خاک نشیں آسماں تلک
فکرِ رسا نے کھوج لیا لامکاں تلک!

وادی جو ہے تری وہی ایمن حریم ہے — ہر کوہ پر حکایتِ طُور و کلیم ہے
ہر ذرّہ تیرا مظہرِ حُسنِ قدیم ہے — تو جلوہ گاہِ رحمتِ ربِّ کریم ہے
آتی ہے آہ! تیری ہواؤں سے بوئے خُلد
ہو زندگی یہاں کی تو کیوں جائیں سوئے خُلد

پیدا ہے تیرے سبزہ و گُل سے بہارِ خلد — کرتے نہیں ہیں تیرے مکیں انتظارِ خلد
لیل و نہار ہیں ترے لیل و نہارِ خلد — دیکھے تری فضا جو کوئی ہو نثارِ خلد
ہر چند وہ سماں نہیں اور وہ نہیں ہے تو
پھر بھی زمیں پہ رشکِ بہشتِ بریں ہے تو

دو گل شگفتہ ہیں ترے گلشن میں عقل و عشق — کھِلتے ہیں اپنے قدرتی جوبن میں عقل و عشق
رہتے ہیں مل کے ایک نشیمن میں عقل و عشق — پاتے ہیں پرورش ترے دامن میں عقل و عشق
صہبائے بیخودی بھی ہے۔ ذوقِ عمل بھی ہے
جوششِ عیاں بھی۔ خامشیِ بے خلل بھی ہے

تہذیب تیری چشمِ جہاں میں سما گئی تعلیم تیری جور و ستم کو مٹا گئی
تقلید تیری دہر کو جنت بنا گئی تا ساحلِ عرب تری ٹھنڈی ہوا گئی
ہر ذرہ ہے ترا وہ ضیا بارِ فلسفہ
یوناں تلک گئے ترے انوارِ فلسفہ!

تو آج مٹ مٹا کے بھی ہے فخرِ روزگار بس چل سکا نہ گردشِ دوراں کا زینہار
دورِ زماں سے مٹ نہیں سکتی تری بہار ہر داغِ دل ہے پھول کی صورت میں آشکار
بدخواہ گو ہے صدیوں سے چرخِ کہن ترا
پھر بھی اُجڑ اُجڑ کے ہرا ہے چمن ترا

تلوک چند محروم

جذبات ناشاد

فکر تازہ پرنسپل رام پرشاد صاحب کھوسلہ ناشاد۔ ایم۔ اے۔ آئی۔ ای۔ ایس

نہیں محرومِ ساماں طرب سے اپنی ویرانی گدائی میں بھی اس در کی ہے پنہاں شانِ سلطانی
بلا جانے تری اے محتسب معلوم کیا تجھکو نہاں ہیں دلق درویشی میں کتنے لعلِ رمانی
جنھیں ہے عشق صادق جنکو ذوقِ درد الفت ہے کرے کیا مضطرب انکو شبِ ہجراں کی طولانی
اگر ہے وصل کا ارماں تجھے اے ناصحِ ناداں تو ہو وقفِ تمنا شوق میں کر دل کی قربانی
بتا زاہد ملا جمعیت خاطر سے کیا تجھکو مجھے عرشِ بریں تک لے گئی میری پریشانی
نہ طاقت ضبط کی دلکو نہ چارہ مجھکو درماں کا کہوں کیا تجھ سے اے ناصح میں حال درد پنہانی
ابھی کون و مکاں کا راز کھلجائے گا اے زاہد اگر گوشہ نشینی چھوڑکر ہو محو دربانی
مرے دلکی ہے قیمت اِک نگاہِ ناز جانانہ تعجب ہے مجھے جنس گراں کی دیکھ ارزانی
جو دنیا میں رموزِ عشقِ صادق سے ہیں نامحرم نہیں معلوم انکو شیوہ ہائے اشک افشانی
جو سچ پوچھو تو اے زاہد نہیں بہتر زمانہ میں مری عریانی تن سے کسی کی پاک دامانی
کبھی تر دامنی کا اسپہ دھبہ آ نہیں سکتا ترے فرخر سے بہتر ہے اے زاہد میری عریانی
وہی اللہ کا گھر ہے جہاں سب کو پہنچنا ہے
کہاں کا کفر اے ناشاد اور کیسی مسلمانی

رباعیات یگانہ

از قلم میرزا یاس یگانہ لکھنوی

جس باگ پہ چاہے موڑتی ہے دنیا کستی ہے، کبھی جھنجھوڑتی ہے دنیا
پائے خود سر کو توڑتی ہے دنیا نامرد بنا کے چھوڑتی ہے دنیا

ولہٗ

دل کعبۂ بتخانہ نما کیوں نہ ہوا؟ کیوں، محرم بیگانہ نما کیوں نہ ہوا؟
سُنتا سب کی مگر نہ کہتا اپنی، فرزانۂ دیوانہ نما کیوں نہ ہوا؟

ولہٗ

آخر نگہِ شوق نے گرماہی دیا مجبور نے فتحار کو شرماہی دیا
کچھ بس نہ چلا اپنے گنہگاروں سے سرکار نے حکمِ عشق فرماہی دیا

ولہٗ

کس دُھن میں کوہکن نے تیشہ باندھا سر پھوڑ کے خود۔ موت کا آگا باندھا
قدموں سے لپٹ گئی حیاتِ ابدی کیا عشق کے سر اجل نے سہرا باندھا

یگانہ لکھنوی

خوشی

(از جناب رشید احمد صاحب صدیقی اڈیٹر اودستان)

زد سے آفات کی جب دل کہین گھبرا جائے
طبع روشن پہ تفکر کی گھٹا چھا جائے

جب نہ دین چرخ کی پیچیدگیان راہ گزر
جب ستہائے زمانہ سے ہو سینہ لبریز

جب نہ ہو عقل مین تدبیر کی قدرت باقی
جب نہ ہو ذہن مین تسکین کی صورت باقی

جبکہ احساس جگر سوئے دماغ آ نہ سکے
آنکھ جب حسن مظاہر کا مزا پا نہ سکے

جب خیالات کا حالات سے رشتہ نہ رہے
فکر آیندہ نہ ہو یاد گذشتہ نہ رہے

دیکھئے غور سے انسان کی عظمت کی طرف
پھیلتی جائیگی اک روشنی ظلمت کیطرف

چڑھئے رفعت پہ تب انجم سے تبسم کیجئے
غم کے بیڑے کو وہین نذر تلاطم کیجئے

جذبات وحشی

(از منشی کرشن سہائے صاحب بہکاری فتحپوری)

نا رپیدا کرے سینے میں یہ وہ نور نہیں
جلوۂ دل ہے یہ کچھ برق سر طور نہیں

منزل راہ حقیقت کبھی بے نور نہیں
یہ وہ دنیا ہے کہ جسمیں شب دیجور نہیں

سر میں سودا ہو تو منزل بھی کہیں دور نہیں
دار ابتک ہے وہی پر کوئی منصور نہیں

میں نے مانا کہ مرے دل سے وہ کچھ دور نہیں
کیا کروں میں کہ سکوں قلب کا دستور نہیں

جانتا ہوں میں انا الحق کی حقیقت لیکن
بندگی ترک کروں یہ مرا دستور نہیں

پی نہ لینا کہ کہیں ہوش بھی آنے سے رہے
بادۂ عشق ہے یہ بادۂ انگور نہیں

اپنے قطرے میں بھی ہے جوش انا البحر و لے
میرے مسلک میں روا نعرۂ منصور نہیں

پہلے سودا تو ہو سر میں کوئی جانباز تو ہو
آزمائش کے لیے دار و رسن دور نہیں

وحشی خستہ کے جذبات کو وہ کیا سمجھے
بادۂ عشق حقیقت سے جو مخمور نہیں

فلسفۂ خیام

از ابوالکمال سید عبدالودود صاحب وردؔ بریلوی

سبز اور شاداب جنگل اور اک مستِ شباب
اک صراحی، اور صراحی میں ہو انگوری شراب

اپنی مرضی کے ہو تابع ساقیِ توبہ شکن
ہم ہوں اور قتّالۂ عالم کا حُسنِ بے نقاب

ضو فشاں ہو چہرۂ خورشید طلعت ہر طرف
اُس کا جلوہ ہو بجائے خود "طلوعِ آفتاب"

اور ساقی کی ترنم آفرینی کے لیئے
زانوؤں پر اس کے اک رکھا ہو چھوٹا سا رباب

فرشِ سبزہ سامنے پھیلا ہو تا حدِّ نظر
روبرو رکھا ہو مینا۔ ہاتھ میں جامِ شراب

ایک جرعہ پی کے ساقی خود ہمیں دیدے گلاس
تاکہ جھوٹی اُسکی ہو جائے وہ سچ مچ کی شراب

ڈوب جائے کیف میں صہبا کے یہ حسِّ شعور
ہو خیالِ احتیاط و اتقا غرقِ شراب

فارغ البالی مُیسّر ہو اگر ایسی تو ہم
قلبِ آسودہ سے کر دیں محو خوفِ احتساب

بے خبر، نا اہل لوگوں سے نہ رکھیں واسطہ
ہوں جلیس اپنے مئے و معشوق اور چنگ و رباب

یہ فراغت بادشاہِ وقت کا حصّہ نہیں
صرف اہلِ دل کی قسمت ہے یہ عیشِ بیحساب

سعی اور تدبیر سے بالا ہے اس کا مرتبہ
بخت و قسمت میں نہیں ہے کوئی دخلِ اکتساب

زندگی کی کشمکش ہے دارِ فانی میں عبث
اس میں کیکاؤس و جم بھی ہو چکے ناکامیاب

ایک فرصت بے خودی کی، ایک لمحہ عیش کا
ہے حیاتِ پنج روزہ کا یہی لبِّ لباب

آرزو

از سید محمد ضامن علی صاحب ایم۔ اے صدر اردو ڈپارٹمنٹ الہ آباد یونیورسٹی

ہے فزوں حد بیان سے عزّ و شان آرزو
سجدہ گاہِ دو جہان ہے آستان آرزو

دل وہی جس کی کہ عظمت لامکان سے کم نہین
اصل مین دیکھو تو بس ہے اِک مکان آرزو

دونون عالم جسکو کہتے ہین وہی کیا چیز ہین
ایک جسم آرزو ہے ایک جان آرزو

ہاتھ مین کشکول رکھتی ہے فقیرون کے یہی
بادشہ کا سر ہے وقفِ آستان آرزو

آرزو تخلیق کی پیدا ہوئی اللہ کو
اس سے بڑھکر کیا دکھائین تم کو شانِ آرزو

ظلم ظالم کیا ہے؟ اِک خاموش حسرت کا وجود
نالۂ مظلوم کیا ہے؟ اِک فغانِ آرزو

آرزوئین نیک تھین یا بد تھین جانچے گا خدا
اصل مین دنیا ہے دار امتحان آرزو

خانۂ دل مین اسی کی روشنی ہے جلوہ گر
آرزو خود ہے ضیا بخش مکان آرزو

دفترِ عالم کا تم اِک اِک ورق دیکھو بغور
جتنے قصّے ہین وہ سب ہین داستان آرزو

طور پر موسےٰ کرین دیدارِ خالق کا سوال
ساتھ دے بیٹھے جسارت کا زبان آرزو

رام جی کیون کھینچتے جاکر جنک جی کی دھنک
دل مین گر ہوتا نہ تیرِ بے کمان آرزو

بے ستون اور بازوئے فرہاد سے نسبت ہی کیا
عقل مین آتی نہین تاب و توانِ آرزو

شہسوارون سے بھی میدان جیتے اک نے سوار
پھیر دے ہمّت کی جانب گر عنانِ آرزو

بے طلب سب دلمین آجاتے ہین وقت دار و گیر
ہمّت و جوش و شجاعت نیمانِ آرزو

متّحد گر آرزو ہو جائے اہلِ مُلک کی
پھر بہار اپنی دکھائے گلستانِ آرزو

جبر مین بھی یہ اگر اپنا دکھائین اختیار
بند راہین کھولدین وابستگانِ آرزو

قوتین مغلوب کر دین بڑھ کے خود کمزور لین
توپ کا گولہ بنے تیر کمانِ آرزو

کام کی کثرت سے ضامن وقت ملتا ہی نہین
چند گھنٹون مین ہو کیا شرحِ بیانِ آرزو

زمانہ کی جوبلی

از حضرت اقبال ورما سحر تہنگامی

اے زمانہ! دل سے ہے شکرِ خدائے ذوالجلال — آج تیری عمر کے پورے ہوئے پچیس سال
کتنی مشکل منزلون سے ہو چکا تیرا گزر — کتنی نازک حالتون سے بچ سکا تو بال بال
نام کو بھی کب کبھی آئی تری رفتار مین؟ — ہے کسی کا اس قدر ثابت قدم ہونا محال
لمحہ لمحہ آن کو اپنی نبھانے مین تجھے — کب ہوئی پروائے جان یا کبھی پروائے مال؟
خدمتِ علم و ادب کے ساتھ ہی تجھکو رہا — قوم کی اور ملک کے بے لوث خدمت کا خیال
تھا نہ گرم اور تھا نہ سرد ایسا رویہ تھا ترا — یون رہا تسکین دہ دل تیرا لطف اعتدال
تو سدا چہکا کیا گلزارِ نظم و نثر مین — نغمہ پردازی سے بنکر بلبلِ شیرین مقال
ہر فدائے باغِ معنی کے دلِ پُر شوق کو — ہر نفس کرتا رہا مسرور تیرا حسن قال
خود ہوا تیرا کمال اس طرح آخر قدر زا — تیرے گرویدہ ہوئے بے شبہ سب اہلِ کمال
آہ، گونا گونیان اپنے دلی جذبات کی! — آہ تجھ مین تیری بوقلمونیون کا اشتمال
دہر مین القصہ اپنے مختلف اوصاف سے — اے زمانہ! تو رہا بنکر بس آپ اپنی مثال
شکر ہے تو بدر کامل ہو کے چمکا آخر آج — گر کسی وقت آسمانِ اوج کا تو تھا ہلال
کیون نہ پھر دلکو مسرت ہو کہ یہ تیرا شباب — ہے اُسی حالت سے شایان جبکہ تھا تو نونہال
تجھکو اپنی جوبلی کی یون مبارک ہو خوشی — دور رہی تجھ سے رہے اب کلفتِ رنج و ملال
کاش تیرے حوصلے اس درجہ ہو جائین بلند — جلد ہی حل ہو تری معراج یابی کا سوال
اے زمانہ! یون زمانہ سے رہے تیرا لگاؤ — کر سکے وہ تیری ہستی کو نہ اصلا پائمال
تیرا مستقبل بھی پُر اُمید ہو گا بالیقین — تھا جو پُر اُمید ماضی، ہے جو پُر اُمید حال

یہ دُعا ہے سحر کی تجھکو ترقی ہو نصیب
عزت و شہرت سے روز افزوں ہو تیرا اتصال!

یادِ رفتگان

(ایک نظر بازگشت)

ماقصہ سکندر و دارا نہ خواندہ ایم
از ما بجز حکایت مہر و وفا مپرس

چوتھائی صدی کا زمانہ، قومی زندگی یا ملکی ترقی کے لیے کوئی بڑی مدت نہ ہو لیکن۔ ایک اردو رسالہ اور ایک معمولی شخص کی زندگی کا بہت بڑا حصہ ہوتا ہے۔ فروری ۱۹۰۳ء میں جب یہ سالہ زمانہ کا پہلا پرچہ قیصری پریس بریلی سے شایع ہوا تھا تو ملک کی سرد مہری اور اُردو کی عام بیقدری دیکھتے ہوئے کسکو اسکی جوبلی دیکھنے کی امید ہو سکتی تھی، مگر شکر کا مقام ہے کہ آج اسکی عمر کے پچیس پورے ہو گئے اور اس نمبر کی اشاعت سے اس کا چھبیسواں سال شروع ہوتا ہے۔ یہ پچیس سال کس محنت و جانکاہی سے بسر ہوئے۔ اس عرصے میں دنیا کے کیسے کیسے نشیب و فراز دیکھنے میں آئے۔ ملکی خیالات نے کہاں سے کہاں تک ترقی کی۔ قومی زندگی میں کیا کیا انقلابات رونما ہوئے؟ اسوقت ان اہم سوالات کے مفصل جواب دینے کا موقعہ نہیں ہے، لیکن آج جب خدا کی عنایت اور بندگان خدا کی اعانت سے "زمانہ کا جوبلی نمبر شائع ہو رہا" ہے تو اُن بزرگوں اور مہربانوں کے احسانات کا سرسری ذکر نہ کرنا بھی کفرانِ نعمت ہو گا جنکی امداد و سرپرستی کے بغیر اس ناچیز ادبی خدمت کا سلسلہ کسی طرح اتنے دنوں قائم نہ رہ سکتا تھا۔ مگر آج رسالہ کے چھبیسویں سالگرہ کے دن اُن احباب زمانہ کی بے اختیار یاد آرہی ہے جنکی مالی سرپرستی اور قلمی اعانت کے بغیر یہ ادبی تحریک سرسبز و بارآور ہونا درکنار وجود ہی میں نہ آسکتی تھی افسوس اسوقت ہمارے اکثر ہمدرد و معاون ہماری خوشی میں شریک ہونے اور ہماری محنتوں کی داد دینے کو دنیا میں موجود نہیں ہیں، ہماری بزم ادب انکے بغیر سونی ہو رہی ہے لیکن دل کی بستی میں انکی لطف و عنایت کی یادگار ہمیشہ باقی رہے گی انکے اخلاص و محبت کے نقش زمانہ کے صفحات سے کبھی محو نہیں ہو سکتے ہیں، اور جب تک جسم و جان کا ارتباط باہمی قائم ہے، ان محسنانِ قدیم کی یاد تازہ رہیگی۔

مشیت ایزدی میں کسی کو دخل اور عدم مصلحت خداوندی میں چون وچرا کی گنجائش ہے لیکن ناظرین زمانہ معاف فرمائیں اگر اس مسرت انگیز موقعہ پر ہماری خوشی اس خیال سے کسیقدر مکدر و نامکمل ہے کہ زمانہ کے نامور بانی آج کے جشن میں حصہ لینے کے لیے ہمارے درمیان موجود نہیں ہیں جس ادبی خدمت کی بنیاد رکھنے کا فخر موصوف کو حاصل ہے اُسے پھلتا پھولتا تو انھوں نے دیکھ لیا لیکن آج ہمکو مبارکباد دینے اور ہمارا مبارکباد لینے کے لیے وہ دار فانی میں باقی نہیں ہیں۔ سچی حبِ وطنی کو انکی ذات

گرامی پر ہمیشہ فخر کرینگا موقعہ رہیگا۔ منشی راج بہادر صاحب ریاست رامپور کے ایک ہردلعزیز و بے لوث افسر تھے۔ انتہائی دیانتداری کے ساتھ اپنے فرائض منصبی ادا کرنے کے علاوہ، وہ ریاست میں کسی سے کوئی واسطہ نہ رکھتے تھے۔ ریاست رامپور کے وہ بچے بہی خواہ تھے لیکن یہ خیر خواہی انکے لیے فرض کے بمنزلہ تھی۔ اس لیے اسکے اعلان کی نہ انھوں نے کبھی کوئی ضرورت ہی محسوس کی اور نہ اس سے کسی وقت کوئی خاص فائدہ اٹھایا۔ اپنی دیانتداری کا یہی صلہ وہ کافی سمجھتے تھے کہ تمام عمر اپنے آقائے نامدار کے معتمد علیہ رہے۔ عزت سے زندگی بسر کی اور عزت ہی کے ساتھ اس دارفانی سے رحلت کرکے عالم جاودانی ہوگئے۔

موصوف بریلی کے ایک قدیم کایستھ خاندان کے نامور رکن تھے۔ عرصہ تک پبلک ورکس ڈپارٹمنٹ کے اہلکار رہنے کے بعد آپ کی خدمات ریاست رامپور میں منتقل ہوگئی تھیں، جہاں آپ نے ۳۵ سال تک ریاست کی خدمت انجام دی۔

رفاہ عام کے کاموں سے آپ کو شروع ہی سے شوق تھا۔ چنانچہ بریلی کا مشہور یتیم خانہ آپ ہی کا قائم کردہ ہے، جب تک اسکی عمارت تیار نہیں ہوئی آپ نے یتیموں کے لیے اپنا گھر خالی کردیا۔ یہ ایک چھوٹا سا واقعہ ہے، لیکن اس سے انکی دلی کیفیت آئینہ ہوجاتی ہے۔ منشی راج بہادر کا خاصہ تھا کہ جس کام کو شروع کرتے تہ دل سے کرتے۔ انکی آنکھ میں مروت اور دل میں درد تھا۔ وہ دولتمند نہ تھے۔ لیکن خلوص اور نیک نیتی کی بدولت انکے ہاتھ میں جس، اور انکے روپیہ میں برکت تھی۔ انکی سب سے بڑی خصوصیت یہ تھی کہ صرف کام سے غرض رکھتے تھے نام سے نہیں۔

انکی سب سے بڑی لیاقت یہ تھی کہ دوسروں کو بھی وہ اپنے نیک جذبات سے متاثر کرکے ان سے حسب مرضی کام لے سکتے تھے۔ انکی بے لوثی کا اس سے زیادہ ثبوت اور کیا ہوسکتا ہے کہ کئی سال تک وہ زمانہ پر ہزارہا روپیہ صرف کرتے رہے لیکن کسی پر اپنا نام تک ظاہر نہ ہونے دیا۔ واقعی موصوف زندگی بھر "نیکی کر دریا میں انداز" کے اصول پر کاربند رہے۔ زمانہ جاری کرکے چوبیس برس بعد تک وہ زندہ رہے لیکن کبھی انھوں نے اپنا نام نامی ظاہر کرنے کی اجازت نہ دی۔ البتہ خاص احباب واقف تھے، لیکن انکو بھی آپ کے جذبات کا احترام کرنا پڑتا تھا۔ چنانچہ بابو گنگا پرشاد ورما انجمانی نے اپنے معزز اخبار ہندوستانی مورخہ ۴ ستمبر ۱۹۰۲ء میں لکھا تھا کہ "ہم رسالہ زمانہ کے مالک کی جنکا نام ظاہر نہیں کیا گیا ہے۔ ملکی جوش کی تعریف کرینگے کہ وہ نقصان کثیر سے رسالہ چلا رہے ہیں"۔ بعض دور اندیش وزیر پرست اصحاب نے انھیں اس کام میں اپنا روپیہ برباد کرنے سے منع بھی کیا لیکن وہ اپنی دھن کے پکے تھے جو کام کرتے تھے کسی خاص مقصد کو پیش نظر رکھ کر کرتے تھے۔ اسکے لیے خود بھی ایثار کے لیے تیار رہتے اور دوسروں کو بھی ایثار کے واسطے آمادہ کردیتے تھے۔ منشی راج بہادر کو رفاہ عام کے کاموں کا دلی شوق تھا۔ وہ ملک کی قومی زندگی کے ہر شعبہ میں ترقی کے کوشاں تھے، اسی لیے اصلاح تمدن کے زبردست حامی ہونیکے ساتھ ساتھ وہ سیاسی ترقی کے خواہشمند اور علمی ترقی کے دلدادہ تھے۔ اور ہر مد میں قومی کارکنوں کی

تعداد میں اضافہ ہونا ضروری سمجھتے تھے۔ چنانچہ اسکے لیے کوئی موقعہ اپنے ہاتھ سے نہ جانے دیتے۔ بابو شیو برت لعل صاحب ودمن آج ایک کامیاب مصنف ہیں جنکی صدہا کتابیں شایع ہوکر مقبول عام ہوچکی ہیں۔ درحقیقت کثرت تصانیف کے لحاظ سے زمانۂ حال کے اردو مصنفین میں بابو شیو برت لال ودمن اور خواجہ حسن نظامی ہی ایسے اصحاب ہیں جنھوں نے ہر طرف مضامین نو کے انبار لگا دیئے ہیں۔ مگر بہت کم لوگوں کو معلوم ہوگا کہ بابو شیو برت لال صاحب کو سرکاری ملازمت سے ہٹاکر تصنیف و تالیف کے رستے میں منشی راج بہادر بانیٔ زمانہ ہی نے ڈالا تھا۔ آپ ہی کی متواتر و مسلسل کوششوں سے نامور محب وطن بابو گنگا پرشاد ورما نے اپنا مشہور و معروف انگریزی اخبار ایڈوکیٹ جاری کیا تھا۔ آپ ہی کی بزرگانہ حوصلہ افزائیوں نے ناچیز ایڈیٹر زمانہ کے دلمیں ملک کی ادبی خدمت کا چسکا پیدا کردیا اور اسکی زندگی اسی کام کے وقف ہوگئی۔

بہرحال منشی راج بہادر کی ذات گرامی پر اس رسالے کو فخر کرنیکا حق حاصل ہے دنیا میں کوئی شخص نہ ہمیشہ رہا ہے، اور نہ رہیگا لیکن منشی راج بہادر کے اخلاص و حب الوطنی کی یاد عرصہ تک دلوں میں باقی رہے گی۔

پچیس سال کی پرانی جلدیں آوقت ہمارے سامنے ہیں اور ہمارا دل احسانمندی اور شکرگذاری کے جذبات سے لبریز ہوجاتا ہے۔ کن کن عنایت فرماؤں کا ان مختصر صفحات میں ذکر کیا جائے۔ عہد حاضرہ کے سبھی انشاپردازانِ اُردو نے ہماری اعانت فرمائی ہے۔ بقول اور بالمکند گپتا ایڈیٹر بھارت متر "کتنے ہی بوڑھے اہل قلم جو بیس بیس سال سے لکھنا چھوڑ بیٹھے تھے، زمانہ کے اجرار کے بعد آپ لکھنے لگے"۔ ان میں سب سے پہلا قابل ذکر نام ہمارے صوبہ کے زندۂ جاوید شاعر و فلسفی اکبر کا ہے۔ جنکی شاعری کا طلسم سکوت سالہا سال کے بعد اسی ناچیز رسالہ کی مسلسل کوششوں سے ٹوٹا تھا۔ جناب اکبر قدیم اودھ پنچ کے مشہور مضمون نگاروں میں تھے۔ علی گڈھ کی تحریک و فیشن پر اپنے بیمثل انداز میں ظریفانہ تنقیدیں کیا کرتے تھے۔ مگر جب اردو شاعری قدیم و جدید طرز کی کشمکش میں پھنس گئی تو آپ دم بخود ہو رہے صحت بھی اچھی نہ رہتی تھی۔ جو کچھ کہتے اپنے ہی دل کی خوشی کے لیے کہتے، کلام کی اشاعت کا خیال ہی دل نکال دیا تھا۔ اور مزاج میں یک گونہ بے پرواہی دخل پاگئی تھی۔ لیکن ہمارے مسلسل اصرار سے مجبور ہوکر آخر آپ نے جنوری ۱۹۰۴ء سے زمانہ کے لیے اپنی نظمیں عنایت فرمانا شروع کیں، چنانچہ آپ نے زمانہ سلسلۂ جدید کے پہلے ہی نمبر میں اپنی شاعرانہ مشکلات کا نہایت پرلطف پیرایہ میں ذکر کیا ہے۔ ملاحظہ فرمائیے

قدیم وضع پر قائم رہوں اگر اکبر، — تو صاف کہتے ہیں سید یہ رنگ ہے میلا
جدید طرز اگر اختیار کرتا ہوں، — خود اپنی قوم مچاتی ہے شور و واویلا
جو اعتدال کی کہیئے تو وہ اِدھر نہ اُدھر — زیادہ حد سے دیئے پاؤں سب نے ہیں پھیلا
اِدھر ہے دفتر تدبیر و مصلحت ناپاک — اُدھر ہے وحی ملایت کے ڈاک کا تھیلا

اکبر مرحوم سرکاری ملازمت کے زمانہ میں کانپور رہ چکے تھے اور ایڈیٹر زمانہ کے بزرگوں کے عنایت فرما تھے جسکی وجہ سے وہ اس پر ہمیشہ خاص طور پر مہربان رہے، اور ان کا بہترین کلام زمانہ ہی میں شائع ہوا ہے۔

آہ اب ایسے وضعدار اور عالی خیال بزرگ کہاں دیکھنے کو نصیب ہونگے۔ ادنیٰ ادنیٰ امور کا بھی لحاظ فرماتے تھے۔ نجی خط و کتابت میں ذرا ذرا سی بات کی داد دیتے تھے۔ ۱۹۰۴ء کے ایک خط میں لکھتے ہیں: کہ آپ ایسے قابل اور وسیع المشرب نوجوانوں کی درحقیقت ملک کو ضرورت ہے۔ خدا کامیاب کرے۔ اسقدر انگریزی پڑھکر شاذ ہی ایسی طبیعت رہجاتی ہے: .....

ایک دوسرے خط میں تحریر فرماتے ہیں "کہ آپکا خط پڑھکر پہلی ہی جو بات ذہن میں آئی وہ یہ تھی، "عزیز از جان" یہ اُردو آپ کو کس طرح آگئی۔ آپ کہیں گے بھلا یہ بھی کوئی بات ہے۔ جی ہاں۔ یہ ایک بات ہے، اور بڑی بات ہے:

۱۹۱۰ء میں آپ نے اولن مل کی لوئی منگوائی تھی۔ حسن اتفاق سے انھیں دنوں کلیات اکبر کی پہلی جلد شائع ہوئی تھی۔ اور اس کا ریویو زمانہ میں شائع ہوا تھا۔ اس پر آپ نے لکھا۔ "خدا خوش رکھے، آپ داد بھی دیتے ہیں، اور خلعت بھی۔ لوئی اوڑھکر آپکا ریویو پڑھتا ہوں، اور تھینکس دیتا ہوں، ..... ایسے لایق سخن شناس کم ہوتے ہیں۔ میں نہ ہونگا، لیکن آپ میری یاد کو بہت دن زندہ رکھیں گے۔"

۱۹۱۱ء میں ایک خط میں لکھتے ہیں کہ:-

"عزیزم سلمہ۔ اوّل تو آپ کے بزرگوں سے مجھ سے مراسم تھے دوسرے آپ میرے بہت ابتدائی پبلشروں میں ہیں۔ تیسرے قیمتی تحائف (۱) چوتھے آپ کی سلامت روی، ان وجوہ سے آپکو یاد رکھتا ہوں اور نیاز نامہ لکھا تھا۔ ورنہ میں اب بہت کچھ معذور ہوں، اور معذور ہوتا جاتا ہوں نشاط طبع ہے نہ حرص فردا ....."

۲ نومبر ۱۹۱۴ء کے ایک نوازش نامہ کی عبارت ملاحظہ ہو۔

"میرے محترم عنایت فرما۔ بیماری ناتوانی اور ترددات نے نکما کر دیا ہے۔ حکم کو ٹال نہ سکا مشکل سے کچھ اشعار نقل کرکے ارسال خدمت کرتا ہوں۔ قدر افزائے اکبر کو خدا خوش رکھے"

کیا اس محبت کی یاد دل سے کبھی محو ہو سکتی ہے؟-

---

(۱) اس صوبہ کے نامور اخبار نویس بابو گنگا پرشاد ورما کا نام اوپر آچکا ہے۔ آپ بھی زمانہ کے اولیں معاونین میں تھے، ہمعصر عبارت مترجمہ نے لکھا تھا کہ کتنے ہی مشہور مصنف اور کتنے ہی نامی اخباروں کے ایڈیٹر زمانہ کے لیے مضامین لکھتے ہیں

ایڈیٹروں کو اپنے اپنے اخباروں ہی سے فرصت نہیں پھر ان سے مضامین لکھانا زمانہ کی بہادری ہے، خیر کچھ ہو ورما صاحب کے پاس ہندوستانی وائسرائے کیبنٹ کی ایڈیٹری اور دیگر پبلک مصروفیتوں کی وجہ سے بمشکل کوئی وقت بچتا تھا۔ تاہم ستمبر ۱۹۲۴ء میں آپ نے پولیٹیکل تعلیم کی ضرورت پر ایک خاص مضمون لکھکر زمانہ کو عنایت فرمایا۔ اور اسکے بعد بھی کئی بیش بہا مضامین لکھے، صوبہ متحدہ میں پولیٹیکل اخبار نویسی کی بنیاد ورما صاحب ہی کی بدولت قائم ہوئی آپ کی وجہ سے اس کا معیار اور اس کی شان بہت بڑھ گئی آپ کی بے لوثی، نیک نفسی اور فرض شناسی ضرب المثل تھی۔ اپنے اکلوتے بیٹے کی موت پر بھی آپنے اخبار کا دفتر بند نہ کیا۔ جس محنت و جانفشانی سے آپ اپنے فرائض منصبی انجام دیتے تھے۔ جس خلوص و محبت کے ساتھ اہل وطن کی خدمت کرتے تھے۔ اسکا احسان ہمیشہ ہماری گردنوں پر رہیگا۔ آپ کا اردو خط آسانی سے پڑھا نہ جا سکتا تھا۔ اس لیے آپ زمانہ کے لیے جو مضامین بھیجتے ہمیشہ اپنے اخبار کے کاتب سے صاف کرا کر بھیجتے تھے۔ اور قریب قریب ہر خط میں یہ لکھکر حوصلہ افزائی فرماتے تھے۔ کہ "میں آپ کی محنت کو قدر کی نگاہ سے دیکھتا ہوں"۔ خدا کرے آپ اردو داں اصحاب کے لیے فروعات سے پاک، ایک اعلیٰ درجہ کا میگزین بہم پہونچانے میں کامیاب ہوں۔"

زمانہ کو سوامی رام تیرتھ جی مہاراج کے کئی خاص مضامین شایع کرنیکا اعزاز ورما صاحب ہی کے توسط سے نصیب ہوا تھا۔ ورما صاحب کو رسالہ سے سچی محبت تھی اور وہ دل سے اسکی ترقی چاہتے تھے، چنانچہ اکثر خطوط میں کفایت شعاری کی تلقین فرمایا کرتے تھے۔ گو اسوقت اس مشورہ پر عمل نہ ہو سکا۔ لیکن زندگی کے تلخ تجربات کے بعد کون کہہ سکتا ہے کہ یہ مشورے فضول تھے۔ ہمارے صوبہ کے نامور سوشل ریفارمر رائے بہادر لالہ بیجناتھ صاحب جنہوں نے بھی اصلاح تمدن کے متعلق کئی قابل قدر مضامین زمانہ کے لیے تحریر فرمائے جنکا سلسلہ ایڈیٹر صاحب کی آخر عمر تک قائم رہا۔ آپنے عمر بھی اچھی پائی لیکن سوامی جی کو زیادہ مہلت نہ ملی۔ اُن کی بیوقت وفات سے جہاں ملک کے روحانی مفاد کو زبردست صدمہ پہونچا وہاں زمانہ کا بھی نقصان عظیم ہوا سوامی جی کو بھی اس پرچہ سے خاص محبت ہوگئی تھی۔ چنانچہ سنہ ۱۹۰۵ء کے زمانہ کی رسید دیتے ہوئے آپنے حوصلہ افزائی کے راہ سے لکھا کہ مہاراج آپکا مہربانی نامہ اور زمانہ ملا۔ یہ میگزین حقیقت میں ہر ایک پہلو سے بہت عمدہ ہے۔ اور ضرورت زمانہ کو بہت کچھ پورا کرتا ہے۔ قصہ پڑے دلوں میں رام کے قلم سے بھی ایک مضمون آپ تک پہونچ رہیگا۔ اوم آنند

آپکا رام

اسکے بعد سوامی جی کے کئی بیش بہا مضامین زمانہ میں شایع ہوئے اور ملک میں ان کی خوب قدر ہوئی۔ ان مضامین میں سوامی جی نے واقعی روحانیت کا دریا بہا دیا ہے۔ مولنا شرر مرحوم نے انکے متعلق ایک مفصل نوٹ اپنے رسالہ دلگداز میں شایع فرمایا تھا۔ جب اس کا شکریہ ادا کیا گیا تو آپنے ایک نجی خط میں لکھا کہ "واقعی ان مضامین کی پوری تعریف نہیں ہو سکتی ہے۔ میں دلگداز میں جو کچھ لکھ سکا وہ اس سے بہت زیادہ کے مستحق ہیں۔"

سوامی جی مہاراج آخر دم تک زمانہ کی قلمی سرپرستی فرماتے رہے۔ چنانچہ یہ امر واقعہ ہے کہ آخری فیض جو دنیا کو

انکی ذات قدسی صفات سے پہونچا زمانہ ہی کی معرفت پہونچا۔ مضمون "خود مستی یا مسک عروج" جو زمانہ مئی ۱۹۰۸ء میں شائع ہوا۔ آپ کے مقدس زندگی کا آخری کام تھا۔ اسکے ختم ہوتے ہی آپ کو پیغام وصل آپہونچا۔

مولانا شرر مرحوم زمانہ کے لیے زیادہ نہ لکھ سکے تاہم آپنے دو ایک خاص مضامین عطا فرماکر رسالہ کو مرہون منت فرمایا ہے۔ اسی طرح مولانا شبلی نے بھی ۱۹۱۱ء و ۱۹۱۴ء میں کئی غزلیں اور ایک خاص نظم عطا فرماکر اپنی قدردانی کا ثبوت دیا۔ اسکے ساتھ ہی آپ نجی ملاقاتوں اور خطوط میں بھی اکثر زمانہ کی حوصلہ افزائی فرمایا کرتے تھے۔ چنانچہ ابتدائی زمانہ کے ایک خط میں لکھا کہ "زمانہ کا نیا پرچہ سابق سے بھی بڑھا ہوا ہے۔ بے شبہ وہ ہونہار ہے۔۔۔۔۔"

مضامین کے تقاضے کا جواب آپ نے ایک بار لطیفہ کی صورت میں دیا۔ ملاحظہ ہو۔

"مکرمی۔ مشہور ہے کہ متھرا میں ایک چوبے جی کو صرفی لڈو کی شرح سے کسی نے بہت سے لڈو کھلا دیئے۔ یہانتک کہ پیٹ تن گیا۔ اور سانس اندر سما نہیں سکتا تھا۔ وہ زمین پر پڑے کروٹیں بدل رہے تھے۔ کہ کوئی دید صاحب آگئے۔ اُنھوں نے ایک دوا دی کہ اسکو کھا لیجئے تو کھانا ہضم ہو جائیگا۔ چوبے جی نے کہا مہراج! پیٹ میں اتنی جگہ ہوتی تو میں اس قدر لڈو ہی کیوں نہ کھاتا۔ بعینہ یہی میرا حال ہے۔ اتنی فرصت ہوتی تو الندوہ میں ہی کیوں نہ لکھتا۔۔۔۔ مخزن اور اُردوئے معلی میں مدت ہوئی جو کچھ چھپا وہ ایک زیر تالیف کتاب کی عبارت تھی۔ شبلی۔ لکھنؤ۔ ندوہ۔ ۵ جولائی ۱۹۰۸ء

لیکن اسکے بعد جیسا اوپر ذکر ہو چکا ہے زمانہ آپکے کلام سے محروم نہیں رہا۔

شمس العلما مولانا حالی مرحوم و مغفور نے بھی سرسید کی لائف پر ایک مضمون زمانہ میں اشاعت کے لیے مرحمت فرمایا تھا۔ لیکن زمانہ کی اس سے کہیں زیادہ خاطر آپ کو مدنظر رہتی تھی۔ جیسا کہ آپ کے نوازش نامہ مورخہ ۸ اپریل ۱۹۰۸ء کے اقتباس ذیل سے واضح ہوگا:۔

"۔۔۔۔ جو لکچر سرسید مرحوم کے برسی کے موقعہ پر دیا گیا تھا وہ انکی لائف (موسومہ بہ حیات جاوید) کا خلاصہ ہے مگر بالکل نامکمل اور ادھورا۔ میں آج اتوار کے سیب اسکو روانہ نہیں کر سکا۔ انشاء اللہ کل ضرور روانہ کردونگا۔۔۔۔۔ میرے دوست مولوی عبدالحق صاحب نے اکبر کی برسی کے موقعہ پر اسکی لائف اور اسکی پالیسی پر لکچر دیا تھا۔ میں خیال کرتا ہوں کہ اب تک اکبر پر کسی صاحب نے ایسا عمدہ مضمون نہیں لکھا میں نے سکریٹری انجمن سے زمانہ کے لیے اسکو مانگ لیا ہے وہ بھی عنقریب ہی آپ کی خدمت میں بھیجدونگا۔"

آخر یہ قابل قدر مضمون مولانا حالی کی عنایت و توجہ سے زمانہ کے قومی نمبر ۱۹۰۶ء میں جو شہنشاہ اکبر اعظم کی صد سالہ برسی کے یادگار میں شایع ہوا تھا ہدیۂ ناظرین ہوا۔

زمانہ پر مولانا حالی کی مزید عنایات کا حال معلوم کرتا ہو تو ذیل کی سطریں ملاحظہ فرمائیے جو ایک اور خط سے ماخوذ ہیں فرماتے ہیں:-

"زمانہ کو میں دل سے پسند کرتا ہوں اور اسکو اُن مستثنےٰ رسالوں میں شمار کرتا ہوں جو اردو لٹریچر کو نا شایستگی کے خس و خاشاک سے پاک کر رہے ہیں - میری آرزو دلی ہے کہ زمانہ نہ صرف اشاعت میں بلکہ شایستگی و تہذیب میں بھی روز افزوں ترقی کرے، اور جو صلح کل مسلک اسنے اختیار کیا ہے اس سے سر مو تجاوز نہ کرے"

زمانہ کی خوش نصیبی سے تمام بزرگانِ قوم و رہنمایانِ ملک کی امداد شامل حال رہی ہے -

آنریبل پنڈت بشمبھر ناتھ صاحب مرحوم - حضرت شوق، جناب شہری، جناب شاد عظیم آبادی وغیرہ بزرگوں نے بھی قابل قدر مضامین سے زمانہ کی امداد فرمائی ہے - حضرت شوق نے ایک مفصل تنقید اس پر لکھ کر بھیجی تھی - جس میں زمانہ کی حوصلہ افزا الفاظ میں تعریف کی گئی تھی - لیکن جب ایڈیٹر کو اس کے چھاپنے میں پس و پیش ہوا تو صاحب مرحوم نے اُسے کسی دوسرے رسالہ میں شائع کرا دیا - اپنے کمال محبت سے آپنے کئی بہترین نظمیں ہدیہ ناظرین رسالہ فرمائیں - جناب شہری نے بھی اکثر مضامین سے رسالہ کی قدر افزائی فرمائی - پنڈت بشمبھر ناتھ صاحب کے بھی کئی عالمانہ مضامین زیب رسالہ ہو چکے ہیں - آپکا ادبی ذوق آخر عمر تک قائم رہا، اور زمانہ و کشمیر درپن دونوں کے لیے آپنے خوب خوب مضامین تحریر فرمائے - جناب شاد عظیم آبادی نے بھی اپنے علمی احسانات سے مرہون منت فرمایا - جب کبھی آپ سے کلام کا تقاضا کیا گیا تو آپ نے اپنے الطاف بزرگانہ سے محروم نہیں رکھا - چنانچہ آپ کے کئی اہم مضامین نثر اور کئی بلند پایہ نظمیں زیب رسالہ ہو چکی ہیں - اب وہ موجود نہیں ہیں لیکن انکے کلام کا دفتر موجود اور اشاعت کا منتظر ہے، افسوس کا مقام ہے کہ قدردانان اردو آج تک ان جواہر پاروں کے اشاعت کا کوئی انتظام نہ کر سکے - شاد مرحوم زندگی میں اکثر اپنے مجموعہ کلام کے اشاعت سے مایوسی کا اظہار فرمایا کرتے تھے - چنانچہ ایک نوازش نامے کا ایک حصہ یہاں پر نقل کیا جاتا ہے:

"..... خدا جانے کتنی محنتیں کر کے غزلوں اور دوسرے منظومات اور مرثیوں کا ایک دفتر کیا، ان کے علاوہ اور اور متفرق تصنیفوں عروض و قوافی و معنی و بیان و نصاب تعلیم کے چھوٹے بڑے کتنے ہی رسالے لکھے - اب ان چیزوں کے ڈھیر کو دیکھ کر خود دم گھبراتا ہے - یقین جانئے ادھر میرا دم نکلا اور یہ کل "عمر بھر کا ریاض مٹی میں مل گیا....."

خدا کرے آنکا یہ خوف درست ثابت نہ ہو اور ہم اپنے اہل کمال کی قدردانی کر سکیں اور انکی تبرکات ضایع نہ ہونے پائیں،

ناظرین زمانہ عرصہ تک شمس العلماء خان بہادر منشی ذکاء اللہ صاحب و شمس العلماء مولوی نذیر احمد صاحب دہلوی سے بھی مستفید ہو چکے ہیں - دونوں بزرگوں نے عرصہ تک اس رسالہ کی قلمی اعانت فرمائی - مولوی ذکاء اللہ صاحب نے جولائی ۱۹۰۵ء میں

یہ تحریر فرمایا تھا کہ "اس پیرانہ سالی میں جسقدر اعانت مجھ سے زمانہ کی ہو سکے گی دنگا اس مدد کو آخر دم تک اُٹھوں نے پورا کر کے دکھا دیا۔ لطف یہ کہ پولیٹکل نقطۂ خیال سے آپ کو زمانہ اور اسکے ایڈیٹر سے اکثر اختلاف رائے رہتا تھا۔ چنانچہ اگست ۱۹۰۸ء کے ایک خط سے جسمیں آپ نے تحریر فرمایا کہ "پولیٹکل مضامین تو بہت سے لکھے ہوئے رکھے ہیں مگر وہ سب آپکے زمانہ کی پولیسی (POLICY) کے خلاف ہیں"۔ اس اختلاف کا بخوبی پتہ چلتا ہے۔ تاہم اسکے بعد آپنے زمانہ کے لئے متعدد مضامین لکھے۔ آپ کی وضعداری کی کیا تعریف کی جائے۔ فرشتہ خصلت مسٹر اینڈرز بورز آپ کے اخلاق حمیدہ کا اعتراف فرما چکے ہیں۔ آپنے اردو مصنفین کے لیے جسقدر تاریخی مسالہ فراہم کر دیا ہے وہ آپ ہی کا حصہ تھا۔ آپ کی وقت کی پابندی ضرب المثل تھی۔ ہر کام نہایت قاعدہ اور قرینہ سے کرنے کے عادی تھے۔ پابندی وقت ہی کی بدولت آپ نے ہزارہا صفحوں کی کتابیں لکھ ڈالیں۔ دوسروں کا جسقدر آپ کو خیال رہتا تھا اس سے زیادہ کم لوگوں کو رہتا ہوگا۔ حتیٰ کہ جزئیات پر بھی آپ کی نگاہ رہتی تھی ایک دفعہ آپ نے زمانہ بھیجنے کی ممانعت کی اور لکھا کہ آپ ناحق اپنا پرچہ کیوں بھیجتے ہیں۔ میں پبلک لائبریری میں اسکو دیکھ ہی لیتا ہوں" ونیکے نشیب فراز سے بخوبی واقف تھے اور سرد گرم زمانہ دیکھ چکے تھے۔ ملک کی قدردانی کا حال بھی آپ سے پوشیدہ نہ تھا۔ چنانچہ ترقی اردو کی کوشش کی کامیابی سے قطعی مایوس تھے اسی وجہ سے جب آپ نے سنا کہ ایڈیٹر زمانہ سے وکالت کا امتحان پاس کرنے کے لیے اصرار کیا جا رہا ہے تو آپ نے بھی ایک کارڈ لکھا کہ "مجھے اس بات سے بڑی خوشی ہوئی کہ آپ وکالت میں امتحان دینگے۔ خدا آپ کو کامیاب کرے، آپ قانونی عزت حاصل کرنے میں سعی کیجئے....."

مولوی نذیر احمد صاحب کے قلمی احسانات کی ابتدا یہ ہے کہ ۱۹۰۹ء میں آپ نے انجمن حمایت اسلام لاہور کے لیے ایک عالمانہ لکچر تیار کیا تھا لیکن باہمی مخالفت کے باعث اس سال انجمن کا اجلاس برہم ہو گیا تھا جس سے مولوی صاحب اپنے لکچر کا ایک لفظ بھی انجمن میں نہ پڑھ سکے، چنانچہ آپ نے ازراہ محبت اسے یہ لکھ کر بھیجدیا کہ "آپ اسے زمانہ کے صفحوں میں جگہ دیجئے اور دفعتہً یا ٹکڑے ٹکڑے جیسا آپ مناسب سمجھیں شایع کیجئے"۔ مگر اس سے ناظرین کہیں یہ نہ سمجھ لیں کہ مولوی نذیر احمد صاحب کے مضامین آسانی سے ملجاتے تھے۔ درحقیقت مولوی صاحب بڑے نازک مزاج واقع ہوئے تھے، چنانچہ ایک نغمہ کا ذکر سُنئے تقسیم بنگالہ کے ایجی ٹیشن کے سلسلہ میں سودیشی تحریک کا زور شور تھا۔ اور زمانہ میں بھی اسکے متعلق اکثر مضامین شایع ہوئے تھے، اسی سلسلے میں ایڈیٹر زمانہ نے اس مسئلہ کے متعلق اکثر بزرگان ملک سے استصواب رائے کیا تھا، مولوی صاحب کو اظہار رائے کی تکلیف دی گئی۔ اور جواب کے لیے ایک ٹکٹ دار لفافہ بھی انکے خط میں رکھدیا۔ مگر آپنے اسے پسند نہیں فرمایا اور فوراً ہی یہ لکھ بھیجا، کہ "اب تو آپ کھینچ تان کر مجھکو کارسپانڈنٹی کے رستے پر ڈال چلے، جو میری عادت اور میرے مزاج کے خلاف ہے۔ رسالوں اور اخباروں کی کارسپانڈنٹی وہ کرتا ہے، جس بدنصیب کو شہرۃ کا دوسرا ذریعہ میسر نہیں۔ شکر ہے خدا نے مجھکو اس بے حرمتی سے بچایا ہے....."

ہرحال اس مبحث پر آپ نے کچھ نہیں تحریر فرمایا اگو اس سے پہلے اور اسکے بعد بھی زمانہ کو کئی قیمتی مضامین عطا فرمائے ہیں ہے، بزرگوں کا مزاج تولہ ماشہ ہوتا ہے۔ کبھی ذرا سی بات میں خوش ہو جاتے ہیں اور کبھی ناخوش لیکن انکی ناخوشی دیرپا نہیں ہوتی۔ چنانچہ مولوی نذیر احمد صاحب بھی اپنے سے کم عمر والوں سے ہمیشہ مراعات ہی سے پیش آتے تھے۔ مگر اب یہ باتیں خواب وخیال ہوگئیں۔ زمانہ کی پرانی جلدیں دیکھ کر یہی خیال رہ رہ کر آرہا ہے کہ پچیس سال پہلے ملک میں کیسے کیسے پرُاتم انشاپرداز موجود تھے جو اس اثنار میں ہماری نظروں سے ہمیشہ کے لیے پنہاں ہوگئے۔ رائے بہادر لالہ بنا رسی داس صاحب بھی جنکی نسبت اکبر مرحوم کیا خوب فرماگئے ہیں۔ کہ "در انکے فیض کا کبھی ہوتا نہیں تھا بند" زمانہ کے قلمی معاون تھے۔ نواب وقار الملک صاحب بہادر نے بھی زمانہ کے لیے ایک خاص مضمون لکھا تھا۔ لیکن جس محب وطن کے سلسلہ میں یہ مضمون حوالہ قلم ہوا تھا۔ اسکے احسانات کا ہم کیا شکریہ ادا کرسکتے ہیں۔ نواب صاحب موصوف نے مولوی عزیز احمد صاحب مرحوم ہوم ممبر سرکار نظام کے متعلق ایک مفصل مضمون تحریر فرمایا تھا عزیز مرزا صاحب کے بہت سے مضامین زمانہ میں شائع ہو چکے ہیں آپکا ہر مضمون ناظرین کے لیے ایک درجہ کی علمی مضافت ہوتا تھا جس خلوص اور محبت سے مولوی عزیز مرزا صاحب اس سلسلے کیلئے مضامین لکھا کرتے تھے اسکی یاد دل سے کبھی فراموش نہیں ہوسکتی۔ آپ کی محبت قدردانی کا ایک مزید ثبوت یہ ہے کہ آپ نے کتابی صورت میں بھی اپنے بلند پایہ مضامین کے مجموعہ کی اشاعت کا حق ایڈیٹر زمانہ ہی کو عنایت فرمایا ہے۔ آپ کی علمی ہمدردی اور علمی قدردانی کی کیفیت ایک اور واقعہ سے بھی معلوم ہوگی۔ آپ نے ایک دفعہ رسالہ کی مالی مشکلات کا حال سُنا تو بلا کسی تحریک کے ازخود رسالہ کی توسیع اشاعت کی عملی کوشش کی اور حیدرآباد میں زمانہ کے نئے کے قریب خریدار بنا دیے اور ان سے رسالہ کی سالانہ قیمت وصول فرماکر دفتر میں روانہ کردی۔

اسی طرح ہمارے دوست کرنیل بھولا ناتھ صاحب اور رائے بشمبھر ناتھ صاحب رئیس کانپور نے ایک دفعہ رسالہ کی امداد فرمائی تھی۔ ورنہ ۱۹۰۱ء کے بعد سے بارہ سال مسلسل ہزار ہا روپیہ کا نقصان یکہ و تنہا ایڈیٹر رسالہ ہی کو برداشت کرنا پڑا ہے۔ ع "جی جانتا ہے اُسکا جو کوئی وفا کرے"

بہرحال مولوی عزیز مرزا صاحب کی ذات گرامی سے زمانہ کی بڑی بڑی اُمیدیں وابستہ تھیں، مگر آپ کی بیوقت وفات نے ان اُمیدوں پر پانی پھیر دیا۔ ملک کی انتہائی بدقسمتی ہے کہ ہمارے محبان وطن اس قدر جلد داغ مفارقت دے جاتے ہیں۔ مولوی عزیز مرزا کی زندگی کچھ اور وفا کرتی تو اردو ادب کے لیے وہ بہت کچھ کر جاتے۔ لیکن مشیت ایزدی میں کیا چارہ ہے،

منشی کندن لال شرر سہارنپوری رائے پربھو لال حیدرآبادی۔ سرور جہان آبادی۔ منشی نوبت رائے نظر لکھنوی۔ اور پنڈت برج نرائن چکبست لکھنوی کی وفات بھی بہت بموقعہ ہوئی۔ ان حادثات سے نہ صرف زمانہ ہی کو

بلکہ اردو ادب کو بہ حیثیت مجموعی ناقابل تلافی نقصان پہونچا ہے۔ شرر صاحب کی بہترین نظمیں زمانہ کی پرانی جلدوں میں محفوظ ہیں انکو دیکھکر آج بھی انکی الکلامی کی داد دینا پڑتی ہے۔ آپ کی موجودگی میں جب کبھی ہندو تہاس کے متعلق کوئی تصویر رسالہ میں شائع ہوتی تو آپ ہی سے اس پر نظم لکھنے کی فرمائش کیجاتی تھی آپ بھی ہمیشہ ہماری درخواست کو بخوشی قبول فرماتے تھے۔ اس دوستانہ نوازش کی کیا تعریف ہوسکتی ہے۔ آپ نے تمام زندگی کبھی ہماری درخواست کو رد نہیں کیا۔ اب بھی آپ کی بعض بعض نظمیں پڑھکر بے اختیار یاد آتی ہے۔ اب بھی بزم زمانہ میں آپ کی جگہ خالی ہے۔ اب بھی آپ کی قوم آپکا ماتم کر رہی ہے۔ آج آپ ہمارے درمیان نہیں ہیں لیکن آپ کا دلکش کلام ہمارے دلوں کو مسرور کرنے کو اب بھی باقی ہے۔ اور جلد یا دیر کبھی نہ کبھی کتابی صورت میں شایع ہوگا اور جہ عناصر سے لیکر اہم سے اہم عنوانوں پر آپنے نہایت شگفتہ نظمیں لکھی ہیں جنکی بدولت آپ کا نام عرصہ تک یادگار زمانہ رہیگا۔

پربھولال صاحب کی مذہبی مضامین اور فلسفانہ تحریرین آپ ہی اپنی جواب ہوتی تھیں۔ مشہور مرہٹہ لیڈر شیواجی پر جس تحقیق و تفتیش سے آپنے ایک طولانی سلسلۂ مضمون لکھا تھا۔ اسکی داد دینے کے لیے ہمارے پاس الفاظ نہیں ہیں۔ گیتا کے فلسفہ کو جس عام فہم پیرایہ میں آپ نے ناظرین زمانہ کے ذہن نشین فرمایا، اسکی تعریف نہیں کی جاسکتی، بہرحال بڑے بڑے اہم مسائل ویدانت کے متعلق آپ نے ناظرین زمانہ کے لیے ایسے مشرح اور مفصل مضامین تحریر فرمائے کہ ایک معمولی اردو خوان شخص بھی ان سے بخوبی فائدہ اٹھا سکتا ہے۔ مگر اب یہ سب باتیں روایتوں میں داخل ہوگئیں۔ اسی طرح جب سرور جہان آبادی لکھنوی اور چکبست مرحوم کی یاد آتی ہے تو دل میں ایک درد سا پیدا ہونے لگتا ہے آہ اب یہ صورتیں کہاں دیکھنے کو نصیب ہونگی۔ سرور جہان آبادی صرف ستیس ۳۵ برس کی عمر میں ہم سے جدا ہوگئے۔ چکبست نے چوالیس سال کی عمر میں وفات پائی۔ نوبت رائے صاحب نے ۵۷ برس کی عمر میں انتقال فرمایا۔ لیکن چند سال کے علاوہ فارغ البالی کی زندگی بسر نہ کرسکے۔ اردو شاعری آج بھی ان تینوں باکمالوں کا ماتم کر رہی ہے۔ تینوں حضرات زمانہ کے مسند نشینوں میں تھے۔ زمانے کو بھی ان تینوں صاحبوں پر ہمیشہ فخر و ناز ہوگا اور انکی یاد کبھی دلوں سے محو نہیں ہوسکتی۔ درحقیقت انکی سخنوری کے چرچے اسوقت تک باقی رہینگے جب تک اردو زبان کے نام لیوا دنیا میں موجود ہیں۔ چکبست صاحب زمانہ کے اجراء کے چند ہی ماہ بعد سے زمانہ میں اپنی نظمیں عطا فرمانے لگے۔ اور یہ سلسلہ انکی زندگی بھر قائم رہا ہے۔ فروری ۱۹۲۶ء میں وہ ہم سے جدا ہوئے اور نومبر ۲۵ء کے پرچے میں انکی آخری نظم شائع ہوئی ہے موجودہ ایڈیٹر زمانہ کی ادارت میں بہلا پرچہ نومبر ۱۹۰۳ء میں شائع ہوا ہے۔ چنانچہ اسی نمبر سے چکبست صاحب کی نظموں کی اشاعت شروع ہوئی۔ اس پرچہ میں جسٹس رانا ڈے کا نوحہ وفات شائع ہوا۔ اور اسکے بعد بیسیوں مضامین اور بیسیوں نظمیں مرحوم نے زمانہ کی خاطر لکھیں۔ مضامین نثر میں سرشار۔ اور داغ دہلوی پر دو خاص مضامین ایسے لکھے کہ اُن موضوع پر ان سے

بہتر مضامین آجتک اردو میں نہیں لکھے گئے۔ چکبست جس طرح نظم میں انیس کے مقلد تھے۔ اسی طرح نثر میں اُنھوں نے صاحب آبحیات کے طرز تحریر کا تتبع کیا۔ دونوں میں انکو غیر معمولی کامیابی حاصل ہوئی۔ چنانچہ جسطرح انکی نظمیں پرجوش اور برجستہ ہوتی تھیں اُسی طرح نثر بھی نہایت شگفتہ اور پُرزور رکھتے تھے۔ انکے شستہ مضامین انکے مذہبی خیالات انکی فکر رسا کے نمونے دیکھکر دوست دشمن سب کو انکی قادرالکلامی کا اعتراف کرنا پڑیگا۔ چکبست کے کلام نے انکے نام کو زندہ جاوید بنا دیا ہے، ہماری آیندہ نسلیں شوق سے پڑھیں گی اور انکے کمال فن کی داد دینگی۔

سرور جہان آبادی کی نظمیں دل میں جذبات کا تلاطم برپا کردیتی ہیں۔ انکی شاعری میں ایک بحر ناپیدا کنار کی سی روانی ہے۔ انکی طبیعت سمندر کی طرح گہری۔ انکا خیال سر فلک پہاڑوں کی چوٹیوں کی طرح بلند تھا شعر کہنے بیٹھتے تو کاغذ پر اپنے جگر کے ٹکڑے نکالکر رکھدیتے تھے۔ جو سوز و گداز ہمکو سرور کے کلام میں ملتا ہے، اسے کسی دوسرے شاعر میں ڈھونڈھنا فضول ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ قدرت نے انھیں شاعری ہی کے لیے بنایا تھا، اور شاعری کے سوا انھیں کچھ اور آتا بھی نہیں تھا، بہرحال انکی سچی شیدین انکے نئے استعارے، عمیق جذبات۔ حسن و عشق کی معاملہ بندیاں، دلوں میں چٹکیاں لیتی ہیں۔ سرور کی مختلف نظمیں دیکھ کر یہی معلوم ہوتا ہے کہ انکا کمال فن روز افزوں ترقی کر رہا تھا اور وہ اپنے معراج شاعری تک پہونچنے سے پہلے ہی ہم سے چھین لئے گئے۔ اگر یہ باکمال شاعر صرف دس برس بھی اور زندہ رہ سکتا تو اردو شاعری کی حالت کیا سے کیا ہوگئی ہوتی۔ کمبخت شراب کا بُرا ہو جس نے عنفوان شباب ہی میں اس یکتائے زمانہ شاعر کے پیمانۂ عمر کو لبریز کردیا۔ سرور کو زمانہ اور ایڈیٹر زمانہ سے کیسی سچی محبت تھی۔ روپے کی انھیں پروا نہ تھی۔ پابندی سے کام کرنیکے لایق نہ تھے۔ علایق کی فکر سے بالکل آزاد ہو ہی چکے تھے، جسکی وجہ سے معاش کی چنداں فکر نہ تھی، مگر اپنی محبت سے سالہا سال انکا یہ ورد رہا کہ مہینوں آکر دفتر زمانہ میں قیام فرماتے۔ شروع میں چند ماہ دفتر میں باقاعدہ کام کرنے کی کوشش بھی کی لیکن مزاج کی وارفتگی سے عرصہ تک یہ پابندی نبھ نہ سکی۔ لیکن اس سلسلے میں جو مناسبت باہمی قائم ہوگیا وہ آخردم تک بڑھتا ہی رہا اور سرور کبھی زمانہ اور اسکے ایڈیٹر سے بے تعلق و بے پرواہ نہ رہ سکے۔ اگر کبھی کسی وجہ سے خط و کتابت میں ذرا سی بھی غفلت ہوئی تو سرور صاحب ایسا تقاضا شدید کرتے کہ شرمندگی کے سوا اور کچھ ہاتھ نہ لگتا تھا۔ انھیں موقعوں میں سے ایک موقعہ پر ذیل کی پُرلطف نظم ہاتھ لگی:-

بھیجا نہ کوئی پرچہ لکھکر زراہِ شفقت — اگلی سی کیا نہیں وہ مجھ پر نگاہِ شفقت
کہنا مرے مکرم سے اے نسیم جاکر — دیوار خاموشی ہے کیوں سدّراہِ شفقت
شرمندۂ کرم ہے اب تک غلام دیریں — اگلی نوازشیں ہیں اب تک گواہِ شفقت

تم وہ، تمہاری شفقت خو کردۂ تغافل — میں وہ، مجھے تغافل پر اشتباہِ شفقت
آنکھیں بچھائے بیٹھا ہوں کوئے آرزو میں — چشم کرم ادھر بھی صاحب! ذرا ہِ شفقت
تم کو قسم ہے میری حسرتاں نصیبوں کی
میں کب سے منتظر ہوں مجھ پر نگاہِ شفقت!

اس قسم کی شعر و شاعری کا روزانہ سلسلہ رہتا تھا۔ نظموں کی فرمائشوں پر فرمائشیں ہوا کرتیں کبھی انگریزی نظموں میں نشان کرکے انکے ترجموں کی درخواست ہوتی۔ کبھی نثر کے خاکے تیار کرکے پیش کیے جاتے۔ بہرحال یہی چرچا رہتا۔ اور سرور صاحب اپنے خوش اخلاقی، نیک نفسی اور قادر الکلامی سے ہمیشہ ممنون و مرہون فرمایا کرتے تھے۔ لیکن فلک ناہنجار اس لطف صحبت کو دیکھ نہ سکا۔ سرور صاحب کی سب سے بڑی کمزوری انکی شراب خواری تھی۔ پے در پے خانگی حادثات کی بدولت وہ اپنا غم غلط کرنیکے خیال سے اس میں مبتلا ہو گئے اور تمام احباب کی مسلسل کوششوں کے باوجود اسمیں اعتدال قائم نہ رکھ سکے۔ موصوف کی یہ پہلی اور آخری کمزوری تھی ورنہ کسی حیثیت سے انکے اخلاق کے متعلق کوئی شخص آدمی بات بھی نہیں کہہ سکتا ہے۔ سرور صاحب کی نیک نفسی کا اس سے زیادہ اور کیا ثبوت ہو سکتا ہے کہ جو لوگ تمام عمر نائب رہ چکے ہیں انکو بھی سرور کے خاطر مدارات میں عذر نہ ہوتا تھا۔ بات یہ تھی۔ کہ سرور بھی اسکے بغیر نہیں رہ سکتے لیکن آخر اسی کمبخت شراب ہی نے انکی جان بھی لی۔

منشی نوبت رائے نظر لکھنوی بھی کئی سال تک زینت افزائے بزم زمانہ رہے ہیں ۱۹۰۵ء میں رسالہ کا مقام اشاعت بریلی سے کانپور میں تبدیل ہو گیا۔ یہاں طباعت وغیرہ کے انتظام کے لیے ایک معتمد کی ضرورت پڑی۔ چنانچہ نظر صاحب ہی پر پڑی۔ آپ کا مشہور رسالہ خدنگ نظر مالی مشکلات کی وجہ سے بند ہو چکا تھا۔ گرد لیں ادبی خدمت کا ذوق تھا۔ اس لیے نظر صاحب نے بھی اس خدمت کو دوسرے کاموں پر ترجیح دی۔ بہرحال کئی سال تک وہ مینیجری کے فرائض ادا کرتے رہے۔ وہ خود بھی اچھے مصور اور خوشنویس تھے اور کتابت و طباعت دونوں سے بہ حیثیت فن بخوبی واقف تھے۔ اہتمام کے علاوہ حصۂ نظم کی ترتیب کا کام بھی آپ کے ذمہ تھا۔ زمانۂ قیام کانپور میں آپ نے رسالہ کے لیے کئی خاص مضامین بھی لکھے۔ جنکو پڑھکر آج بھی آپ کی قابلیت کا قائل ہونا پڑتا ہے۔ نظر صاحب کا ادبی مذاق نہایت سنجیدہ واقع ہوا تھا۔ انکی طبیعت غیور۔ مزاج نفاست پسند اور خودداری لیے ہوئے تھا۔ غضب کے طباع اور ذہین تھے، گو انگریزی میں اسکول کا معمولی کورس بھی ختم نہ کیا تھا لیکن دقیق سے دقیق مضامین کا بخوبی ترجمہ کر لیتے تھے۔ آپ کی ذہانت کا یہ حال تھا کہ گو زمانہ میں آنے سے پہلے انہوں نے کبھی طرز جدید کی کوئی تنقید نہیں لکھی تھی لیکن چند ہی اشاروں اور مشوروں کے بعد آپ کو تنقید نگاری میں ملکہ حاصل ہو گیا۔ آپ کی پہلی تنقید "نقاد لکھنوی" کے نام سے جون ۱۹۰۵ء کے زمانہ میں مثنوی گلزار نسیم کے متعلق شائع ہوئی

تھی اسکے بعد آپ کی کڑ عالمانہ تنقیدیں شائع ہوتی رہیں۔ منیر شکوہ آبادی، رداغ دہلوی، رجب علی سرور، پر آپ کے مضامین آج بھی اپنا جواب نہیں رکھتے۔ زمانہ میں ایک سلسلۂ مضامین اردو رسالوں کے حصۂ نظم کی تنقید کا بھی شروع کیا گیا تھا۔ یہ بھی نظر صاحب ہی کا لکھا ہوتا تھا۔ وفات سے ماہ سوا ماہ قبل "خطوط اکبر" پر آپ نے ایک آزاد اور عالمانہ تنقید زمانہ میں لکھی تھی۔ جس سے آپکے بلند پایہ معیار کا بخوبی پتہ چلتا ہے۔ زمانہ میں چند سال رہ کر آپ انڈین پریس چلے گئے تھے جہاں سے اُردو کا مشہور رسالہ ادیب آپ کی ایڈیٹری میں جاری ہوا۔ ڈیڑھ سال بعد ۱۹۰۱ء میں ایک واقعہ کے سبب سے مستعفی ہو کر لکھنؤ واپس آگئے۔ اور بعد چندے پھر کانپور آکر زمانہ کے اسٹاف میں شامل ہوگئے۔ یہاں اندنوں ہفتہ وار آزاد کے اجرا کی تیاریاں ہو رہی تھیں، چنانچہ اس دفعہ آپ نے اخبار کا بھی کچھ کام اپنے ذمہ لیا۔ شروع شروع میں آپکو اس سے کسیقدر جھجک تھی۔ انھیں اسکا عملی تجربہ بھی نہ تھا۔ لیکن چند روز کام کرنیکے بعد آپ نے اسمیں بھی کافی مہارت پیدا کرلی۔ اور ایڈیٹوریل نوٹ وغیرہ لکھنے لگے۔ لیکن والدہ کی علالت و تنہائی کے خیال سے وہ اس مرتبہ زیادہ دنوں تک کانپور نہ رہ سکے۔ آخر احباب نے مطبع نولکشور لکھنؤ میں انکے لیے گنجائش نکال دی، جہاں آپ پہلے اخبار تفریح اور بعدہ اودھ اخبار کے ایڈیٹر ہوگئے۔ آپ کے وقت میں اودھ اخبار کی کایا پلٹ ہوگئی اور صوبہ کا قدیم ترین پرچہ بھی رفتار زمانہ سے متاثر نظر آنے لگا۔ لیکن اسکی اصلاح و ترتیب میں جو محنت شاقہ کرنا پڑی اسکا بار آپ کی طبیعت دیر تک اُٹھا نہ سکی۔ پے در پے جانکاہ حادثات نے طبیعت کو اور بھی نڈھال کر دیا تھا۔ پہلے اکلوتا جیتا نواسہ، پھر والدہ اور اسکے بعد اکلوتی لڑکی داغ مفارقت دیگئی۔ چند ہی دنوں بعد اودھ اخبار سے بھی قطع تعلق ہوگیا۔ جسکے بعد آپ کا اطمینان قلب ہی رخصت ہوگیا۔ آخر ۱۰ اپریل ۱۹۲۳ء کو آپ خود بھی دنیا سے رخصت ہوگئے۔ آپ کا مجموعہ کلام بہت مختصر ہے لیکن جو کچھ ہے، لوح دل پر نقش کرنے کے لائق ہے۔ انکی شاعری پر خواجہ آتش کا مقولہ صادق آتا ہے۔ انکا ایک ایک لفظ نگینہ کی طرح اپنی جگہ پر جڑا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ اپنے اشعار کے حرف حرف پر غور کامل فرمایا کرتے تھے۔ نظر ثانی سے کبھی انکا جی نہیں بھرتا تھا۔ جب دیکھئے کچھ نہ کچھ ردوبدل کر دیتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ زبان کی صفائی۔ بندشوں کی چستی، مذاق کی شستگی، اور فکر کی بلندی میں وہ اکثر معاصرین سے گوے سبقت لے گئے۔ نظر صاحب کلام میں ندرت، مضامین اور جدت بیان دونوں ملحوظ رکھتے تھے۔ انکا ہر شعر دقت نظری کا نمونہ ہوتا تھا۔ بھرتی کے اشعار سے انھیں دلی نفرت تھی۔ معمولی بات کو بھی نئے پیرایہ میں کہنے کی کوشش کرتے جس سے فصاحت و بلاغت کا انتہائی لطف انکے کلام میں پیدا ہوگیا ہے۔ کبھی کوئی پیش پا افتادہ مضمون آپ نے نظم ہی نہیں کیا۔ بلکہ ہمیشہ اس دھن میں رہتے تھے کہ جو بات کہیں اُسے سُنکر لوگ پھڑک اُٹھیں۔ افسوس نظر صاحب کو زندگی میں مالی اطمینان کبھی نصیب نہیں ہوا فارغ البالی میسر ہوتی تو شاید انکے کلام میں یہ سوز و گداز بھی نہ ہوتا، طبیعت میں خودداری کا مادہ کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا، اس سے اور بھی قباحت

ہوتی تھی۔ اسلیئے انکے کلام میں اکثر خوددارانہ یاس کی جھلک نمایاں ہے۔ آپ نے ایک دوست کو ایک قصیدہ کہکر دیا تھا جسمیں شکوۂ بخت کے سلسلے میں آپکا ایک شعر قابل اقتباس ہے فرماتے ہیں۔

بے بہا جنس کی صورت ہوں جہاں میں بیکار
بکنے بھی جاؤں تو اٹھتے نہیں بازار میں دام

اسی انداز کے دو ایک شعر ملاحظہ ہوں،

مے کو دنیا آتش سیال کہتی ہے مگر — لیکن اپنے جام میں آتے ہی پانی ہوگئی

مدت سے ڈھونڈھتا ہوں ملتا مگر نہیں ہے — وہ ایک سکون خاطر جو بیشتر نہیں ہے

اے انقلاب عالم تو بھی گواہ رہنا — کاٹی ہے عمر ہمنے پہلو بدل بدل کر

ناسوافق حالات کیوجہ سے انکی بعض نظمیں دوسروں کے حوالہ ہوگئیں، تاہم جسقدر مجموعہ کلام اُنھوں نے اپنے دیوان کے لیے باقی رکھا وہ بھی انکے نام کو عرصہ دراز تک روشن رکھنے کے لیے کافی ہے۔ سچ ہے۔

چشم و چراغ دہر تھا پوچھتے ہو نظر کو کیا — سرمہ ہے اُسکی خاک بھی دیدۂ روزگار میں

لکھنؤ کے دو اور شعرا جناب ابر و نادر کاکوروی بھی زمانہ کے خاص معاونین میں تھے۔ لیکن انکا شمار بھی مرحومین میں ہے۔ پنڈت بشن نراین صاحب ابر اردو کے اچھے شاعر انگریزی کے بلند پایہ ادیب نامور نقاد سخن اور ملک کے مشہور رہنما تھے۔ یوں تو شروع ہی سے آپ زمانہ کے سرپرست رہے لیکن جب آپ بسلسلۂ علالت الموڑہ تشریف لے گئے تو آپ کی ملاقات ایڈیٹر زمانہ کے ایک پرانے دوست اور قریبی عزیز ڈاکٹر مادھوسرن صاحب نگم (مرحوم) سے ہوگئی جو خود بھی اُسی مراد مرض میں مبتلا تھے جس کے پنڈت صاحب عرصہ سے شکار رہے۔ فرشتہ خصلت مادھوسرن نے شروع ہی سے زمانہ کی اعانت و امداد کو اپنا فرض سمجھ رکھا تھا۔ چنانچہ جب الموڑہ میں انکا اور پنڈت صاحب کا ارتباط بڑھا تو اُنھوں نے زمانہ کے لیے پنڈت صاحب سے ایک اچھا خاصہ دیوان حاصل کرلیا۔ ابر صاحب نے اس مجموعہ کی سب غزلیں عزیزی مادھوسرن جی کے تفنن طبع کے لیے کہی تھیں، اور اپنے انھیں اختیار کامل دیدیا تھا کہ جو چاہیں کریں۔ چنانچہ یہ مجموعہ ان دونوں اصحاب کی باہمی محبت کی یادگار آج بھی ہمارے پاس محفوظ ہے، اسکی غزلیں مختلف موقعوں پر مادھوسرن جی مرحوم نے خود اپنے قلم سے نہایت خوشخط لکھی ہیں۔ جناب ابر نے اسکی نظر ثانی کردی ہے۔ جس کاپی پر یہ کلام نقل کیا گیا ہے وہ اسکول کی ایک معمولی اکسرسائز بک ہے جسمیں

نام کی جگہ ڈاکٹر مادھوسرن نے اپنا نام کلاس کی جگہ "مجبوری" اسکول کے نام کے سامنے "عالم فانی اور سبجکٹ کے خانے میں "دق" لکھا ہے۔ آج یہ دونوں محب عالم بالا میں ہیں لیکن انکی محبت کی نشانی ابتک اسی طرح محفوظ ہے اور شاید کسی وقت دنیا کے روبرو پیش کردی جائے۔ ورصاحب نے مادھوسرن جی کے وفات (۱۹۱۱ء) کے بعد زمانہ پر خاص نظرِ عنایت مبذول فرمائی۔ چنانچہ اس بیاض میں خاص خاص مقامات پر پنسل سے نشانات بنا کر بہت سے اشعار خود انتخاب فرمائے ہیں، اس غزل کے آخر میں جسکا پہلا شعر یہ ہے۔

دنیا میں درد کے لیے گر آفریدہ ہوں — یارب کسی یتیم کا اشکِ چکیدہ ہوں

آپ نے خود دفترِ زمانہ میں تشریف لاکر یہ دو اشعار پنسل سے اضافہ فرمادیے تھے۔

میں کیا خراب محفلِ رنداں میں ہونگا شیخ — ایماں کسی کا ہوں، نہ کسی کا عقیدہ ہوں

خاموشی کا اشارہ یہ ہے گوشِ عقل سے — مجھکو بھی سُن کہ میں سخن ناشنیدہ ہوں

یہاپر آپ کے چند اور اشعار بھی ناظرین پر بار نہ ہونگے۔

نہ ٹپکا آنکھ سے جو اشکِ غم لہو ہو کر — وہ میرے دل میں رہا خون آرزو ہو کر

کہیں آثار بربادی ہوں، یاں صدمہ گذرتا ہے — میں رُوتا ہوں اگر دیوار میں پانی بھی مرتا ہے

کسی میخانے میں یہ تفرقہ پردازی ہے، — خم سے شیشہ ہے جدا، شیشہ سے پیمانہ جدا

نظر آتے نہیں جو چشمِ بلبل کو بھی گلشن میں — نگاہِ شوق چن لیتی ہے ان پھولوں کو دامن میں

گھیرے ہیں آرزوئیں جبتک ہے جان تن میں — ہے شمع سے ہجوم پروانہ انجمن میں

میں ہوں رنگِ آئینہ آبیاں میں بُرا بھی یہ خیر کرے — نہ کدورتِ دل دشمناں نہ غبارِ خاطرِ یار ہوں

جن اصحاب نے پندرہ سال پیشتر زمانہ کے صفحات میں نادر کاکوروی کی بے نظیر نظمیں "مقدس سرزمین" اور "بہارستانِ ربیع" "مادرِ ہند" "دعوتِ گل" "متاعِ اُمید" "شمعِ اُمید" و نعتہ شاعری" وغیرہ ملاحظہ فرمائی ہیں انکے دلوں سے اس محبِ وطن شیریں بیان شاعر کی یاد آسانی سے محو نہیں ہوسکتی ہے۔ افسوس نادر کاکوروی صرف ۲۸ سال کی عمر

میں اکتوبر ۱۹۱۳ء میں داغ مفارقت دے گئے۔ انکے دل میں ملکی محبت کا شعلہ موجزن تھا۔ اردو شاعری میں اصلاح کے حامی تھے۔ اور طرز جدید میں خوب خوب نظمیں کہتے تھے۔ جو اردو کے مشہور پرچوں میں چھپ کر مقبول عام ہوتی تھیں۔ جب سے زمانہ کا سلسلہ جدید شروع ہوا۔ آپ اپنی بہترین نظمیں اسی رسالے کی نذر کرنے لگے۔ اکثر تصویروں کے متعلق آپ نے خاص نظمیں بھی کہکر اپنے زور طبع کا ثبوت دیا ہے۔ ایڈیٹر رسالہ کے ساتھ آپ کی محبت کا کیا ذکر کیا جائے ۱۹۱۲ء میں جب راقم الحروف کے برادر خورد مسٹر رام سرن نگم کی شادی ہوئی تو آپنے ایک مرصع سہرا لکھکر بھیجا تھا جس کی شاعرانہ خوبیوں کا لطف دل میں اب تک باقی ہے۔ چند شعر آپ بھی سنیئے۔ فرماتے ہیں،

ہے جلوۂ برق طور سہرا ہے ساحد صاف خور سہرا — ہے موج دریائے نور سہرا ہے جوش جام طہور سہرا
نسیم جنت کی چل گئی تھی اسکی اک موج ہو یہ پانی — بہار فردوس ہنس پڑی تھی اسی ہنسی کا ظہور سہرا
پری نے پیچھے سے راہ اندر کے سر پہ ڈالا ہی اپنا آنچل — جو یہ نہیں ہے تو میں کہونگا ہے طرۂ زلف حور سہرا
فلک پہ رحمت برس رہی ہے میں یہ گنگا اتر رہی ہے — ہے رحمتوں کا نزول سہرا ہے برکتوں کا نور سہرا

افسوس موت نے بہت جلد اس شاعر خبیر بیان کو بھی ہم سے چھین لیا۔ اردو شاعری کی بڑی بڑی امیدیں مرحوم کی ذات سے وابستہ تھیں۔

دیگر شعرائے اردو میں جو ہمارا ساتھ دینے کو موجود نہیں ہیں مگر جنکی حسن سلوک کی زمانہ کی گذشتہ جلدیں گواہ ہیں سید غلام آدیلین دہری۔ جناب شفق عماد پوری۔ مسٹر اُما شنکر فنا رشک بلند شہری۔ سید وجاہت حسین صدیقی جناب اُفق لکھنوی۔ حضرت طالب بنارسی۔ گہر لکھنوی۔ وغیرہ کے نام خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

نثر میں لالہ بالمکند گپتا، پروفیسر مرزا جان۔ مولوی شفیع الدین مراد آبادی۔ سردار لال سنگھ۔ سید علی سجاد عظیم آبادی۔ کنور کامتا پرشاد۔ قاضی کبیر الدین۔ مسٹر عبدالرحمن سہواردی۔ مولانا سعید احمد۔ لالہ دیوی دیال صاحب لالہ مدن گوپال ایم۔ اے، مسٹر رام شنکر پرشاد ایڈیٹر تفریح۔ منشی جالپا پرشاد ایڈیٹر اودھ اخبار۔ رائے بہادر پیارے لال۔ رائے بہادر لالہ رامانج دیال۔ منشی دیبی پرشاد مؤرخ راجپوتانہ۔ پروفیسر نانک پرشاد۔ پنڈت مادھو رام وکیل رنبالہ وغیرہ اہل قلم کے احسانات فراموش ہونے کے قابل نہیں ہیں۔ خصوصاً منشی دیبی پرشاد صاحب مصنف جودھپور جس نظر محبت سے زمانہ کو دیکھتے تھے اسکی یاد سے آج بھی دلکو مسرت ہوتی ہے۔ آپ کے اکثر تحققانہ تاریخی مضامین زمانہ میں شائع ہو چکے ہیں۔ تاریخ راجپوتانہ قدیم سکہ جات۔ اور پرانی زمانہ کی مصوری سے آپ کو تمام عمر ایک خاص دلچسپی رہی۔ آپ کی عطیہ تصویریں اکثر زمانہ میں ہدیۂ ناظرین ہو چکی ہیں۔ آپ ہمیشہ رسالہ کو غائر نظر سے دیکھا کرتے تھے اور جب کبھی کوئی بات آپکو کھٹکتی تو فوراً ہی ایڈیٹر کو اسکی اطلاع دیتے۔ عجیب باوضع بزرگ تھے،

اب ایسے بزرگ کہاں دیکھنے کو نصیب ہونگے۔ مشہور محب وطن مادھو رام صاحب وکیل انبالہ کا پچھلے ہی سال انتقال ہوا ہے آپ بھی زمانہ کے اولیں مضمون نگاروں میں تھے اور باوجود عدیم الفرصتی۔ آپ نے اسکے لیے نہایت محبت و محنت سے بیسیوں مضامین لکھے، صدہا معاملات میں ایڈیٹر زمانہ کو قابل قدر مشورے دیے۔ بنارس کانگریس کے موقعہ پر جس خلوص و محبت کا آپ نے زبانی اظہار فرمایا، جس شفقت بزرگانہ کے ساتھ آپ ہر سال راقم الحروف کو اپنے انبالہ پھر سولن میں مدعو فرمایا کرتے۔ آج اسکی یاد آتی ہے تو دل میں ایک درد سا پیدا ہونے لگتا ہے۔ افسوس مکروہات دنیوی نے ایک دفعہ بھی تعمیل ارشاد کی اجازت نہ دی۔ دل کی باتیں دل ہی میں رہ گئیں اور ہمارے ممدوح کو سفر آخرت پیش آگیا۔ پنڈت مادھو رام صاحب کو ملکی فلاح و بہبود کے تمام مسائل تمام دلچسپی تھی۔ انکا دل حب الوطنی سے سرشار تھا دن رات انھیں باتوں پر جو ہر ملکی ترقی کا دارمدار ہے غور رہتا تھا۔ چنانچہ آپ نے زمانہ میں مختلف مسائل ملکی و تمدنی پر مضامین لکھے ہیں جن سے آپ کے خلوص اور حب الوطنی مترشح ہوتی ہے۔ موت سے ایک سال قبل آپ نے ہماری قومی ضرورتوں پر ایک قابل قدر سلسلہ مضامین لکھا تھا۔ بہرحال جب کبھی زمانہ کے لیے آپ سے کسی خاص مضمون کی درخواست کی گئی تو آپ نے کبھی مایوس نہیں فرمایا۔ اس حسن سلوک کو یاد کرکے بے اختیار یہی دعا نکلتی ہے کہ ایشور آپکی روح پر فتوح کو اپنے سایۂ عاطفت میں جگہ دے۔

لالہ بالمکند گپتا ایڈیٹر بھارت متر کا ذکر اوپر آچکا ہے آپکے خلوص و محبت کو یاد کرکے اب بھی دل بشاش ہوجاتا ہے لیکن جب یہ خیال آتا ہے کہ آپ جیسا جوہر شناس و قدردان محب دنیا میں باقی نہیں ہے تو تھوڑی دیر کے لیے آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا جاتا ہے۔ لطف یہ کہ آپ قدیم خیال کے کٹر ہندو تھے۔ تاہم آپکا زاویۂ نگاہ اور علمی نقطۂ خیال بلند تھا۔ جس سے آپ آسانی سے تصویر کا دوسرا رخ بھی دیکھ لیتے تھے۔ ادنیٰ تعصبات سے آپ کی طبیعت بری تھی لیکن روزمرہ روش اور طرز معاشرت میں آپ قدیم وضع کے سختی سے پابند تھے۔ سوشل ریفارم کے مسئلہ میں آپ کو زمانہ کی پالیسی سے بعید اختلاف رائے تھا لیکن رسالہ کی ترتیب و تدوین میں جو محنت کی جاتی تھی اسکی آپ سے زیادہ کوئی شخص داد نہ دیتا تھا۔ آپ جب کلکتہ سے اپنے گھر گورگاؤں جاتے تو ہمیشہ خواہ تھوڑی دیر ہی کیوں نہ ہو ایڈیٹر زمانہ سے ملنے کے لیے کانپور ضرور ٹھہر جاتے تھے، شروع شروع میں تصویروں کی اشاعت میں آپ سے قابل قدر امداد ملی ہے۔ چنانچہ اسکے کل بلاک آپ ہی اپنی صرفت بنوادیا کرتے تھے۔ آپکی بلند خیالی۔ آزاد منشی۔ صاف گوئی بے تکلفی۔ کی کیا تعریف ہوسکتی ہے۔ جبتک آپ بھارت متر کے ایڈیٹر رہے کلکتہ کے مارواری آپ کی اخلاقی سخت گیریوں سے دبتے رہے حتی کہ خود پروپرائٹر اخبار پر آپکا اخلاقی رعب غالب تھا اور وہ بیحد لحاظ کرتے تھے۔ آپ نے کبھی دولت کے سامنے سر نہیں جھکایا۔ اور بڑے بڑے مارواریوں کی سخت سے سخت نکتہ چینی میں دریغ نہ کیا۔

انکی سادگی اور بے تکلفی کا یہ حال تھا کہ ۱۹۰۵ء کی کلکتہ کانگریس کے موقعہ پر جب ایڈیٹر زمانہ معہ چند احباب

دس بارہ دن آپکا مہمان رہا لیکن کسی دن کسی کو یہ معلوم نہ ہوا کہ وہ اپنے گھر میں نہیں بلکہ کسی غیر شخص کا مہمان ہے۔ زمانہ کے لیے آپ نے ملک کے اخبارات پر ایک نادر سلسلۂ مضامین لکھا۔ شیو شمبھو کے نام سے لارڈ کرزن کے نام چند کھلے چٹھے لکھے جنمیں دلاویز ظرافت کے پیرایہ میں آپ نے لارڈ ممدوح کے عہد حکومت کی سختی سے نکتہ چینی کی۔ ان چٹھوں کا ہندوستان بھر میں چرچا ہوا۔ اکثر انگریزوں نے انھیں پڑھوا کر سُنا۔ بعض احباب کی فرمایش سے ان کا انگریزی ترجمہ بھی شائع کر کے انگلستان بھیجا گیا جسکا تو یہاں تک معلوم ہوئی تھی کہ خود لارڈ کرزن نے بھی انھیں پڑھوا کر داد سخن دی تھی بہرحال آج بھی یہ چٹھے اپنے طرز خاص کے لحاظ سے آپ ہی اپنے جواب ہیں۔ آپ نے لارڈ کرزن کی تعلیمی پالیسی کے خلاف "گرجن اور سرسوتی" کے عنوان سے ایک پُر مذاق مکالمہ زمانہ ۱۹۰۴ء میں لکھا تھا۔ یہ مکالمہ اپنے طرز کا ایک انوکھا مضمون ہے۔ گپتا صاحب کو سنجیدہ ظرافت کا خاص ملکہ تھا۔ پرائویٹ صحبتوں میں مذاق ہی مذاق کے پیرایہ میں وہ ایسی باتیں کہہ جاتے تھے کہ سننے والے دنگ رہجاتے۔ انکی حاضر جوابیاں بڑا لطف دیتی تھیں انکی پُر مذاق گفتگو۔ انکے ڈھلے ہوئے فقرے، انکے رکھے ہوئے نام، یاد آتے ہیں تو بے اختیار جی چاہتا ہے کہ کاش آپ کو کچھ دن اور احباب کی خوشی کی خاطر کا موقع ملتا۔ اخبار نویسی کی جو عزت آپ کے نگاہ میں تھی اسکے سامنے دنیا کی بادشاہت ہیچ تھی۔ وطن اور اہل وطن سے آپ کو ایسی محبت تھی کہ اپنے کو ہر خادم ملک کا نیازمند سمجھتے تھے زمانہ کے ساتھ آپ کی عنایات کا کیا بیان کیا جائے۔

دل من داند و من دانم و داند دل من،

خاتون مضمون نگاروں میں یہاں پر دو مرحومہ بہنوں کے احسانات کا ذکر کرنا ضروری ہے۔ شرمتی ہردیوی جی بھارت بھگتی لاہور کی ایڈیٹر اور بزرگ قوم لالہ روشن لال صاحب کی اہلیہ محترمہ نے ہماری درخواست پر ۱۹۱۱ء کے دربار نمبر زمانہ کے لیے ایک خاص مضمون تحریر فرما کر ہمکو شکر گذار بنایا تھا۔ فرقہ نسوان کی اصلاح و بہبود کے لیے آپ کی کوششیں یادگار زمانہ ہیں۔ دوسری بہن شرمتی چاندرانی کو پرلوک سدھارے ہوئے کئی سال ہو گئے لیکن انکے متعدد مختلف مضامین جو زمانہ میں شائع ہو چکے ہیں۔ عرصہ دراز تک انکے زور قلم اور فکر بلند کی یاد دلاتے رہینگے چاندرانی صاحبہ ایک لایق مان کی لایق بیٹی تھیں۔ گھر ہی میں تحصیل علم کیا تھا مگر سادہ و موثر عبارت میں دلی جذبات قلمبند کرنیکا انھیں ملکہ حاصل ہو گیا تھا۔ عنفوان شباب ہی میں اپنی رفیق زندگی سے انکا ساتھ چھٹ گیا تھا۔ مگر شوہر کے بیوگ میں تمام عمر رونے دھونے میں کاٹنے کے بجائے انھوں نے ملک کی علمی خدمت کا تہیہ کیا تھا۔ افسوس زندگی نے وفا نہ کی ورنہ انکی ذات گرامی پر ہمارے صوبہ کو بہت کچھ فخر حاصل ہوتا۔

سچ ہے "خدا کا نام رہتا ہے ہمیشہ کچھ نہیں رہتا"۔ ہمارے یہ سہ رد و معاونین جنکی ہم رہ رہ کر یاد کر رہے ہیں، ہماری امداد و اعانت کے لیے اس عالم علم و عمل میں موجود نہیں ہیں لیکن ہمکو یقین ہے کہ انکا روحانی فیض اسوقت بھی ہمارے شامل حال ہے۔ انکی ہمدردی۔ انکی دستگیری بیکار نہیں گئی۔ انکے کارنامے ہمیشہ یادگار زمانہ رہیں گے اور جب تک ادب اُردو کا نام و نشان باقی ہے انکو اعلےٰ خیالات اور پاکیزہ جذبات جو زمانہ کی گذشتہ جلدوں میں محفوظ ہیں عزیزانِ وطن کے دل و دماغ کو مسرور و منور کرتے رہیں گے، اور شائقین ادب انکے کارناموں کو فخر اور مسرت سے یاد کرینگے۔ انکی مثالیں شمع ہدایت کا کام دینگی۔ انکے نقش تعلم رہنمائی کا فرض ادا کریں گے۔ اور انکی محنت و محبت کی یادگاریں آیندہ نسلوں کو بھی ملک کی ادبی خدمت پر مائل کرتی رہیں گی۔ اسوقت بھی شکر کا مقام ہے، کہ قدردان ادب کی تعداد کچھ کم نہیں ہے۔ جن مقاصد کو مدنظر رکھکر زمانہ جاری ہوا تھا انکی تکمیل و توسیع کا کام اسوقت ملک میں ایک بڑے پیمانے پر ہو رہا ہے۔ ملک کی ادبی خدمت میں کئی معزز معاصرین بھی ہمارے ساتھ سرگرم کوشش ہیں۔ ملک کے منتخب و چیدہ اہل قلم اسی جوش و خلوص کے ساتھ جسکا ذکر اوپر ہو چکا ہے اسوقت بھی اس خدمت میں ہمارے شریک کار ہیں۔ اسوقت بھی ملک کے اہل کمال ہمکو زیر بار احسان کئے ہوئے ہیں۔ ہمارے پاس الفاظ نہیں، کہ ہم انکی مسلسل و پیہم عنایات کا شکریہ ادا کر سکیں۔ کوئی بضاعت نہیں کہ ہم انکی عرق ریزیوں کا کوئی صلہ پیش کر سکیں، ہاں، ہماری گردن انکے بار احسان سے جھکی ہوئی ہے۔ ہمارا دل انکی شکر گذاری سے لبریز ہے، ہم محسوس کرتے ہیں کہ ہم اور ہمارے ناظرین ان احسانات سے سبکدوش نہیں ہو سکتے ہیں لیکن ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ ہماری محبتوں کو نہ کسی داد کی خواہش ہے اور نہ کسی صلہ کی پروا، کیونکہ وہ کسی اور خیال سے نہیں بلکہ ایک مقدس فرض سمجھ کر ملک کی ادبی خدمت کر رہے ہیں۔ اس لیے ہم بھی اسی دعا پر ختم کلام کرتے ہیں کہ خداوند تعالیٰ ہمارے ہمدردوں کی عمر میں برکت دے، انکے حوصلے بلند رہیں، ارادے کامیاب اور ارمان پورے ہوں۔ برادران وطن اپنے ملکی ادب کی قدر کریں۔ کارکنان زمانہ کا خلوص باقی اور جوش قائم رہے۔ مزید خدمت کی توفیق ہو اور اسکے لیے انکا حوصلہ بڑھتا رہے زمانہ آیندہ اسوقت سے بھی زیادہ ملک کی علمی و عملی ضروریات کو پورا کرتا رہے۔ ناظرین کرام کو زمانہ کی جوبلی مبارک ہو اور اسکی دوسری جوبلی بھی دیکھنا نصیب ہو!

For Lung Troubles

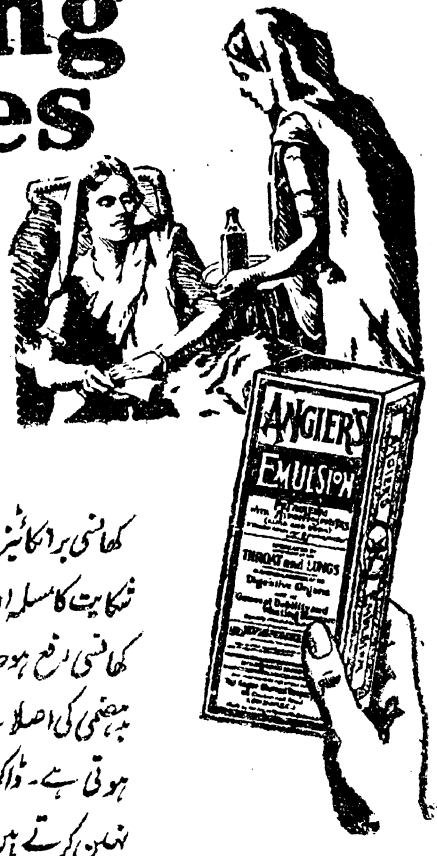

پھیپھڑے کے امراض کیلئے

کھانسی برانکائٹیز، نمونیا، تپ دق، اور گلے یا پھیپھڑون کی ہر ایک شکایت کا مسلمہ اور مستند علاج **انجیرس ایملشن** ہے اس سے کھانسی رفع ہوجاتی ہے۔ پھیپھڑے درست اور قوی ہوجاتے ہین۔ بدہضمی کی اصلاح ہوجاتی ہے اور عام تندرستی اور قوت حاصل ہوتی ہے۔ ڈاکٹر صاحبان کسی اور ایملشن کی ایسی زبردست سفارش نہین کرتے ہین۔ اور نہ کسی دوسرے ایملشن کے پاس سل و دق اور اس قسم کی دیگر گھلا دینے والی بیماریون مین مفید ثابت ہونے کے بابت اسقدر اسناد ہین جنسے **انجیرس ایملشن** کو ہندوستان بھر مین غیر معمولی شہرت حاصل ہوگئی ہے اور سب لوگ اسکے استعمال کی سفارش کرتے ہین یہ تمام خاص خاص بازارون مین فروخت ہوتا ہے آپ بھی اپنے دوستون سے اسکی بابت پوچھئے۔

انجیرس ایملشن مین کسی قسم کی حیوانی چربی نہین ہے اور اسکی تیاری اسطرح ہوتی ہے کہ آدمی کے ہاتھ اسکو نہین پاتے ہین اس واسطے اسکو ہر مذہب و ملت اور ذات و قوم کے لوگ استعمال کرسکتے ہین :-

ANGIER'S EMULSION

Of all Chemists and Bazars.

فارمامنٹ سے اپنے گلے کا درد رفع کر لیجئے!

ٹھنڈی راتین اور برساتی دن گلے مین سوزش
اور درد پیدا کر دیتے ہین۔
فارمامنٹ کی ایک گولی سے اپنے گلے کی سوزش اور درد کو فوراً رفع حاصل کر لیجئے اسکے استعمال سے ڈپتھیریا
سرخ بخار۔ انفلنزا۔ چیچک وغیرہ خطرناک بیماریون کا خطرہ مقدم کر لیجئے
فارمامنٹ گلے اور منہ کے درد کو رفع کرتا ہے۔ سانس کو شیرین بنا دیتا ہے۔
اور گلے کی تمام تکلیفون کو بہت جلد اور یقینی طور پر اچھا کر دیتا ہے۔

آج ہی ایک بوتل خرید لیجئے

سب دکانون مین ملتا ہے

FORMAMINT

سب بازارون مین ملتا ہے

جراثیم کش گلے کی ٹکیان

رعایت میں

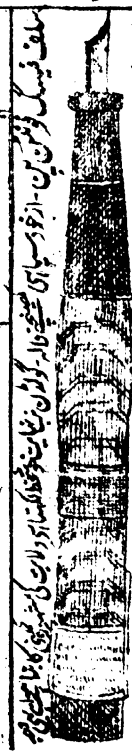

سلف فیسنگ لوئس ہیپ۔ ازخود سیدھی ہونیوالی ہیئر پن۔ ہیئر ڈریسنگ کی ضروری چیز۔ ہر گھر کی ضرورت ہے۔ ہر دکان پر ملتی ہے۔ ہر عورت کو ضرور خریدنا چاہیئے۔ ہر ایک کو ضرور استعمال کرنا چاہیئے۔ ہر ایک کو ضرور تعریف کرنا چاہیئے۔ ہر ایک کو ضرور فائدہ اٹھانا چاہیئے۔ ہر ایک کو ضرور دوسرون سے کہنا چاہیئے۔ ہر ایک کو ضرور لکھنا چاہیئے۔ ہر ایک کو ضرور پڑھنا چاہیئے۔ ہر ایک کو ضرور سمجھنا چاہیئے۔ ہر ایک کو ضرور عمل کرنا چاہیئے۔ ہر ایک کو ضرور کامیاب ہونا چاہیئے۔ ہر ایک کو ضرور خوش رہنا چاہیئے۔ ہر ایک کو ضرور زندہ رہنا چاہیئے۔ ہر ایک کو ضرور مرنا چاہیئے۔ ہر ایک کو ضرور جینا چاہیئے۔ ہر ایک کو ضرور سونا چاہیئے۔ ہر ایک کو ضرور کھانا چاہیئے۔ ہر ایک کو ضرور پینا چاہیئے۔ ہر ایک کو ضرور ہنسنا چاہیئے۔ ہر ایک کو ضرور رونا چاہیئے۔ ہر ایک کو ضرور لڑنا چاہیئے۔ ہر ایک کو ضرور صلح کرنا چاہیئے۔ ہر ایک کو ضرور محبت کرنا چاہیئے۔ ہر ایک کو ضرور نفرت کرنا چاہیئے۔ ہر ایک کو ضرور دوست بنانا چاہیئے۔ ہر ایک کو ضرور دشمن بنانا چاہیئے۔ ہر ایک کو ضرور مدد کرنا چاہیئے۔ ہر ایک کو ضرور مدد لینا چاہیئے۔ ہر ایک کو ضرور دینا چاہیئے۔ ہر ایک کو ضرور لینا چاہیئے۔ ہر ایک کو ضرور دیکھنا چاہیئے۔ ہر ایک کو ضرور سننا چاہیئے۔ ہر ایک کو ضرور بولنا چاہیئے۔ ہر ایک کو ضرور چلنا چاہیئے۔ ہر ایک کو ضرور دوڑنا چاہیئے۔ ہر ایک کو ضرور اڑنا چاہیئے۔ ہر ایک کو ضرور تیرنا چاہیئے۔ ہر ایک کو ضرور ڈوبنا چاہیئے۔ ہر ایک کو ضرور ابھرنا چاہیئے۔ ہر ایک کو ضرور غوطہ لگانا چاہیئے۔ ہر ایک کو ضرور ڈبکی لگانا چاہیئے۔ ہر ایک کو ضرور نہانا چاہیئے۔ ہر ایک کو ضرور دھونا چاہیئے۔ ہر ایک کو ضرور پونچھنا چاہیئے۔ ہر ایک کو ضرور سکھانا چاہیئے۔ ہر ایک کو ضرور کپڑے پہننا چاہیئے۔ ہر ایک کو ضرور کپڑے اتارنا چاہیئے۔ ہر ایک کو ضرور کپڑے دھونا چاہیئے۔ ہر ایک کو ضرور کپڑے سکھانا چاہیئے۔ ہر ایک کو ضرور کپڑے استری کرنا چاہیئے۔ ہر ایک کو ضرور کپڑے تہ کرنا چاہیئے۔ ہر ایک کو ضرور کپڑے الماری میں رکھنا چاہیئے۔ ہر ایک کو ضرور کپڑے نکالن

دارالاشاعت پنجاب لاہور

لڑکوں کے لیے کتابیں

وہ تصانیف جو اخبار پھول کے سلسلے میں چھپکر بے انتہا مقبول ہوئی ہیں اور جو لڑکوں کو مطالعہ کا شوقین بنا دیتی ہیں

ہندوستان ہمارا

از ابوالاثر حفیظ جالندھری ہندوستان کی تاریخ جس طریق سے مدرسوں میں پڑھائی جاتی ہے۔ اس سے نہ وہ بچوں کو دلچسپ معلوم ہوتی ہے اور نہ وہ اس سے کسی قسم کا فائدہ اُٹھا سکتے ہیں۔ اردو کے نامور شاعر ابوالاثر حفیظ جالندھری نے بچوں کے لیے دلفریب اور سبق آموز بنانے کو پہلی مرتبہ تاریخ ہند کی مشہور کہانیاں آسان اور بہت موثر انداز میں نظم میں لکھی ہیں اس کتاب میں رامائن۔ مہابھارت سری کرشن مہاراج۔ گوتم بدھ۔ سکندر۔ پٹھان اور مغل بادشاہوں سکھوں اور انگریزوں کے حالات پرسوز روانی اور قادر الکلامی سے نظمیں لکھی گئی ہیں۔ جس سے ہندوستان کی تاریخ کے تمام اہم واقعات آنکھوں کے سامنے گزر جاتے ہیں اور اُن تمام قوموں کی عظمت اور شوکت کا نقشہ نظروں کے سامنے پھنچ جاتا ہے جو مختلف زمانوں میں ہندوستان پر حکومت کر چکی ہیں۔ مصنف نے ایسی تمام باتوں کو نظر انداز کر دیا ہے جن کا کسی جماعت یا فرقے سے کوئی ادنیٰ سا بھی تعلق تھا اور ہر مضمون پر خود متاثر ہو کر نظم لکھی ہے کتاب میں ستر کے قریب نظمیں ہیں اور شروع میں علامہ عبداللہ یوسف علی صاحب آئی سی ایس پرنسپل اسلامیہ کالج کا دیباچہ ہے۔ کتابت کاغذ۔ طباعت نہایت اعلےٰ چودہ رنگین بلاک تصویریں نہایت خوبصورت جلد اور سرورق تحفے کے طور پر دینے کے قابل کتاب قیمت عہ

عمر عیار داستان امیر حمزہ میں سے عمر عیار کے دلچسپ اور پُر مذاق کارنامون کا لڑکوں کے لیے انتخاب حصہ اوّل عہ حصہ دوم عہ

زلفی - ایک لڑکے کی داستان جو بھیڑیوں میں پلا تھا۔ حیرت انگیز انداز بیان قیمت حصہ اول ۶ر حصہ دوم ۹ر

بن باسی رستم رڈیرڈ کپلنگ کی مشہور کہانی رُکی - کی - ٹیوی۔ ہندوستانی لڑکوں کے لیے نہایت دلچسپ قیمت ۴ر

گدگدی بیحد دلچسپ اور ہنسانے والی کہانیاں اور نئے اور نہایت عمدہ لطیفے۔ روتوں کو ہنسانے والی کتاب حصہ اول ۸ر دوم ۱۰ر

پرستان - پریوں کا بے انتہا دلچسپ اور پر لطف کہانیوں کا دلفریب مجموعہ حصہ اوّل ۷ر حصہ دوم ۵ر

پھولوں کی کلیاں لڑکوں کے لیے سید امتیاز علی صاحب تاج - بی۔ اے کی بہترین کہانیوں کا مجموعہ حصہ اوّل ۷ر حصہ دوم ۹

الف لیلہ کی کہانیاں - لڑکوں کیلئے پھر لکھی گئی ہیں۔ علی بابا چالیس چور ۵ر تین بہنوں کی کہانی ۵ر ابوالحسن ۶ر سندباد جہازی ۱۰ر ماہی گیر کی کہانی ۵۰ر سوداگر کی کہانی ۵۰ر بربار بادشاہ اور جواہر شہزادی ۱۰ر

پچیس کتابوں کا سٹ گیارہ سے چودہ سال تک کی عمر کے بچوں کیلئے اور کم قیمت کی مفصل حال فہرست میں دیکھو چندیہ ہیں شہزادہ عزیز ۵ر ریاضی کا دلچسپ حصہ ۳ر سنہری پری ۳ر ہمایہ شہزادی ۴ر بھولی بھلیاں ۵ر جوجو مارا جا ۳ر دو بھائی ۶ر

دارالاشاعت پنجاب ۱۹۵ ریلوے روڈ۔ لاہور

۵۰۰۰ روپے کی چیز ۵ روپے مین

علم مسمریزم سیکھکر دولت وعزت کماؤ

اسکے ذریعہ آپ زمین مین گڑی ہوئی دولت چوراہی شدہ چیز کا لمحہ بھرمین پتہ لگا سکتے ہین - اسی علم کے ذریعہ مقدمونکا نتیجہ جان لینا مردونکی روح کو بلاکران سے گفتگو کرکے بچھڑے ہوئے رفیق کا پتہ لگا دینا تکلیف سے بیقرار مریض کو فوراً بھلا چنگا کر دینا صرف ایک نظر کے دیکھتے ہی کسی عورت مرد جانور کو اپنا گرویدہ بناکر اس سے حسب مرضی کام کرالینا اوڑتے ہوئے پرند بھاگتے ہوئے ہاتھی ،،رہرن کو صرف نظر مارتے ہی قابو مین کرکے اپنے پاس بلانا وغیرہ - بڑی ہی حیرت انگیز طاقتین حاصل ہوجاتی ہین - مصنف نے خود اس علم کے ذریعے لاکھون روپے پیدا کئے ہین اور اس کے عجیب کرشمے دکھاکر بڑے بڑے مجمعون کو حیرت مین ڈالدیا ہے - ہماری کو شش مسمریزم کتاب منگاکر دیکھئے - گھر بیٹھے اس عجیب وغریب علم کو سیکھکر دولت وشہرت کمائیے قیمت فی کتاب ۵ روپے پیکنگ وغیرہ ۸ آنہ - ۲ کتاب اکٹھا منگانیوالون کو صرف تیرہ روپیہ مین -

ایک معزز شخص کی رائے اور تجربہ

بابو سیتارام جی بی اے بڑا بازار کلکتہ سے لکھتے ہین - مین نے آپکی کرشمات مسمریزم کی خاصی مشق کرلی ہے - مجھے میرے گھر مین دولت گڑی ہونیکا شک تھا آج مین نے اپنے دادا کی روح کو بلایا اور گڑے ہوئے مال کا سوال کیا - جواب ملا کہ انیدھن والی کوٹھری مین دو گز گہرائی مین گڑا ہے - مین روح کو واپس کرکے کھدائی مین مشغول ہوگیا - ٹھیک دو گز کے فاصلہ پر ایک سانپ بیٹھا ہوا تھا ایک کلسے مین سونے چاندی کا زیور اور روپے ہین - واقعی آپکی کتاب بہت مفید ثابت ہوئی - آپکا ہزار ہزار شکر گذار ہون - پانسو پیسے آپکی خدمت مین رسال ہین کسی نیک کام مین لگا دیجئے -

ملنے کا پتہ :- ڈاکٹر جے پی شاستری ایل ایم ای مسمریزم ہاؤس نمبر علیگڈھ

THE WOMAN'S TONIC

الٹرس کارڈی ایل یعنی اکسیر نسوان

ڈاکٹر اسکو جسمانی صحت کی برقراری کیلئے بہترین علاج قرار دیتے ہین - ہر گھر مین اسکا رہنا نہایت ضروری ہے

ماں بیٹی اور بہن کے واسطے بہترین دوائی

RIO Chemical Co.,
79 BARROW STREET,
NEW YORK (U.S.A.)

اُردو کی مستند کتابین

لغات اُردو ہر چہار جلد	سے	۴ر	قواعد میر دہلوی		۶ر
لغات کشوری	للہ	ر	دستور الشعراء		۸ر
شاعری ہر چہار جلد	عہ	ر	لغت جلال	عہ	ر
مرقع ادب خطوط شعرا اول	عہ	ر	دیوان دبیر و میر		۱۲ر
مرقع ادب جلد دوم	عہ	ر	دیوان وصف		۱۲ر
مشاطۂ سخن	عہ	ر	جان اردو		۶ر
معرکۂ چکبست و شرر	عہ	ر	اصول اردو		۶ر
بحر الفصاحت علم عروض	سے	ر	زبان دان		۶ر
دیوان ناسخ	عہ	ر	اصلاح زبان اردو		۶ر
گلزار داغ	عہ	ر	فوٹ :- فہرست مفت منگوائیے		

ملنے کا پتہ

خواجہ عبدالرؤف عشرت احاطہ خانسامان لکھنو

مسٹر اے ایچ۔ غزنوی ممبر لیجسلیٹو اسمبلی کلکتہ کا

اظہار مسرت

ہندوستان، برہما اور سیلون مین مشہور ڈاکٹر ایس کے برمن کی جاری کی ہوئی دواؤن کی تعریف مین کہانتک کرون انکی دواؤن مین سے کئی ایک کو تونے خود استعمال کیا اور فائدہ مند پایا ہر خاص عام کو چاہیئے کہ انسے فائدہ اٹھاوین

آیوڈائزڈ سالسہ

خون کی خرابی سے کبھی تندرستی قائم نہین رہ سکتی جبکہ خون خراب ہوگیا ہے اُسے آئے دن طرح طرح کے مرض ستاتے رہتے ہین مریض کو زندگی محال ہوجاتی ہے جسم پھٹنے لگتا ہے چکتے پڑجاتے ہین پھوڑے پھنسی نکلتے رہتے ہین مریض کو زندگی محال ہوجاتی ہے۔ سر کے بال اُڑجاتے ہین کمزور جوڑون مین درد کی وجہ سے مریض چلنے پھرنے سے مجبور ہوجاتا ہے۔ غرضکہ مریض کے سر پر مصیبت کا پہاڑ ٹوٹ پڑتا ہے۔ جسمے انسانی تکلیفون کو محسوس کرتے ہوئے اسی لیے یہ دوا ایجاد کی ہے جو مذکورہ بالا امراض پر قبضہ حاصل کرکے انکو ایکدم فنا کر دیتی ہے۔

سالسہ نصفی خون کی بینظیر دوا ہے اسکے استعمال سے خراب خون دور ہوکر نیا اور صاف خون پیدا ہونے لگتا ہے گئی گذری جسمانی طاقت از سر نو پیدا ہوجاتی ہے اور جسم مین پہلے ہی سی چستی و خوبصورتی کے آثار ہویدا ہوجاتے ہین۔

مکرر یہ کب!!! جبکہ آپ ہمارے اصلی سالسہ کو استعمال کرین اور نقلی سے پرہیز کرین۔

قیمت فی شیشی دو روپیہ چار آنہ محصول ڈاک آٹھ آنہ تین شیشی کے چھ روپیہ نو آنہ محصول ڈاک ۱۴ آنہ۔

درد سر و درد سر

مریض سر کے درد سے گھبرا گیا ہے۔ اُسکا سر درد سے پھٹا جاتا ہے۔ پیشانی کرب سے کڑکڑ ہوتی جاتی ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ آنکھین بھی نکلی پڑتی ہے۔ بس ایک پیکہ ٹھنڈے پانی کے ساتھ نگل لی کہ دس منٹ بعد درد کافور ہوگیا۔ اب مریض کی گھبراہٹ دور ہوگئی۔ وہ چین مین ہے۔ کیا آپ نے غور کیا یہ دوا ہے یا جادو! نہین صاحب یہ جادو نہین ہے بلکہ ہماری پیٹنٹ دوا "اینٹا لجیک ٹیبلیٹ" یعنی سر درد دریا ہی درد کی دوا ہے جو منٹون مین روتے مریض کو ہنسا دیتی ہے جادو کا تماشہ دکھا دیتی ہے۔

ایک ہی نہین بلکہ دو ہین یعنی دوسرا فائدہ یہ ہے کہ ریاح سے ہونے والے ہر قسم کے درد کو پانی کیطرح بہا دیتی ہے۔ رگون مین اگر تک چک کنکنی وغیرہ سے کیسی تکلیف کیون نہ ہو دم کے دم مین دور ہی نہین بلکہ اگر چند روز تک اس کا استعمال رکھا جائے تو گھٹیا جیسے موذی پر بھی اپنا قبضہ جماکر اُسے دور کئے بغیر نہین رہتی قیمت ۱۲ ٹیکیون کی شیشی کے دس آنہ ۱۰/ محصول ڈاک ۶/ چھ آنہ

نوٹ:- ہماری جملہ ادویات مندرجہ فہرست قیمت پر ہر جگہ ملتی ہین خریداران کارخانہ ہذا سے دوا منگانے سے قبل ہمارے مقامی ایجنٹ دوا فروشون سے خرید لیا کرین اس سے وقت اور ڈاک خرچ دونون مین کفایت ہوگی۔

ڈاکٹر ایس کے برمن (صیغہ نمبر ۱۸) پوسٹ بکس نمبر ۵۵۴ کلکتہ

ایجنٹ:- چھوٹے لال اینڈ سنس کلاتھ گنج، محمد حافظ محمد ناصر لیا گنج کانپور

اخلاقی تبتین بہا کتب

	قیمت
گلستان فارسی باتصویر - ہر موقعہ پر جسب ضرورت کوئی عمدہ تصویر	۱۰ر
گلستان معنی اردو - اسپر طلبا کی آسانی کیلئے اردو کے حواشی دیئے ہیں	۱۴ر
شرح گلستان فارسی - از ملا محمد اکرم لکھنوی	۱۳ر
شرح گلستان فارسی - از شیخ ولی محمد صاحب اکبرآبادی	۱۳ر
گلستان مترجم - باترجمہ اردو -	۱۲ر
تضمین گلستان فارسی - منشی ہرگوپال تفتہ گلستان کے ہر مصرع پر مصرع لگایا گیا ہے -	۷ر
بہارستان جامی - اخلاق وفصایح مین قابل قدر ہے	۵ر
خارستان - حکایات پند وفصایح بطرز گلستان وبوستان	۹ر
اخلاق محسنی - ہمرتبہ گلستان از ملا حسین واعظ کاشفی	۸ر
گلستان حکیم قاآنی - گلستان سعدی کے جواب مین لکھی گئی ہے	۴ر
عقد کل وعقد منظوم - یعنی انتخاب گلستان وبوستان	۹ر

کتب متفرق

جامع الاخلاق اردو - اخلاق جلالی کا ترجمہ	۷ر
اردو ترجمہ ریاض رضوی - شرح گلستان	۱۰ر
حدیقۃ الاخلاق - یہ کتاب بہت سے سہل اخلاقی مضامین کا مجموعہ	۱۰ر
تذکرہ علمائے ہند فارسی - ہندستان کے مشہور علما کا تذکرہ	۱۴ر
رشحات فارسی - بارگاہ الہی کا نہایت عمدہ تذکرہ ہے	۱۴ر
تاریخ حبیب الہ اردو - آنحضرت علیہ وسلم کا پورا پورا حال	۸ر
ترجمہ فوائد السعدیہ اردو - بزرگان دین کی سوانحعمریان	۱۳ر
عین الولایت - اردو - خاندان چشت کے بزرگون کے کرامات	۸ر
حدیقۃ الاولیا - چاردن خاندانون کے مشائخ کی سوانحعمریان	۶ر
تاریخ مدینہ منورہ - مرغوب القلوب کا ترجمہ مدینہ کے دلچسپ کوائف	۱۱ر
گلدستہ کرامات - حالات غوث الاعظم حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی	۱۰ر
المشار اردو - شہدائے اسلام کے حالات	۸ر
برکات مدینہ - اردو حالات بزرگان قصبہ بارہ شریف	۸ر
حیوٰۃ العلما اردو - بزرگان قصبہ سہسوان کے حالات	۸ر
مقالات احسانی اردو - مفرد ادویہ کے خواص اردو ان کے اردو ہندی عربی نام	۸ر
تحقیقات نادرہ طبی اردو یہ بھی مفردات ہندی کی بہترین کتاب ہے	۵ر
عرق پرکاش اردو ادویہ کے خواص اور کشید عرقیات کے طریقے	۷ر
شرح رباعیات طب یوسفی - تمام امراض بیان رباعیات مین	۱۲ر
قرابادین جلالی - تمام امراض کی دوائین بترتیب حروف تہجی	۵ر
دستور العلاج - حفظ صحت وتندرستی کے قیام امراض کے دفعیہ کی تدابیر	۱۴ر
مطب علوی خان - معہ رسالہ نہایت جامع اور مختصر کتاب ہے	۰۴ر
مجربات اکبر - وہ نسخے جو مصنف کو بزرگون سے پہونچے	۰۸ر
مظہر الشفا - علاوہ دیگر مسایل طبیہ کے مفرد ی نسخون سے مملو ہے	۸ر
ملخص فصول بقراطی - اصل کتاب دقیق تھی جسکا فارسی مین ترجمہ ہوا	۵ر
نثر اعظم - نبض کے بارہ مین نہایت جامع کتاب	۷ر
علاج الغربا - اردو نہایت مشہور اور مقبول عام کتاب ہے	۱۰ر
ترجمہ قرابادین شفائی - از حکیم ہادی حسین مرادآبادی	۸ر
ترجمہ زاد غریب - مسافرون کی صحت اور تندرستی کی محافظت کی تدابیر	۸ر
دستور النجات عن مضائقات الحیات - پتون کے اقسام اور علاج	۶ر
مرکبات احسانی - ہر مرض کے متعلق مرکب نسخے	۰۶ر
مجربات اکبری - اصل کتاب کا ترجمہ نہایت عمدہ ہے	۰۸ر
انسداد آفات - ہزارون ایسی باتین اسمین درج ہین جنسے ہر شخص کامل فائدہ اٹھا سکتا ہے	۱۲ر
اکسیر الامراض - نسخے وتحقیق متعلق جملہ امراض	۹ر
قرابادین احسانی - جملہ اقسام کے نسخہ جات مرکب وترایب مرکبات	۰۶ر
سل اور دق کا قدرتی علاج - ان دونون موذی امراض کے قدرتی علاج	۸ر

المشتہر منیجر نولکشور پریس صیغہ بک ڈپو لکھنؤ

TELEGRAMS "CAWSHAPUR" BOMBAY.

باٹلی والے کی

۴۴ برس کی سودیشی دوائین

باٹلی والا کا اگیو کیچر - یہ دوا انفلوئنزا بخار اور روزانہ اور چوتھے روز آنے والے بخار کیلئے اکسیر ہے۔
باٹلی والا کی اگیو کی گولیاں " " " " " " " "
باٹلی والا بالامرت نیلا - یہ دوا کمزور اور دبلے بچوں اور ضعیف انسانوں کے لیے بیحد مفید ہے۔
باٹلی والا کا کیورال بام - یہ دوا درد سر اور سینہ کے درد اور بچوں کے کھلنے کیلئے بیحد مفید ہے۔
باٹلی والا کا ڈائریا چر - یہ دوا ہیضہ کی بیماری اور گرمی سے قے دست روکنے کے لیے اکسیر ہے۔
باٹلی والا کی کونین کی ٹکیاں - ایک گرین دو گرین کی بوتل میں اعلیٰ اور ولایتی کونین سے بنی ہوئی
باٹلی والا کی یہ دوا کھجلی اور جلدی بیماریوں کے لیے بیحد مفید ہے۔
باٹلی والا کی کونین کی گولیاں - یہ دوا پیلے چہرے اور دبلے کمزور والے کے لیے اکسیر ہے۔
باٹلی والا کا دانت کا منجن - یہ منجن دانتوں کو موتی کی مانند مفید اور پختہ مضبوط بناتا ہے۔

ایجنٹوں کی ضرورت ہے

DR. H. L. BATLIWALA SONS & CO. LTD.
SAYANI ROAD, P. O. CADELL ROAD BOMBAY No. 14.

پتہ:- ڈاکٹر ایچ - ایل، باٹلی والا اینڈ سنس کمپنی لمیٹیڈ پوسٹ کیڈل روڈ بمبئی نمبر ۱۴

۹۰ فیصدی شریف المخلوقات کی دائمی تکالیف کا قلع قمع

قبض دائمی اور بدہضمی جو تمام امراض کے منبع ہیں تقریباً ۹۰ فیصدی انسان ان سے نالاں ہیں۔ طرح طرح کی تدابیر کرتے ہوئے بھی پوری صحت حاصل نہیں کر سکتے۔ بلکہ دیگر امراض کے شکار بنجاتے ہیں۔ ایسے اشخاص کیلئے ہماری تیار کردہ مشہور عالم آتنگ نگرہ گولیاں غیبی امداد ہیں۔ یہ گولیاں قبض دائمی کو دور کرکے معدہ کو مضبوط بناتی ہیں۔ قوت ہاضمہ کو تیز کرکے خوراک اچھی طرح ہضم کرکے خون صالح پیدا کرکے اعلیٰ درجہ کی طاقت و توانائی بخشتی ہیں۔ عورتوں اور مردوں کی امراض مخصوصہ کی شرطیہ علاج ہیں۔ لاکھوں اشخاص مستفید ہو کر صحت حاصل کر چکے ہیں اور کر رہے ہیں۔ ایک دفعہ ضرور تجربہ کریں۔

قیمت - فی ڈبیہ ۱۶ یوم کے لیے صرف ایک روپیہ۔ ۵ ڈبیاں صرف چار روپیہ (للہ م)

امرتارنواوہہ یعنی (بحر آبحیات) نحیف الجسم ضعیف الدماغ و قوار کیلئے امرتارنواوہہ ہمہ صفت موصوف ہے جسم کو معتدل رکھتی دیگر دماغ اور دل کو فرحت بخشتا ہے قبل از وقت کی ضعیفی کو دور کرکے قوی الجسم بنا دیتا ہے مقوی آیورویدک ادویہ کا مرکب ہے۔ ہمارے شاستر کہتے ہیں کہ کچھ عرصہ تک اس دوا کا استعمال کرنے سے بڈھا بھی جوان ہو جاتا ہے، نہایت لذیذ اور مزیدار۔ صبح بطور ناشتہ ایک تولہ استعمال کر سکتے ہیں۔ قیمت فی ڈبیہ صرف دو روپیہ عہ

نوٹ:- **ویدشاستری منی شنکر گووندجی جام نگر کاٹھیاواڑ۔**

ایجنٹ - عبدالکریم اینڈ سنس - مسٹن روڈ - کان پور

۳۷ سال کا آزمودہ گورنمنٹ ہند و جرمن سے رجسٹر کیا ہوا

سدھا سندھو

کف کھانسی۔ ہیضہ۔ دمہ سنگرہنی۔ اپھارہ۔ پیٹ کا درد جی متلانا۔ بچوں کے ہر پیسے دست۔ دودھ پکنا۔ انفلوئنزا وغیرہ کی ایک تولہ دوا ہے جسکے چند قطرے پانی میں ڈالکر پینے سے ایک ہی خوراک میں فائدہ ہوتا ہے۔ قیمت فی شیشی ۸

محصول ڈاک ۱ ڈاکٹروں حکیموں اور عطاروں کو نمونہ مفت

بال سدھا

جاڑہ۔ بچوں کو سردی کھانسی اور زکام سے بچائے رکھنے کیلئے بال سدھا نہایت مفید ہے۔ پینے میں میٹھا۔ داموں میں سستا۔ بچہ موٹا اور تندرست رہتا ہے۔ قیمت فی شیشی ۱۲ ڈاک خرچ ۷

ڈرد وج کیسری

بغیر کسی تکلیف جلن کے دار کو صرف ۲۴ گھنٹے میں تمام کر دینے والی یہی ایک دوا ہے۔ قیمت صرف ۴ ر ایکدرجن ۴۸ محصول علاحدہ

ہر جگہہ سب دوافروشوں سے مل سکتی ہے

بڑی فہرست مفت منگا کر دیکھئے

ملنے کا پتہ

سکھ سنچارک۔ کمپنی متھرا

کیا آپ کمزور ہین

آپ سناٹوجن کے ذریعہ نئی طاقت حاصل کر سکتے ہین

جسمانی طاقت اور جھلکتی ہوئی تندرستی پر ہر آدمی کو فخر ہوتا ہے آپ بھی کسی وقت مضبوط آدمی رہے ہونگے۔ لیکن کسی سخت بیماری مین مبتلا ہونے یا بہت زیادہ محنت کرنے یا عیش و بے اعتدالی کی زندگی بسر کرنے کی وجہ سے آپ کی تندرستی خراب ہوگئی ہے:-

آپ کمزور ہوگئے ہین

سناٹوجن نہایت مقوی غذا ہے اسکو استعمال کرکے اپنے جسم اور قوت بڑھا لیجئے۔

سناٹوجن کے بدولت نئی طاقت حاصل کر لیجئے۔

ہاپوٹر یا ڈنٹ ڈیو۔ ڈاکٹر ایچ ایچ ڈبلیو ہارٹ

واقع بابوگڈھ صوبہ متحدہ سے تحریر فرماتے ہین

میں گیارہ سال سے اپنی روزمرہ پریکٹس مین برابر سناٹوجن استعمال کر رہا ہون لیکن آجتک کبھی مجھکو اسکے فوائد کے متعلق کوئی بات سننے مین نہین ہوئی۔

آج ہی ایک بوتل خرید لیجئے

SANATOGEN

اصلی مقوی غذا

سب بازارون مین ہر دوکان پر مل سکتی ہے

سناٹوجن مین تیاری یا پیکنگ کیوجہ سے کبھی ہاتھ چپچپے نہین یا